خامہ بگوشیاں

مشفق خواجہ کے ادبی کالم

مرتبین : ڈاکٹر انور سدید
خواجہ عبدالرحمٰن طارق

خامہ بگوشیاں

مشفق خواجہ کے ادبی کالم

مرتبین:
ڈاکٹر انور سدید
خواجہ عبدالرحمٰن طارق

پورب اکادمی، اسلام آباد

Scanning Project 2015

Book No.103

Donated By:
Rashid Ashraf

Special Courtesy :
Salman Siddqui
Amin Tirmizi

Managed By:
Rashid Ashraf
zest70pk@gmail.com
www.wadi-e-urdu.com

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول: مارچ 2010ء
ناشر: پورب اکادمی، اسلام آباد
فون نمبر: 051 -5819410, 0301 - 559 58 61
ای میل: poorab_academy@yahoo.com
ویب سائٹ: www.poorab.com.pk

Khama Bagoshian
by: Mushfiq Khawaja
Published by: Poorab Academy, Islamabad, Pakistan
ISBN 978-969-8917-90-6

۸۹۱٫۴۳۹۵
م ش ق خواجہ، مشفق
خامہ بگوشیاں / مشفق خواجہ ؛ مرتب: ڈاکٹر انور سدید، خواجہ عبدالرحمن طارق
اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء
۲۳۰ص

۱۔ اردو — ادبی کالم
۱۔ انور سدید، ڈاکٹر ۲۔ عبدالرحمن طارق، خواجہ

فہرست

ذمہ دار ادیب ۷
سلیم احمد کے رزمیے کا بزمیہ پہلو ۱۳
بعض ادیب فرشتوں کے نہیں، اپنے لکھے پر پکڑے جائیں گے ۲۰
علمی اداروں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا ایک خطرناک رویہ ہے ۳۱
اردو میں انٹرویو کی روایت کا ارتقا ۳۷
ہمارے بیشتر ادیب اپنی کتابیں خود ہی چھاپتے ہیں ۴۹
عریانی اور فحاشی ایک متنازع مسئلہ ہے ۵۳
احمد فراز شاعری سے زیادہ گائیکی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں ۵۹
آج کل بہترین مزاحیہ ادب فلیپوں اور دیباچوں کے ذریعے منظر عام پر آتا ہے ۶۰
کشور ناہید کی سالگرہ کا جشن ۶۹
دور دوم ۷۳
ادبی رسالے یا کشکول گدائی ۷۹
شاعری اور ڈپریشن ۸۳
اگلے وقتوں کے شاعران کرام ۹۰
احمد ندیم قاسمی ۹۶
شاعری کے کھوٹے سکے ۹۸
ایک کالم احمد فراز کے نام ۱۰۳

تنقید یا خندۂ استہزا ۱۱۵
شاعر یا آلۂ مکبر الصوت ۱۲۰
نقاد یا پیشہ ور گواہ ۱۲۶
ادب میں قد و قامت کا مسئلہ ۱۳۲
ترقی پسندی کی لوحِ مزار ۱۳۸
چندے خامہ خراب ۱۴۳
ادب کا شہنشاہِ جذبات ۱۴۸
مزاحمتی ادب اور طلسم ہوشربا ۱۵۳
مزاحمتی ادب یا جعلسازی بنامِ ادب ۱۵۸
ناصر کاظمی کی ڈائری انکشافات اور اعتراضات ۱۶۳
خاکہ نگاری یا کتبہ نگاری ۱۶۸
علمی و ادبی ادارے یا علم و ادب کے مزار ۱۷۴
ادبی حدود اور حدود آرڈیننس ۱۷۹
شاعری یا گائیکی ۱۸۴
بین الاقوامی غیر ادبی کانفرنس ۱۸۸
ساقی فاروقی کا معاصرین کے خلاف اعلانِ جنگ ۱۹۷
تنقید کی توپ چلانے والے طوطے ۲۰۲
اکادمی ادبیات یا بے ادبیات ۲۰۷
غالب کے طرف داروں کی سخن فہمی ۲۱۳
کیا ادب پر بھی ٹیکس لگانا چاہیے؟ ۲۱۹
شہزاد منظر کی کتاب ”پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال“ ۲۲۵
”شہاب نامہ“ کا مقصد اخفائے ذات ہے ۲۳۰

عرضِ سدید

اردو کے ممتاز ادیب مشفق خواجہ کی ادبی شخصیت کے کئی زاویے ہیں۔ وہ کالج کے زمانے میں شاعر کی حیثیت میں رونما ہوئے۔ تحقیق کا مزاج اپنے والد گرامی خواجہ عبدالوحید سے وراثت میں پایا۔ اسے مزید تقویت بابائے اردو مولوی عبدالحق نے دی۔ انہوں نے مشفق خواجہ کا جوہر پہچان لیا اور تعلیم کی تکمیل کے فوراً بعد انہیں انجمن ترقی اردو میں اپنا معاون بنالیا اور اپنی لغت کے مسودے میں ان سے خوب کام لیا۔ لفظ کی معنویت اور ”سند“ کے استعمال کا سلیقہ بخشا۔ اس کے کچھ آثار خواجہ احمد دین، مصنف سرگذشت الفاظ، کی وراثت بھی سمجھے جاسکتے ہیں جو ان کے بزرگوں میں شامل تھے۔ انجمن کے رسالہ ”اردو“ اور ”قومی زبان“ کی ادارت نے تحقیق و تنقید کے علاوہ مسودات کی پہچان اور پرکھ پرچول اور تدوین کی صلاحیت میں اضافہ کیا۔ مطالعے کی وسعت نے متنوع موضوعات کی کتب کا تبصرہ نگاری میں اپنا نیا انداز پیدا کرنے میں مدد دی۔

ان کے باطن میں ایک فطری طنز و مزاح نگار موجود تھا جس کی دریافت روزنامہ ”جسارت“ اور ہفت روزہ ”تکبیر“ کے مدیر محمد صلاح الدین سے منسوب کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے ہی مشفق خواجہ کو صحافتی کالم ”سخن در سخن“ لکھنے پر آمادہ کیا، حالانکہ یہ ان کا میدان نہیں تھا۔ تاہم جب وہ اس طرف آگئے تو اپنی انفرادیت کا نقش بھی قائم کردیا لیکن شہرت کی بے نیازی کی وجہ سے منظر پر آنا قبول نہ کیا اور پس پردہ اپنے لیے اپنا فرضی نام ”خامہ بگوش“ اختیار کیا۔ خامہ بگوش نے اس کالم میں ادبی معاشرے کی ناہمواریوں، شہرت پسند اور جعلی ادیبوں کی غیر ادبی حرکتوں، سرکاری ادبی اداروں کی اور ”افسر ادیبوں“ کی بداعتدالیوں اور کتابوں کے محاسن و معائب کو دیانت داری اور غیر جانبداری سے نشان زد کیا۔ معنوی طور پر انہوں نے اس کالم میں اپنے تمام ادبی اوصاف کو بڑے سلیقے سے استعمال کیا اور اتنا تیکھا لکھ دیا کہ اس کالم کی دھوم برِاعظم ہندو پاک

ہی نہیں بلکہ پوری ادبی دنیا میں پھیل گئی۔ لیکن کسی کو پتہ نہیں تھا کہ تصویر کے پردے میں کون بول رہا ہے۔ جب حقیقت کھلی تو سب نے مشفق خواجہ کی طرف حیرت سے دیکھا۔ لیکن اس وقت وہ ادبی کالم نگاری میں اپنا پختہ نقش قائم کرنے کے بعد اس صحافتی کام سے رضاکارانہ طور پر الگ ہو گئے تھے چونکہ ان کے تحقیقی منصوبوں میں رکاوٹ ہو رہی تھی۔

''سخن در سخن'' چونکہ ادبی کالم تھا اس لیے اس کا حلقۂ اثر وسیع تھا۔ اس کے مطالب و معنی کو زوال نہیں تھا چنانچہ تقاضا کیا جانے لگا کہ انہیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ مشفق خواجہ نے، جو نام و نمود اور شہرت و نمائش سے بے نیاز تھے، اسے نظر انداز کر دیا لیکن اس دوران معروف نقاد مظفر علی سید نے سخن در سخن کا انتخاب تین جلدوں۔ ''خامہ بگوش کے قلم سے''۔ ''سخن در سخن''۔ اور ''سخن ہائے گفتنی'' کے نام سے شائع کر دیا۔

مشفق خواجہ کی وفات (۲۲ فروری ۲۰۰۵ء) کے بعد ان کے برادر عزیز خواجہ عبدالرحمان طارق نے ان کے تمام کالموں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور ان کے تلاش و جستجو، ترتیب و تدوین اور پیش لفظ نویسی میں مجھے بھی شرف معاونت دیا گیا۔ اس سے قبل ہم دونوں کے مرتب کیے ہوئے دو مجموعے ''سخن ہائے گسترانہ'' اور ''سن تو سہی'' کے عنوانات سے شائع ہو چکے ہیں۔ اب ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی میں چھپنے والے کالموں کا ایک مجموعہ ''خامہ بگوشیاں'' کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ کتاب مشفق خواجہ کی پانچویں برسی پر شائع ہو رہی ہے۔ محترم خواجہ عبدالرحمٰن کے ساتھ میں راؤ صفدر رشید کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کی ادب دوستی کی تحسین کرتا ہوں۔

ڈاکٹر انور سدید
۲۷ اسٹیج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور
۱۲ فروری ۲۰۱۰ء

ذمہ دار ادیب

قمر علی عباسی بچوں کے مشہور و مقبول ادیب ہیں۔ بچوں کے لیے کتابیں لکھتے لکھتے اب انھوں نے بڑوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا ہے۔ پہلے لندن کا سفرنامہ لکھا۔ پھر اخبار میں کالم نگاری شروع کی اور اب ''دلی دور ہے'' کے نام سے ایک سفرنامہ شائع کیا ہے۔ عباسی کا لندن کا سفرنامہ ہم نے اس لیے نہیں پڑھا کہ ہم لندن کا ایک سے ایک اچھا اور ایک سے ایک برا سفرنامہ پڑھ چکے ہیں۔ جس کے نتیجے میں برے بھلے کی تمیز باقی نہیں رہی۔ لہٰذا ایسا کوئی سفرنامہ پڑھنے سے کیا فائدہ جس کے برے یا اچھے ہونے کا ہم فیصلہ نہ کر سکیں۔ عباسی کے اخباری کالم ہم ضرور پڑھتے ہیں۔ یہ جس اخبار میں چھپتے ہیں اس میں جرائم کی خبروں کے بعد پڑھنے کی یہی ایک چیز ہوتی ہے۔

بلاشبہ عباسی نہایت عمدہ کالم نگار ہیں اور وہ دن دور نہیں جب ان کا شمار ہمارے ملک کے بڑے کالم نگاروں میں ہوگا۔ خدانخواستہ اگر ہماری یہ پیش گوئی سچ ثابت نہ ہوئی تو وہ دن بھی دور نہیں جب ہمیں اپنے لکھے پر شرمندگی ہوگی۔ لیکن ہم اس کی پروا نہیں کرتے کیونکہ ہم اکیلے شرمندہ نہیں ہوں گے، عباسی بھی اس میں شریک ہوں گے، بلکہ شریک غالب وہی ہوں گے۔ ہم تو محض ان کی تعریف کرنے کے جرم میں جھوٹے بنیں گے۔ بہر حال یہ بھی ہمارے لیے فخر کی بات ہوگی کہ جس دور میں لوگ خود اپنی تعریف کر کے جھوٹے بنتے ہیں، ہم کسی دوسرے کی تعریف کر کے اس منصب تک پہنچیں گے۔

ہاں تو ہم عرض کر رہے تھے کہ قمر علی عباسی نے بچوں کے لیے کتابیں لکھتے لکھتے بڑوں کو بھی تختۂ مشق بنانا شروع کر دیا ہے۔ بچوں کے لیے لکھنا بہت مشکل کام ہے، کیونکہ لکھنے والے کو اپنی ذہنی سطح سے نیچے اتر کر بچوں کی ذہنی سطح کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ بڑوں کے لیے لکھنا آسان کام ہے

کیونکہ لکھنے والا اپنی ذہنی سطح کے مطابق لکھتا ہے اور اکثر اوقات ذہن کو زحمت دیے بغیر بھی لکھ لیتا ہے۔ معلوم نہیں قمر علی عباسی کی مشکل پسند طبیعت نے آسان کام کیوں شروع کر دیا۔ بچوں کے لیے اگر وہ لکھتے رہتے تو مولوی اسماعیل میرٹھی کی طرح تاریخ ادب میں ممتاز مقام حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن بڑوں کے لیے لکھنا شروع کر کے انھوں نے خاصے خطرات مول لیے ہیں۔ سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ تاریخ ادب میں اب انھیں مولوی اسماعیل میرٹھی کے آس پاس بیٹھنے کی جگہ نہیں ملے گی۔ کسی دوسری جگہ بیٹھنے کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ تاریخ ادب لکھنے والے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ادیبوں کو لائق اعتنا سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، جو تاریخ ادب لکھ رہے ہیں، اس میں جگہ پانا محال ہے کیونکہ ابھی تو اس میں انھیں ادیبوں کا ذکر خیر چل رہا ہے، جن کی وفات کو کم از کم دو سو سال گزر چکے ہیں اور قمر علی عباسی تو ابھی پیدائش کے اعتبار بھی اس زمانی معیار تک نہیں پہنچے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی مختصر تاریخ ادب میں بھی شاید ہی جگہ مل سکے۔ ان کے آیندہ کئی ایڈیشنوں کے صفحات کی پیشگی بکنگ ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی تاریخ میں انھیں معاصرین کا ذکر کرتے ہیں، جن کے چال چلن سے وہ پوری طرح مطمئن ہوتے ہیں۔ یعنی وہ اس کا اطمینان کر لیتے ہیں کہ کسی ادیب کا دبستان سرگودھا سے تو تعلق نہیں۔ اگر کسی ادیب کی ڈاکٹر وزیر آغا یا ڈاکٹر انور سدید سے رسمی ملاقات بھی ہو، تو وہ اس کے ذکر سے اپنی تاریخ ادب کے صفحات کو آلودہ نہیں کرتے، کیونکہ ان صفحات کو آلودہ کرنے کے انھیں اور بھی بہت سے طریقے معلوم ہیں۔ ہمیں قمر علی عباسی کا جھکاؤ دبستان سرگودھا کی طرف معلوم ہوتا ہے کیونکہ انھوں نے کتاب کا فلیپ سلطان جمیل نسیم سے لکھوایا ہے۔ سلطان جمیل نسیم کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ ان کا پورا خاندان دبستان سرگودھا سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی لیے تو ڈاکٹر وزیر آغا نے حضرت صبا اکبرآبادی کے مجموعۂ مراثی پر دیباچہ، سلطان جمیل کے افسانوی مجموعے پر فلیپ اور تاجدار عادل کے مجموعۂ کلام پر تبصرہ لکھا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید نے بھی ان تینوں کی کتابوں پر بہت اچھے مضامین لکھے ہیں۔ واضح رہے کہ سلطان جمیل اور تاجدار عادل، حضرت صبا اکبرآبادی کے فرزندان ارجمند ہیں۔ ان دونوں کو لکھنے لکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اپنے عہد کے ایک بڑے شاعر کا فرزند ہونا ان کے لیے کافی ہے اور اسی حیثیت سے وہ ادبی دنیا میں یاد رکھے جائیں گے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ادبی تاریخ میں میر کلو عرش کا نام صرف اس وجہ سے زندہ ہے کہ وہ میر تقی میر کے بیٹے تھے۔ میر کلو عرش کی

شاعری سے کون واقف ہے حالانکہ ان کا دیوان کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔

معاف کیجیے یہ کالم قمر علی عباسی کے لیے لکھا جا رہا ہے، میر کلو عرش کے لیے نہیں۔ ان کا ذکر تو بطور جملۂ معترضہ آ گیا تھا۔ خیر ہم بات وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں اصولاً اسے ختم ہونا چاہیے۔ یعنی یہ کہ اب قمر علی عباسی نے بڑوں کے لیے لکھنا شروع کر دیا ہے۔ ہم انھیں ادبی دنیا میں خوش آمدید کہتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ وہ اس نئی دنیا میں بھی شہرت و مقبولیت کی منزلیں جلد جلد طے کریں، بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے عہد کے اکثر لکھنے والے رسوائی اور عدم مقبولیت کی منزلیں تیزی سے طے کرتے ہیں۔ ویسے عباسی کی شہرت اور مقبولیت کے آثار ابھی سے روشن ہیں، کیونکہ ان کے سفرنامے اخبار خواتین میں بالاقساط شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ایک کثیر الاشاعت اخبار ہے۔ اس میں سویٹر بننے، بال سنوارنے اور مزیدار کھانے پکانے کی ترکیبوں کے ساتھ ساتھ ادبی مضامین بھی خاصی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ گویا کھانا پکانے سے پہلے چولھا جلانے کا سامان بھی موجود ہوتا ہے۔ معلوم نہیں عورتیں اس اخبار کو کس حد تک پڑھتی ہیں، ہم نے اسے ہمیشہ مردوں ہی کے ہاتھوں میں دیکھا ہے۔ اس کے کثیر الاشاعت ہونے کا سبب بھی شاید یہی ہے۔ ظاہر ہے اس اخبار میں جو چیز چھپے گی، اس کا مصنف غیر معروف نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا عباسی کی شہرت کا مسئلہ تو ان کی کتابوں کے چھپنے سے پہلے ہی طے ہو گیا، جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہو گی، وہ ہمارے اس کالم سے پوری ہو جائے گی۔ رہی مقبولیت تو اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ شہرت و مقبولیت لازم و ملزوم ہیں۔ جسے شہرت ملتی ہے، اسے کبھی نہ کبھی مقبولیت بھی حاصل ہو جاتی ہے یا پھر تصور کر لیا جاتا ہے کہ ہر مشہور ادیب مقبول بھی ہوتا ہے۔

''دلّی دور ہے'' کی شانِ نزول یہ ہے کہ ۱۹۸۶ء میں قمر علی عباسی نے اپنے آبائی شہر امروہہ کو دیکھنے کا ارادہ کیا۔ وہ پانچ سال کے تھے، جب انھوں نے ہجرت کی تھی۔ اب پورے ۳۹ برس بعد انھوں نے اپنے آبائی شہر کو دیکھا۔ یہ سفر ان معروف معنوں میں نہیں تھا کہ ایک مسافر ایک مقام سے دوسرے مقام تک کا فاصلہ طے کرے، بلکہ ان معنوں میں تھا کہ کوئی وقت کی حدوں کو توڑ کر اپنے حال سے نکل کر ماضی کی طرف لوٹ جائے۔ قمر علی عباسی کراچی سے امروہہ نہیں گئے بلکہ ۴۴ سال کی عمر سے نکل کر پانچ برس کی طرف لوٹ گئے۔ ان کے ذہن میں اپنے آبائی وطن کی جو دھندلی یادیں تھیں، وہاں پہنچ کر منور ہو گئیں۔ انھوں نے وہ مکان دیکھا، جس میں وہ پیدا ہوئے

تھے۔ وہ گلیاں دیکھیں، جن میں پہلی مرتبہ ان کے قدموں کا زمین سے رابطہ قائم ہوا تھا۔ وہ باغ دیکھے، جن کے خوش رنگ پھولوں اور خوش آواز پرندوں نے بتایا تھا کہ زندگی کتنی خوبصورت ہے۔ ان بڑی بوڑھیوں سے ملے، جن کی گودوں میں انھوں نے پرورش پائی تھی اور جو انھیں قمر علی عباسی کے بجائے "چمن" کے نام سے جانتی تھیں۔ ماضی کے اس سفر میں حیرت بھی تھی اور مسرت بھی۔ حیرت اس پر کہ خواب جیسی یادیں حقیقت بن گئی تھیں اور مسرت اس کی کہ امروہہ کے لوگ ہی نہیں، وہاں کے در و دیوار بھی عباسی کو محبت کی نظر سے دیکھتے رہے۔

لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ انھوں نے جب وہ قبریں دیکھیں، جو ان کے عزیزوں کی تھیں، جنھوں نے پاکستان بنانے کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا، جب ان زندہ لاشوں کو دیکھا، جن سے پاکستان بنانے کی قیمت اب تک وصول کی جا رہی تھی، تو وہ ایک مرتبہ پھر پانچ سال کی عمر کے دائرے سے نکل کر ۴۸ سال کی عمر کے دور میں آ گئے۔ وہ سوچنے لگے کہ ہم پاکستان میں خوش ہیں، خوش حال ہیں، لیکن جن لوگوں کی قربانیوں سے ہمیں یہ ملک ملا ہے، وہ خوش کیوں نہیں ہیں، وہ خوش حال کیوں نہیں ہیں؟ اس سوچ نے عباسی کو اداس کر دیا اور پڑھنے والوں کو بھی یہ سوچ اداس کر دیتی ہے۔

لیکن اس کتاب میں اداس ہونے اور اداس کرنے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ عباسی نے صرف امروہہ نہیں دیکھا، آگرہ، دہلی اور بمبئی کی بھی سیر کی۔ انھوں نے عام "سفرنویسوں" کی طرح یہ نہیں کیا کہ کوئی تاریخی عمارت دیکھی تو اس کے طول و عرض کی تفصیلات، فنِ تعمیر کی خصوصیات اور اسے تعمیر کرانے والے کے حالاتِ زندگی سے صفحوں کے صفحے سیاہ کر دیے ہوں۔ یہ بھی نہیں کیا کہ ایک خاص علاقے میں گھوم پھر کر ان چند لوگوں کا ذکر کر دیا ہو، جنھوں نے ازراہِ مسافر نوازی ایک دو وقت کا کھانا کھلا دیا، بلکہ انھوں نے گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں گھوم کر اور عام لوگوں سے مل جل کر ان شہروں کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کا سراغ لگایا ہے کہ یہ شہر جیتے جاگتے کرداروں کی طرح پڑھنے والوں سے ہم کلام ہوتے ہیں۔

اس سفرنامے کی بنیادی خوبیاں دو ہیں: ایک تو مصنف کا اندازِ نگارش اور دوسری ناصر زیدی کی موجودگی۔ حیرت ہے کہ قمر علی عباسی اتنی اچھی اردو لکھتے ہیں حالانکہ وہ ریڈیو پاکستان میں ملازم ہیں، جہاں اچھی اردو لکھنا تو کیا، اچھی اردو بولنا بھی شرائطِ ملازمت کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔ تین سو صفحات کی اس کتاب میں کوئی صفحہ ایسا نہیں، جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اگر یہ صفحہ نہ لکھا جاتا تو اچھا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ناصر زیدی یہ کہنا پسند کریں گے کہ اگر یہ پوری کتاب ہی نہ لکھی جاتی تو بہتر تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ناصر زیدی بھی قمر علی عباسی کے سامانِ سفر میں شامل تھے۔ یہ وہی اردو کے مشہور شاعر ہیں، جن کی ایک غزل مشہور مغنیہ منّی بیگم نے ٹی وی سے اس دھوکے میں گائی تھی کہ یہ ناصر کاظمی کی غزل ہے۔ اس پر ناصر زیدی نے دھمکی دی تھی کہ وہ ٹی وی والوں پر مقدمہ دائر کر دیں گے کہ ان کی غزل ناصر کاظمی سے منسوب کی گئی۔ ناصر کاظمی کے وارثوں نے بھی احتجاج کیا تھا کہ اس غزل کو مرحوم کے نام سے منسوب کر کے ان کی شہرت کو داغ دار کیا گیا ہے۔ اس واقعے کے بعد ناصر زیدی کا شمار ملک کے مشہور شاعروں میں ہونے لگا۔ اسی شہرت سے متاثر ہو کر قمر علی عباسی انھیں اپنے ساتھ ہندوستان لے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ اتنا مشہور شاعر ساتھ ہوگا تو ہندوستان والے ان کی خوب آؤ بھگت کریں گے۔

آؤ بھگت ہوئی مگر بہ اندازِ دیگر۔ سب سے پہلے تو بمبئی ایئرپورٹ پر کسٹم والوں نے شبہے کی نظر سے دیکھا اور خاصی دیر تک پریشان کیا کہ اگر ان کے پاس ازقسمِ منشیات کوئی چیز ہو تو اس کا اعتراف کرا لیا جائے۔ ان بیچاروں کے پاس کیا تھا سوائے ناصر زیدی کی بیاض کے، جس کا نشہ کثرتِ استعمال سے زائل ہو چکا تھا اور وہ ترشی پیدا ہو چکی تھی جو نشہ اتار دیتی ہے۔ کسٹم سے یہ دونوں بچ کر نکلے تو ایک ہوٹل میں جا ٹھہرے۔ وہاں ایک بیرے نے بدسلوکی کی تو اسے یہ کہہ کر دھمکایا، "ہم پاکستان کے درجۂ اول کے بدمعاش ہیں۔" بیرا شریف تھا، اس لیے ڈر گیا۔ اگر وہ بھی بدمعاش ہوتا تو غیر ملک میں جا کر سچ بولنے کا کوئی برا نتیجہ بھی سامنے آ سکتا تھا۔ بمبئی میں یہ دونوں دلیپ کمار سے ملنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔ لہٰذا اس کے گھریلو ملازم سے فون پر بات چیت کر کے دلیپ کمار سے ملاقات نہ ہونے کا غم ہلکا کر لیا۔

بمبئی میں جیسے تیسے گزارا کرنے کے بعد یہ دونوں دلی پہنچے۔ رسالہ "شمع" کے دفتر میں حاضری دی۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ یونس دہلوی دیگر بہت سے دہلویوں کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے دروازے پر کھڑے ہوں گے، لیکن وہاں ایک چوکیدار کھڑا تھا، جس نے ان دونوں کو دفتر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ بہت منت سماجت کے بعد وہ سنگ دل رام ہوا۔ جب یہ دونوں یونس دہلوی کے کمرے میں پہنچے، تو وہ اپنے کسی دفتری اہلکار کے ساتھ بجلی کے بل

کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس سے فارغ ہوئے تو کسی کو ٹیلی فون کرنے لگے۔ خاصی دیر کے بعد وہ مہمانوں کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اس توجہ میں بھی تغافل کی خاصی آمیزش تھی۔ مہمانوں سے معذرت کی کہ انھیں کہیں جانا ہے اور اپنے چپراسی کو ہدایت کی کہ وہ دفتر بند کر دے۔ خیریت گزری کہ وہاں چپراسی موجود تھا ورنہ دفتر بند کرنے کا کام بھی مہمانوں سے لیا جاتا۔

اس فقید المثال استقبال کے بعد یہ دونوں رسالہ ''بیسویں صدی'' کے دفتر پہنچے۔ اس رسالے کے ایڈیٹر کے نام ایک سفارشی خط ان کے پاس تھا، جس کی بنا پر انھیں یقین تھا کہ ایڈیٹر صاحب دیدہ و دل فرشِ راہ کریں گے اور ان دونوں کا باتصویر انٹرویو اپنے رسالے میں شائع کریں گے۔ ایڈیٹر صاحب کی خدمت میں خط پیش کیا گیا۔ انھوں نے پڑھے بغیر اسے جیب میں رکھ لیا۔ دو چار رسمی باتوں کے بعد ایڈیٹر صاحب اپنی کرسی سے اٹھ گئے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے، آپ تشریف لے جائیے۔

مذکورہ دونوں ہندوستانی ایڈیٹروں نے پاکستانی مشاہیر کے ساتھ جو سلوک کیا، اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ یہ سنگین معاملہ دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی سطح پر غور کرنے کے لائق ہے، لیکن قمر علی عباسی نے ناصر زیدی کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اس پر ہم صدائے احتجاج بلند کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ عباسی نے زیدی کو ایک ایسے کردار کی حیثیت سے پیش کیا ہے، جس کا کام قارئین کو ہنسانا ہے۔ حالانکہ انھیں ایک شاعر ہی کی حیثیت سے پیش کر کے قارئین کو رُلانے کا کام بھی لیا جا سکتا تھا۔

عباسی نے زیدی کے بارے میں ایسے ایسے واقعات لکھے ہیں، جنھیں پڑھ کر ہنسی تو آتی ہے، لیکن کتاب کے مصنف پر غصہ بھی آتا ہے کہ وہ ہمارے ملک کے ایک معتبر شاعر کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں، جس کی توقع ''شمع'' اور ''بیسویں صدی'' کے ایڈیٹروں سے تو کی جا سکتی ہے، ایک ذمہ دار ادیب سے نہیں کی جا سکتی۔ ''ذمہ دار ادیب'' کے الفاظ ہم نے قمر علی عباسی کی تقلید میں اپنے قارئین کو ہنسانے کے لیے لکھے ہیں، ورنہ ہم یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ عباسی نے زیدی کو مضحکہ خیز انداز میں پیش کر کے غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔

عباسی نے زیدی کی شاعری اور حسن پرستی کے بارے میں ایسے بہت سے واقعات لکھے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زیدی کی شاعری کو ان کی حسن پرستی، اور ان کی حسن پرستی کو ان کی شاعری نے ڈبو دیا اور ان دونوں نے مل کر خود موصوف کو ڈبو دیا۔ افسوس کہ ہم ان واقعات کو نقل نہیں کر سکتے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارا کالم ایک سنجیدہ جریدے میں چھپتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم زیدی کی شہرت کو مزید خراب نہیں کرنا چاہتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ عباسی نے ''مزید'' کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

مختصر یہ کہ یہ سفرنامہ، سفرنامہ نہیں ''زیدی نامہ'' ہے۔ اسے ان لوگوں کو ضرور پڑھنا چاہیے، جو اسمگلنگ اور منشیات کا کاروبار کرتے ہیں۔ کیونکہ اسے اُردو کا عام قاری خریدنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ قیمت صرف دو سو روپے ہے۔

سلیم احمد کے رزمیے کا بزمیہ پہلو

سلیم احمد مرحوم کو ہم سے جدا ہوئے تقریباً چھ سال گزر چکے ہیں۔ ان چھ برسوں میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہوگا کہ ہم نے انھیں اپنے درمیان محسوس نہ کیا ہو۔ ادب کا کوئی مسئلہ ہو، کوئی بحث ہو، اس کے حوالے سے سلیم احمد کا ذکر ضرور آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے عہد کے سارے ادبی مسئلے اور ساری ادبی بحثیں ان کے حوالے کے بغیر نامکمل نظر آتی ہیں۔ سلیم احمد کی موجودگی کا احساس اس لیے بھی ہوتا ہے کہ ان کی کتابیں مسلسل چھپ رہی ہیں۔ گزشتہ چھ برسوں میں چھ کتابیں چھپ چکی ہیں اور اب ساتویں کتاب ''مشرق'' شائع ہوئی ہے جسے مرحوم مطبوعہ صورت میں دیکھنے کے بے حد متمنی تھے۔

''مشرق'' ایک طویل نظم ہے، جس میں انھوں نے اپنی ذات کے حوالے سے اپنے عہد اور اس کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا دیباچہ سلیم احمد نے اپنی وفات سے صرف ۳۸ دن پہلے لکھا تھا۔ انھوں نے بتایا ہے کہ......

''اس میں اقدار و عقائد کی اس شکست کا بیان ہے جس میں علامت (۱۹۷۱ء کے) الیکشن میں دائیں بازو کی ہار ہے۔ پھر یہ نظم میری پوری زندگی کو سمیٹتی ہوئی اس دور تک پہنچتی ہے جب ۱۹۶۴ء میں میں ایک شدید اختلالِ ذہنی کا شکار ہوا تھا۔ اس حادثے کے دوران میرا ذہن جس طرح حرکت کرتا تھا، میں نے اس حرکت کو اسی طرح ریکارڈ کرنے کی کوشش کی ہے، جس طرح وہ میرے ذہن میں پیدا ہوئی تھی۔ ابھی یہ نظم نامکمل ہے۔ ارادہ تھا کہ اسے تین حصوں میں لکھوں گا۔ پہلا حصہ ''مشرق ہار گیا''، دوسرا حصہ ''مغرب''، تیسرا حصہ ''رب المشرقین و رب المغربین''۔ جس میں میں اس پورے دور کے بارے میں اپنے نظریات و خیالات پیش کروں گا۔ لیکن یہ نظم ''نیند کی وادی'' پر آ کر ختم ہوگئی اور ایسی غائب ہوگئی کہ اب اس کا کوئی سراغ میرے اندر موجود نہیں ہے۔ اگر آج کا گم شدہ سرا ہاتھ آیا اور نظم اس تصور کے مطابق ختم ہوئی۔ جو میرے ذہن میں موجود ہے تو اس پوری نظم کا نام ''کشتیِ نوح'' ہوگا جو ایک عالمگیر سیلاب میں سلامتی اور نئی زندگی کا استعارہ ہے۔ بہر حال نظم اب تک جس صورت میں موجود ہے، قارئین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ یہ نظم نہیں، میری روح کا رزمیہ ہے۔''

سلیم احمد کے اس رزمیے پر لکھنے کا حق ان دانشوروں کا ہے، جو اس کی گہرائی میں جا کر مطالعہ کریں گے۔ ہم جیسے سطحی بین تو اس نظم کے بزمیہ یا طربیہ پہلو ہی کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس رزمیے کا بزمیہ پہلو وہ ہے جہاں سلیم احمد نے اپنے بعض معاصرین کا ذکر کیا ہے، یہ معاصرین ادبی دنیا کے جانے پہچانے لوگ ہیں۔ ان کی شخصیت نگاری کا حق ادا کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا، کوئی اور لکھتا تو دفتر کے دفتر سیاہ کر دیے جاتے، لیکن سلیم احمد نے ہر ایک کے بارے میں چند مصرعوں میں اتنا کچھ کہہ دیا ہے کہ مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ سلیم احمد کی نظر اتنی تیز تھی کہ چہروں پر پڑے ہوئے تہ در تہ نقابوں کو ہٹا کر، اصل خد و خال دیکھ لیتی تھی۔ سلیم احمد نے جو کچھ دیکھا تھا، اسے اپنے مخصوص فن کارانہ انداز سے اشاروں کنایوں میں بیان کر دیا ہے۔

سلیم احمد نے شخصیات کا جو آئینہ خانہ سجایا ہے، ممکن ہے اس میں بعض لوگوں کو اپنے چہرے دیکھ کر افسوس ہو، لیکن انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ ''مشرق'' بنیادی طور پر ایک آپ بیتی ہے۔ آپ بیتی لکھنے والا اپنے ماحول کی نقش گری ان افراد ہی کے ذریعے کرتا ہے جو اس کی زندگی کی راہ میں کبھی ستارہ بن کر چمکتے ہیں، کبھی پھول بن کر مہکتے ہیں اور کبھی کانٹا بن کر پیوست رگِ جاں ہو جاتے ہیں۔ جب یہ سب کچھ ماضی کا حصہ بن جاتا ہے تو آپ بیتی لکھنے والا اس کے حوالے سے اپنے آپ کو دریافت کرتا ہے۔ سلیم احمد نے اپنے آپ کو دریافت کرنے کے لیے جن شخصیات سے ''بے تکلفی'' کا اظہار کیا ہے، ان میں سے دو چار کا ذکر خیر آپ بھی سن لیجیے۔

ذوالفقار علی بخاری

وہ چہرہ کہ ہے جمع جس پر بکثرت
شرافت، ذہانت، شرارت، خباثت

حمایت علی شاعر

بظاہر تو ہیں انقلابی جواں سے

پہ چہرہ وصولا ہے ایوب خاں سے
بہر حال شہرت کے جنگلے میں پہنچے
سڑک سے چلے اور بنگلے میں پہنچے

قمر جمیل

یہ استاد ہیں اپنے فنِ سخن میں
بہت بول کر کچھ نہ کہنے کے فن میں
یہ اپنے لیے خود سراسر زیاں ہیں
کہ ہیں گوہر ناب پر رائگاں ہیں
میں باندھوں انھیں گھر کے باہر کہ بہتر
مرے واسطے ہیں یہ اوجھے کے تیتر

احمد ہمدانی

یہ احساس میں لاکھ ہوں اپنے صادق
کئی لوگ کہتے ہیں ان کو منافق
غلط چال کوئی یہ ایسی چلے ہیں
سمجھتے ہیں کچھ لوگ یہ دوغلے ہیں
مجھے تو یہ سچ ہے بہ نقشِ جلی ہیں
بظاہر تو کافر ہیں خفیہ ولی ہیں

نظیر صدیقی

کہوں کیا کہ مشہور نقاد ہیں یہ
اور اس پر ستم ہے کہ استاد ہیں یہ
نہ دوزخ سے ڈر کر نہ جنت کی خاطر
بہت دکھ اٹھائے ہیں شہرت کی خاطر

مظفر علی سیّد

خلوص ان کا زندہ محبت جواں ہے

مگر ان سے ملنے میں جاں کا زیاں ہے

صہبا اختر

غزل یا رباعی قطعہ ہو کہ دوہا
ہر اک کھیت میں آپ نے ہل چلایا
مگر کچھ نہ اُگنے سے مایوس ہو کر
گئے ہیں یہ کے مگر روس ہو کر

شمیم احمد

کوئی شیروانی پہ ان کی نہ جائے
اگر مسکرائیں تو دھوکا نہ کھائے
یہ اندر سے ہیں ایک بانکے چھبیلے
بہت شوخ ہیں اور نہایت رنگیلے
لحاظ ان کی آنکھوں کا کرتا ہوں میں بھی
مگر ان کی مونچھوں سے ڈرتا ہوں میں بھی

جمال پانی پتی

یہ عالی کے پکے چہیتے
محبت کی بازی نہ ہارے نہ جیتے
کہ آخر بڑے خلوص سے جو جوڑا
کئی سال کے بعد عالی نے توڑا

رضی اختر شوق

سبب ہو نہ ہو کچھ نہ کچھ سرگراں سے
زمانے سے رہتے ہیں کچھ بدگماں سے
کہیں سے اگر ککڑی بھی یہ کھائیں
تو نام ان کو یاروں کے سب یاد آئیں
یہاں تک ہیں شکی کہ خود جانتے ہیں

یہ تعریف کا بھی برا مانتے ہیں
بہت خونِ میرا ابھی پی چکے ہیں
مگر تھوڑے دن دودھ بھی پی چکے ہیں

کوئی یہ نہ سمجھے کہ سلیم احمد نے دوسروں ہی کو تختۂ مشق بنایا ہے، انھوں نے اپنے آپ کو بھی نہیں بخشا۔ دیکھیے اپنے بارے میں کیا کہتے ہیں:

زمانے کا الزام مجھ پر ہے ظاہر
کہ میں ہوں خلوص و محبت کا تاجر
ہمت کاریوں کا وہ استاد ہوں میں
کہ سب ہیں چڑے اور صیاد ہوں میں
بڑے ہوں کہ چھوٹے منجھولے کہ بچلے
مرے بھٹ میں آئے تو باہر نہ نکلے
خدا جانے کیسے پولس سے بچا ہوں
شکاگو کے گینگسٹروں کا چچا ہوں
وہ ہتھکنڈے میرے کہ بچ کر نہ جائیں
ادب کی فضا میں جو ٹیلنٹ آئیں
انھیں سے ہے قائم مری ٹھیکیداری
میں معصوم ذہنوں کا ظالم شکاری
بڑا زعم ہے مجھ کو میں مستند ہوں
سند بانٹتا ہوں کہ خود بے سند ہوں
غرض ہر طرف اپنے مہرے جماؤں میں ایسا کہ جب اپنی ڈوری ہلاؤں
کسی کو تو کیا عسکری کو نچاؤں

سلیم احمد نے اپنے معاصرین کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے متعلق ہمارا کچھ کہنا چھوٹا منھ بڑی بات کے مصداق ہوگا، البتہ ہم جمال پانی پتی اور رضی اختر شوق کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کریں گے، کیونکہ چھوٹے منھ سے چھوٹی بات ہی اچھی لگتی ہے۔ سلیم احمد

نے کہا ہے کہ جمال پانی پتی پہلے عالی کے چہیتے تھے، مگر بعد میں سلیم احمد نے انھیں عالی سے توڑ لیا۔ ہمارا خیال ہے کہ سلیم احمد کے اس احسان سے عالی صاحب زندگی بھر سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

رضی اختر شوق کے شکی مزاج ہونے کا ہمیں بھی ذاتی تجربہ ہے۔ ایک مرتبہ ہم نے ان کے کسی شعر کی تعریف کی تو کہنے لگے: "شاید یہ شعر اچھا نہیں ہے، ورنہ آپ اس کی اتنی تعریف نہ کرتے۔ میں اس شعر کو اپنے دیوان سے خارج کر دوں گا۔" ہم نے عرض کیا: "ایسا ہرگز نہ کیجیے گا۔ یہی ایک شعر تو آپ کی شاعری کی جان ہے۔ اسے دیوان میں رہنے دیجیے، باقی سارا کلام خارج کر دیجیے۔"

"مشرق" کے ناشر نامور شاعر افتخار عارف ہیں۔ وہ خود لندن میں ہیں اور اپنے کارندوں کے ذریعے کتاب کراچی میں چھپوائی ہے۔ سلیم احمد سے ان کی محبت اور عقیدت کا یہ بے مثال ثبوت ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کتاب چھپوانے کا اصل سبب یہ ہے کہ اس میں ایک درجن مصرعے افتخار عارف کی تعریف میں ہیں۔ جس کتاب میں اچھے اچھوں کو معاف نہیں کیا گیا، اس میں افتخار عارف کی تعریف کے ایک درجن مصرعوں کی موجودگی سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ مصرعے الحاقی تو نہیں، یعنی دوران طباعت اضافہ تو نہیں کیے گئے۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو، ان مصرعوں کی موجودگی کی بنا پر کتاب اس لائق تھی کہ اس قسم کے دو چار مصرعے ہماری تعریف میں ہوتے تو ہم اس کتاب کا پورا اسٹاک خرید کر مفت تقسیم کر دیتے۔ کتاب چھاپ کر افتخار عارف نے کشادہ ظرفی کا ثبوت دیا ہے، کتاب خرید کر ہم بھی کشادہ دلی کا ثبوت پیش کرتے۔

کتاب کے سرورق پر سراج منیر کی یہ رائے درج ہے:

"اگر مجھ سے اردو کی پانچ اہم ترین نظموں کا انتخاب کرنے کے لیے کہا جائے تو میں تین اقبال کی، ایک مسدس حالی اور پانچویں مشرق کا انتخاب کروں گا......"

ہم سراج منیر کو یقین دلاتے ہیں کہ ان سے کبھی کوئی ایسی غلط فرمائش نہیں کرے گا کہ آپ اردو کی پانچ اہم ترین نظموں کا انتخاب کر دیجیے۔ البتہ ہم یہ عاجزانہ درخواست ضرور کریں گے کہ اگر انھیں غم روزگار سے فرصت ملے تو اپنی ان پانچوں منتخب نظموں کو ایک مرتبہ پھر پڑھ لیجیے۔

بعض ادیب فرشتوں کے نہیں، اپنے لکھے پر پکڑے جائیں گے

(۱)

ایک وہ زمانہ تھا کہ اک عمر کی ریاضت کے بعد کوئی اس لائق سمجھا جاتا تھا کہ اسے ادیب کہا جائے، اور ایک یہ زمانہ ہے کہ "ریاضت" کا لفظ فن پہلوانی کی اصطلاح کے طور پر باقی رہ گیا ہے۔ استاد لاغر مراد آبادی کا کہنا ہے کہ اب ادب اور پہلوانی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ دونوں کے دم سے اکھاڑے آباد ہیں، جہاں داؤ پیچ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے "ریاضت" کی اصطلاح جس قدر فن پہلوانی سے تعلق رکھتی ہے، اسی قدر اس کا علاقہ ادب سے بھی ہے۔ ہم نے استاد گرامی سے پوچھا، کشتی کے داؤ پیچ تو سمجھ میں آتے ہیں، ادب کے داؤ پیچ کیا ہوتے ہیں؟ فرمایا: "ادیب بن کر ٹی وی اور ریڈیو سے حکومت کا پروپیگنڈا کرنا، مزاحمتی ادب لکھنے کے بہانے حکومت سے لاکھوں روپے کے انعامات حاصل کرنا، اکادمی ادبیات سے ناجائز فائدے اٹھانا، یہ سب کچھ ادبی داؤ پیچ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اخباروں کے ادبی صفحات دیکھیے، یہ اکھاڑے نہیں تو اور کیا ہیں۔ جسے چاہا چت کر دیا، جسے چاہا سر پر اٹھا لیا۔ اگر کسی نام نہاد شاعر نے ٹکٹ بھیج کر کسی اخبار کے ادبی صفحے کے اڈیٹر کو دوبئی یا لندن بلا لیا، وہاں اپنا مہمان بنا کر رکھا اور چلتے وقت تحفے تحائف سے لاد دیا تو وہ نام نہاد شاعر بین الاقوامی اہمیت کا شاعر بن جاتا ہے۔ ادبی صفحے پر اس کی تصویریں لکس صابن استعمال کرنے والی فلم ایکٹریسوں کی تصویروں کی طرح چھپتی ہیں۔ تصویروں کے ساتھ تعریفی مضامین ہوتے ہیں، جن میں شاعر موصوف کو میر و غالب کی صف کا شاعر ثابت کیا جاتا ہے۔ پھر اس کا انٹرویو بھی چھپتا ہے، جس میں پسندیدہ خوشبو، لباس اور کھانوں وغیرہ کے بارے میں "فکر انگیز" سوال و جواب ہوتے ہیں۔"

ہم نے عرض کیا، "لندن یا دوبئی میں رہنے والے شاعر چاہتے ہیں کہ ان کا نام ان کے اپنے ملک میں بھی روشن ہو، اس لیے وہ اخبار کے ادبی صفحوں میں پبلسٹی حاصل کرنے کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ یہ تو اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والا معاملہ ہے۔ کسی تیسرے شخص کی گرہ سے کیا جاتا ہے۔"

کہنے لگے، "گرہ سے کیوں نہیں جاتا۔ ادبی صفحے پر فضول باتیں چھپیں گی، تو لوگ گمراہ ہوں گے۔ اور باتیں چھوڑیے، صرف نام نہاد ادیبوں کے انٹرویو ہی پڑھ لیا کیجیے۔ جو لوگ زندگی میں املا کے دو لفظ بھی نہیں لکھ سکتے، وہ اپنے انٹرویو اس طرح چھپواتے ہیں، جیسے اردو کی ساری لغات انہیں کی لکھی ہوئی ہیں۔" یہ کہہ کر استاد لاغر مراد آبادی نے ایک کتاب ہمارے سامنے رکھ دی اور فرمایا: "اس کتاب کا صرف دیباچہ پڑھ لیجیے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انٹرویو نے ادب اور ادیب کو کتنا رسوا کیا ہے۔"

کتاب دیکھی۔ اس کا نام تھا "حرف من و تو" اور مصنف کا نام آصف فرخی۔ ہم سمجھ گئے کہ استاد کس وجہ سے کتاب اور اس کے مصنف سے ناراض ہیں۔ ہم نے کہا، "آصف فرخی تو بہت معقول لکھنے والے ہیں۔ ان سے آپ کو کیا شکایت ہے؟" فرمایا: "ان سے کیا شکایت ہو گی۔ شکایت تو ان لوگوں سے ہے، جن کا تذکرہ آصف نے کتاب کے دیباچے میں کیا ہے۔ فرصت ملے تو ذرا یہ دیباچہ پڑھ لیجیے گا۔"

استاد کے تشریف لے جانے کے بعد ہم نے کتاب کی ورق گردانی کی۔ آصف فرخی نے طویل دیباچہ لکھا ہے، استاد کی ہدایت کے مطابق ہم نے صرف اسی کو پڑھا ہے۔ ویسے بھی یہ دیباچہ اتنا دلچسپ ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد کتاب پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ کسی کتاب پر دیباچہ عموماً اس لیے لکھا جاتا ہے کہ کتاب پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہو۔ آصف فرخی نے اپنی کتاب پر دیباچہ شاید اس لیے لکھا ہے کہ قاری اسی کے مطالعے سے سرشار ہو جائے اور کتاب کو پڑھے بغیر طاق پر رکھ دے۔

"حرف من و تو" انٹرویوز کا مجموعہ ہے۔ اس کے دیباچے کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتابیں بھی اپنی تقدیر ساتھ لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ بعض کتابیں

بڑی اللہ آمین کے بعد درشن دکھاتی ہیں۔ بعض ایسی ہوتی ہیں کہ اپنے لکھنے والوں کی بہت زیادہ خواہش اور منشا کے بغیر یوں ہی چلتے چلاتے عالم موجودات میں آ جاتی ہیں...... شاید یہ کتاب بھی ان ہی ضد کی کتابوں میں سے ایک ہے، جو جنم لینے پر مصر ہوتی ہیں...... یہ کتاب اپنی سمتوں کا تعین کر کے مجھے خود ہی اپنے پیچھے پیچھے کھینچ لائی۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی، تو اس کی تیاری کے لیے محنت مشقت بھی نہیں کی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس کتاب کے حوالے سے کچھ شرم سی دامنگیر تھی۔ اس کے مسودے کو میں نے مرتب تو کیا لیکن اوپری دل سے۔ جس طرح بیوہ کی شادی ہوتی ہے!''

بیوہ کی شادی ایک نیک کام ہے، لیکن آصف فرخی اس نیکی سے خوش نظر نہیں آتے۔ لکھتے ہیں......

''کیا اس کتاب کی ضرورت تھی؟ کیا اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا؟ افسوس کہ میرے پاس اس کتاب کے بارے میں جواب، واضح اثبات میں نہیں۔''

معلوم نہیں آصف فرخی کس زمانے اور کس عمر کے آدمی ہیں، جو اپنی کتاب کے دیباچے میں اس قدر شرمندگی کا اظہار کر رہے ہیں اور یہ بھی بتا رہے ہیں کہ اس کتاب کے چھپنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی اور اس کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا۔ حالانکہ آج کل جو شخص بھی اپنی کتاب چھپواتا ہے، وہ خود شرمندہ نہیں ہوتا، اپنے پڑھنے والوں کو شرمندہ ہونے کا موقع دیتا ہے۔ اور پھر یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ اگر اس کی کتاب شائع نہ ہوتی تو ادب مفلس رہ جاتا، دنیا کے سارے کام خلل پذیر ہو جاتے۔

آصف فرخی کے سراپا ندامت ہونے کا سبب یہ معلوم ہوا کہ انھیں اس کا احساس ہے کہ اخباروں اور رسالوں میں ''انٹرویو'' کے نام سے جو کچھ چھپ رہا ہے، وہ بے حد سطحی ہے۔ وہ اپنا شمار انٹرویو لینے والوں میں نہیں کرانا چاہتے۔ وہ یہاں تک خائف ہیں کہ......

''میں ہرگز نہیں چاہتا کہ روزِ قیامت انٹرویو کرنے والوں میں سے اٹھایا جاؤں اور جرمانۂ ادب کے نام پر باتوں کا یہ پٹارا میرے سر مارا جائے۔''

ایک مرتبہ ہم نے لکھا تھا کہ قیامت کے روز لوگ فرشتوں کے لکھے پر پکڑے جائیں گے، لیکن بعض ادیبوں کے لیے خود ان کا اپنا لکھا کافی ہوگا۔ آصف فرخی کو پریشان نہیں ہونا چاہیے

کیونکہ ان کی اس کتاب کا بڑا حصہ دوسرے ادیبوں کا نتیجۂ فکر ہے، انھوں نے تو ہر ایک سے مختصر سوال کیے ہیں۔ ان سوالوں کی بنا پر ان شاء اللہ کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔ ہاں دوسری وجہ کی بنا پر کچھ ہوا، تو وہ الگ معاملہ ہے۔

آصف فرخی نے موجودہ دور میں انٹرویو نگاری کی جو تصویر کشی کی ہے، وہ خاصی ہولناک بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ وہ لکھتے ہیں۔

''یہ انٹرویوز مختلف مفادات کی خدمت برآری کرتے ہیں۔ بعض حضرات تو انٹرویو دینے میں اتنی مستعدی اور باقاعدگی دکھاتے ہیں کہ اپنے ادب کی تخلیق میں بھی نہیں دکھاتے۔ کچھ انٹرویوز کا اہتمام اس احتیاط سے کیا جاتا ہے کہ لوگوں کو مرید ان کی پراندی کی شکایت بھی نہ ہو اور رنگ بھی چوکھا آئے۔ بعض کے لیے یہ دل کے پھپھولے پھوڑنے اور حسرتیں پوری کرنے کا موقع ہوتا ہے اور وہ اس کی تاک میں رہتے ہیں۔ ایک جدید شاعر نے، جو اپنے وجود کا احساس اپنی شاعری کی بجائے اپنے انٹرویوز سے کراتے ہیں، اپنے ڈھب کے کسی صحافی کی تلاش سے مایوس ہو کر اپنے آپ کو صحافی فرض کر لیا...... اور اپنے سوالوں کے جواب آپ ہی دے ڈالے۔ اکثر سوالوں کا قصد بھی مدح خود تھا...... یہ نسخہ خاصا آسان ہو گیا ہے۔ کسی بھی اخبار کے نام نہاد ادبی ایڈیشن کو اٹھا کر دیکھ لیجیے، تھوڑی سی اسکینڈل مونگرنگ، کچھ تیز تیز فقرے کچھ چھینٹے۔ کچھ کسی کا حساب چکایا ہوا، دو چار کی پگڑیاں اچھالی ہوئیں، کچھ اپنے من پسند اندھوں کے لیے ریوڑیاں، کچھ نرگسیت آمیز خود ادعائی...... یہ گرما گرم انٹرویو تیار، جو تندور سے نکلی ہوئی تازہ روٹی کی طرح اخبار کے صفحات پر چھاپ دے رہا ہے کہ دشمنوں کا منھ کالا اور اپنوں کا بول بالا...... ادبی سرگرمی کا مطلب بس اسی قدر رہ گیا ہے۔''

آصف فرخی نے ایک جدید شاعر کا حوالہ دیا ہے کہ انھوں نے خود ہی صحافی بن کر اپنا انٹرویو مرتب کر لیا۔ آصف نے شاعر محترم کا نام نہیں لکھا، لہٰذا ہم بھی نام لیے بغیر انھیں مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے انٹرویو نگاری کا جو جاذبِ نظر طریقہ نکالا ہے، اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کسی دوسرے کا احسان اور اپنے ضمیر کا بوجھ اٹھانے سے بچ جاتا ہے۔

آصف فرخی کے انٹرویو انگریزی رسالے ''ہیرلڈ'' میں چھپا کرتے تھے۔ اس زمانے کی بعض ''ہارگلوز'' یادوں کو بھی انھوں نے قلم بند کیا ہے۔ لکھتے ہیں......

"ایک صاحب نے اپنا انٹرویو کروانے کے لیے ہیرلڈ کی مدیرہ سے سفارش بہم پہنچائی۔ میں نے ان کا انٹرویو پھر بھی نہ کیا۔ ایک مشہور مصنفہ کے شوہر نے اس انداز سے اپنی بیگم کے انٹرویو کے لیے کہا کہ میں شرمندہ ہو گیا۔ ایک شاعرہ نے، جس کی شاعری ان کی شہرت سے دو چار قدم پیچھے ہے، انٹرویو کی میز ان اپنی جانب جھکانے کے لیے ہیرلڈ کے ادارتی عملے کو بھی پریشان کیا اور میرے گھر والوں پر بھی اپنے حسن اخلاق کا جادو جگانے کی کوشش کی۔ ایک آتش مزاج افسانہ نگار نے یہ فرمائش کی کہ وہ اشاعت سے قبل انٹرویو کو ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں بصد احترام ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے ایک ٹائپ شدہ مسودہ میری طرف بڑھا دیا کہ یوں ہوگا انٹرویو۔ میں ان سے معذرت کر کے چلا آیا کہ آپ کو اخباری بیان جاری کرنا ہے، تو میرے کندھے پر رکھ کر بندوق نہ چلائیے۔ وہ رسالے کو عدالتی نوٹس کی دھمکی دینے لگے۔"

آصف فرخی کو یہ پسند نہیں کہ کوئی ان کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خود انھوں نے ایک درجن سے زیادہ ادیبوں کے کندھوں پر رکھ کر انٹرویو کی بندوق کس طرح چلائی ہے۔ اس کا اندازہ کتاب پڑھ کر ہی ہو سکتا ہے۔

(۲)

آصف فرخی کی کتاب "حرف من و تو" میں ہر ٹائپ کے ادیبوں کے انٹرویو شامل ہیں۔ بعض ایسے ادیب ہیں، جنھوں نے زندگی بھر لکھا ہے، پڑھا کچھ بھی نہیں۔ بعض ایسے ہیں جو زندگی بھر پڑھتے رہے ہیں، لیکن کام کی کوئی چیز نہیں لکھ سکے۔ بعض نے لکھنے اور پڑھنے میں توازن قائم کیا ہے، نتیجہ یہ کہ وہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ بعض انٹرویو دینے والوں نے اپنے علم کی نمائش کر کے انٹرویو لینے والے کو شرمندہ کیا اور بعض نے اپنے علم پر پردہ ڈال کر خود شرمندہ ہونے کی سعادت حاصل کی۔

آصف فرخی اگرچہ نوجوان ہیں، لیکن ان میں ایک بات بوڑھوں والی یہ ہے کہ وہ صرف اردو ادب ہی سے نہیں، عالمی ادب سے بھی اچھی خاصی واقفیت رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے بعض ادیب ان کے سامنے اس طرح نظر آتے ہیں، جیسے وہ انٹرویو نہیں دے رہے، امتحان دے رہے ہیں۔ آصف فرخی نے اپنے ٹیڑھے سوالوں سے کئی ادیبوں کو مشکل میں ڈالا اور پھر خود ہی ان سوالوں کے جواب دے کر انھیں مشکل سے نکالا۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کتاب میں اکثر مقامات ایسے نظر آتے ہیں، جہاں یہ احساس ہوتا ہے کہ آصف فرخی خود ہی اپنا انٹرویو لے رہے ہیں۔

آصف فرخی کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ادیب کی محدودات کا خیال رکھتے ہیں۔ کبھی مختصر سوال کر کے طویل جواب حاصل کرتے ہیں اور کبھی طویل سوال کر کے مختصر جواب حاصل کرتے ہیں۔ اس وجہ سے انٹرویو دینے والا ادیب اس حد تک بے فکر ہو جاتا ہے کہ سوالوں سے بے نیاز ہو کر اظہار خیال کرتا رہتا ہے۔ اور کہیں کہیں تو "سوال از آسمان جواب از ریسمان" کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ انٹرویو دینے والا طویل گفتگو کے بعد آصف سے پوچھتا ہے، "آپ کا سوال کیا تھا؟"

آصف فرخی کے بارے میں اب تک ہمارا خیال تھا کہ وہ ادبی گروہ بندی میں یقین نہیں رکھتے، لیکن "حرف من و تو" سے ہمارے اس خیال کی نہایت عمدگی سے تردید ہوتی ہے۔ چند خاص شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں سے انھیں خدا واسطے کی دلچسپی ہے۔ (خدا واسطے کا بیر ہو سکتا ہے، تو دلچسپی کیوں نہیں ہو سکتی؟) انھوں نے اپنے ان پسندیدہ ادیبوں کا پروپیگنڈا اس زور شور سے کیا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کتاب کے مصارف طباعت انھیں ادیبوں نے برداشت کیے ہوں۔ انٹرویو لیتے وقت آصف کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان کے پسندیدہ ادیبوں کا ذکر آ جائے۔ بات کوئی بھی ہو رہی ہو، وہ گھما پھرا کر ان ادیبوں کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو یہی پوچھ لیتے ہیں، "فلاں افسانہ نگاری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" سوال کا انداز ایسا "ملتجیانہ" ہوتا ہے کہ جواب دینے والے کو فلاں صاحب کی تعریف کرنی ہی پڑتی ہے۔

اس کتاب میں ہر نوع کے انٹرویو ملتے ہیں۔ فکر انگیز، حیرت انگیز، مسرت انگیز، یہاں تک کہ ایک آدھ انٹرویو شر انگیز بھی ہے۔ غلام عباس، سلیم احمد، فیض احمد فیض اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے انٹرویو بلاشبہ فکر انگیز ہیں، کیونکہ ان میں ادب کے بنیادی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اور مظفر علی سید کے انٹرویو حیرت انگیز ہیں، کیونکہ ان میں بعض بے بنیاد مسائل بھی زیر بحث آ گئے ہیں۔ نیز بعض امور پر ایسی گفتگو بھی ہوئی ہے جو قاری کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ مثلاً افسانے کے نقاد کی حیثیت سے شمس الرحمٰن فاروقی کی حیثیت مسلّم ہے۔ انھوں نے

جس فکر انگیز انداز سے افسانے کے فن پر بحث کی ہے، اس سے جدید افسانہ نگاروں کو اپنی راہ متعین کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے افسانہ نگاروں کی پوری ایک نسل کو گمراہ کیا ہے (یہ بات خود فاروقی صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں بتائی ہے)۔ یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ فاروقی صاحب "گمراہان جادہ افسانہ" کے رہنما ہیں...... بایں ہمہ فاروقی صاحب نے اپنے انٹرویو میں اعلان کیا ہے کہ...... "میں اپنے کو افسانے کے قابل نہیں سمجھتا، میرا ابتدائی شعبہ یعنی کہ میرا جو بنیادی مشغلہ ہے اور قسم کی چیزیں ہیں، لیکن دلچسپی والی بات اس میں نہیں ہے......" افسانے سے فاروقی صاحب کو دلچسپی نہیں ہے، اس کے باوجود انھوں نے افسانہ نگاروں کی پوری ایک نسل کو گمراہ کیا۔ ادب کے جن شعبوں سے انھیں دلچسپی ہے، خدا جانے وہاں کیا گزری ہوگی۔ وہاں ایک سے زیادہ نسلوں کے گمراہ ہونے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مظفر علی سید کے انٹرویو میں بہت سی باتیں حیرت انگیز ہیں۔ مثلاً عبداللہ حسین اپنی تحریروں میں پنجابی الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں، ان کی اس مستحسن کوشش کی داد سید صاحب نے ان لفظوں میں دی ہے۔

"ان کی پنجابی کی آمیزش کہیں کہیں ان کے ہم وطن استاد امام دین کے قریب پہنچ جاتی ہے۔"

ہمارے خیال میں سید صاحب نے استاد امام دین کے ساتھ زیادتی کی ہے، استاد مرحوم اک عمر کی مشقِ سخن کے بعد جس مرتبے پر پہنچے تھے، عبداللہ حسین چند روزہ مشقِ ستم کے بعد اس مرتبے تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں؟

مظفر علی سید نے ڈاکٹر انور سجاد اور انیس ناگی کے ساتھ بھی ناانصافی کی ہے۔ آصف فرخی نے ان دونوں کی ناول نگاری کے بارے میں رائے طلب کی تو سید صاحب نے فرمایا۔

"ناول بطور آرٹ فارم کے ان کا دردِ سر نہیں رہا۔" سید صاحب نے اگر ان دونوں کے قارئین کے دردِ سر کا خیال کیا ہوتا، تو وہ مزید یہ نہ فرماتے۔

"نثر لکھنے کے لیے اردو زبان پر جو دسترس چاہیے، وہ مشاقی اور بسیار نویسی کے باوجود (ان دونوں کو) حاصل نہیں ہوئی۔ وہ گرفت نہیں ہے، وہ قابو نہیں ہے، جو ایک ہنرمند آدمی کے

ہاں ملتا ہے...... (ان دونوں کے ناول) فیشن کی پیداوار زیادہ معلوم ہوتے ہیں، بہ نسبت اس کے کہ وہ زندگی کے ساتھ کوئی گہری واردات یا کوئی گہرا نفسیاتی تجزیہ بیان کریں۔"

اب سید صاحب جیسے ادب شناس کو کون بتائے کہ ہمارا سارا جدید ادب ہی فیشن کی پیداوار ہے۔ اگر انور سجاد اور انیس ناگی نے فیشن کے طور پر ناول لکھ دیے تو اس میں کیا برائی ہے۔ ان ناولوں کو ادب کے معیاروں سے نہیں، فیشن کے معیاروں سے جانچنے کی ضرورت ہے۔ تب معلوم ہوگا کہ انور سجاد اور انیس ناگی نے ناول کے فن کو کس اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا ہے۔

کشور ناہید اور ممتاز مفتی کے انٹرویو مسرت انگیز ہیں۔ کشور ناہید کی گفتگو کا ایک ٹکڑا بطور نمونۂ کلام درج کیا جاتا ہے۔

"ایک فقرہ! جس کے سننے سے مجھے اس عمر میں بھی کوفت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہائے آپ کتنی سمارٹ، کتنی ینگ لگ رہی ہیں، آپ اپنی عمر سے دس سال چھوٹی لگ رہی ہیں۔ میں اب یہ کہتی ہوں تو کہتی ہوں کہ مجھے اپنی عمر سے دس سال چھوٹا لگنے کا کوئی شوق نہیں ہے اور نہ بڑا لگنے کا مرض ہے۔ میری اپنی جو عمر ہے، وہ میں ہوں......"

ہم اس پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے، کیونکہ تبصرے کے بغیر بھی یہ اقتباس سمجھ میں آ جاتا ہے۔

ممتاز مفتی ماشاءاللہ اردو کے معمر ترین ادیب ہیں، لیکن اپنے انٹرویو میں وہ کشور ناہید سے بھی دس برس چھوٹے نظر آتے ہیں۔ انھیں جہاں اور جب موقع ملا ہے، احمد ندیم قاسمی کے خلاف دل کا غبار نکالا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے الزام لگایا ہے کہ ان کے ناول "علی پور کا ایلی" کو گلڈ کا انعام صرف اس لیے نہیں مل سکا کہ قاسمی صاحب اس انعام کے جج تھے۔ دوسری جگہ ادب میں گروہ بندی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے: "احمد ندیم قاسمی سب سے بڑا Pioneer تھا، جس نے گروہ بندی شروع کی۔"

تیس سال گزر چکے ہیں، لیکن مفتی صاحب کے دل سے گلڈ کے انعام کا غم نہیں گیا، حالانکہ اب تو خود گلڈ ہی گلدستۂ طاقِ نسیاں بن چکا ہے۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ مفتی صاحب نے گلڈ کے انعام کے حوالے سے قاسمی صاحب کو مطعون کیا ہو۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ وہ اپنی داستانِ غم سنا چکے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر قاسمی صاحب گلڈ کے انعام کی رقم اپنی گرہ

سے ادا کر دیں، تو مفتی صاحب ان کے خلاف اپنی مہم ختم کریں گے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ مفتی صاحب صرف انعام کی رقم پر اکتفا نہیں کریں گے، بلکہ تیس برسوں کا مرکب سود بھی طلب فرمائیں گے۔ ظاہر ہے قاسمی صاحب اتنی بڑی رقم ادا نہیں کر سکیں گے۔ لہٰذا سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ مفتی صاحب سے دست بدست درخواست کی جائے کہ وہ اپنی عمر کا نہ سہی، قاسمی صاحب کی عمر کا خیال کرتے ہوئے انھیں اب معاف کر دیں۔

مفتی صاحب کے انٹرویو کے آخری الفاظ بہت معنی خیز ہیں۔ فرماتے ہیں......

’’بے کار باتیں ہیں، ان میں سے ایسی کون سی بات ہے جس کے لیے آپ نے انٹرویو کیا۔ میں پہلے ہی آپ سے کہہ رہا تھا کہ میرے پاس ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کی خاطر آپ انٹرویو کا اہتمام کریں۔ پتہ نہیں میں کیا کیا بیکار باتیں کرتا رہا......‘‘

یہ محض انکسار ہے۔ مفتی صاحب کے انٹرویو میں کئی کام کی باتیں بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک موقع پر انھوں نے فرمایا، ’’میرے بیٹے نے مجھ سے کہا، بابا! آپ اب کہانیاں لکھنی بند کر دیں مجھے شرم آتی ہے۔‘‘ کہیں ایسا تو نہیں کہ بیٹے نے احمد ندیم قاسمی کی ایماء پر یہ بات کہی ہو۔ اگر یہ درست ہے تو ہم قاسمی صاحب سے عرض کریں گے کہ اتنی مخالفت بھی درست نہیں۔ آپ کی وجہ سے پہلے گلڈ کا انعام مفتی صاحب کے ہاتھ سے نکل گیا تھا، اب بیٹا بھی نکلتا نظر آ رہا ہے۔

اور اب آخر میں ایک ایسے انٹرویو کا ذکر، جو اس کتاب کی جان ہے۔ یہ انٹرویو افسانہ نگار، نقاد اور مترجم محمد عمر میمن کا ہے۔ میمن صاحب امریکہ کی وسکانسن یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ انتظار حسین اور عبداللہ حسین کی متعدد تخلیقات کو انگریزی میں منتقل کر چکے ہیں۔ عبداللہ حسین نے اپنے ناول ’’اداس نسلیں‘‘ میں قرۃ العین حیدر کی تحریروں کے بہت سے ٹکڑے بلا حوالہ شامل کر لیے ہیں۔ اس ادبی سرقے کے بارے میں محمد عمر میمن کو اظہار خیال کرنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے فرمایا......

’’میرے لیے اس بات کا ذرہ برابر فرق نہیں پڑتا کہ عبداللہ حسین نے قرۃ العین حیدر کے مضمون کے صفحے سرقہ کر لیے ہیں۔ اگر انھوں نے ایسا کیا بھی ہے تو یہ انھیں چھوٹا ادیب نہیں بنا دیتا۔‘‘

اس جواب سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ عبداللہ حسین کے بڑا ادیب بننے کی وجہ ہی یہ ہے

کہ انھوں نے قرۃ العین حیدر سے بصورت سرقہ استفادہ کیا ہے۔ محمد عمر میمن نے عبداللہ حسین کے دفاع میں یہ دلیل بھی پیش کی ہے۔

’’اگر عبداللہ حسین سے اس قسم کی کوئی حرکت سرزد ہوئی ہے تو وہ بہت بچکانہ حرکت ہے۔ اس سے زیادہ بچکانہ حرکت یہ ہے کہ اسے مسئلہ بنائے لے رہے ہیں...... اس سے قرۃ العین حیدر کا کچھ نہیں بگڑتا۔‘‘

یہ دلیل ایسی ہے کہ اگر کسی کے ہاں چوری ہو جائے تو اسے یہ کہہ کر تسلی دی جائے: ’’آپ کو اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے، اگر اس میں سے کچھ چوری ہو گیا ہے، تو اس سے آپ کا کچھ نہیں بگڑا، چور نے بچکانہ حرکت کی ہے، اسے معاف کر دیجیے......‘‘ لیکن اس تسلی سے اور جرم کو بچکانہ حرکت قرار دینے سے جرم کی سنگینی کم نہیں ہو جاتی۔

ایک طرف تو محمد عمر میمن اتنے کشادہ دل ہیں کہ چوری کو چوری نہیں سمجھتے اور دوسری طرف اتنے ’’تنگ دست‘‘ نظر آتے ہیں کہ دوسروں کے مال کو بھی اپنا ’’مال مسروقہ‘‘ تصور کر لیتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پر سرقے کا الزام لگایا ہے۔ فرماتے ہیں......

’’ان کا انتظار حسین پر جو مضمون ہے، اس کے شروع کے دو تین صفحوں کا تنقیدی لہجہ اور پورے کے پورے جملے بغیر واوین لائے یا میرا نام لیے، میرے ’’سویرا‘‘ والے مضمون سے لیے گئے ہیں۔‘‘

محمد عمر میمن نے اپنے جس مضمون کا حوالہ دیا ہے، وہ انتظار حسین کے بارے میں ہے اور ’’حافظے کی بازیافت‘‘ کے عنوان سے تقریباً چودہ برس پہلے رسالہ ’’سویرا‘‘ میں چھپا تھا۔ اس وقت یہ مضمون اور ڈاکٹر نارنگ کا مذکورہ مقالہ، دونوں ہمارے سامنے ہیں۔ ہمیں تو ڈاکٹر نارنگ کے مقالے میں محمد عمر میمن کے مضمون کا کوئی جملہ نظر نہیں آیا، البتہ کچھ الفاظ مشترک ہیں اور یہ روزمرہ کے استعمال کے الفاظ ہیں، جن پر کسی شخص کی اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔ رہا تنقیدی لہجہ تو اس کے چرانے کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ اس قسم کی کوئی چیز خود محمد عمر میمن کے مضمون میں موجود نہیں ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ محمد عمر میمن کا الزام درست ہے، تو پھر یہ

دلچسپ صورتِ حال سامنے آتی ہے کہ ایک طرف تو موصوف عبداللہ حسین کے حوالے سے سرقے کو معیوب نہیں سمجھتے اور دوسری طرف سرقے کو برا کام سمجھتے ہوئے ڈاکٹر نارنگ کو ''مجرم'' قرار دیتے ہیں۔ میمن صاحب کی اس عجیب و غریب منطق کا مطلب یہ ہے کہ اگر سرقے کی واردات کسی صاحبِ ثروت کے ہاں ہو، تو قابلِ معافی ہے، اور اگر کسی مفلس کے ہاں ہو تو ناقابلِ معافی..... صاحبِ ثروت کا کچھ نہیں بگڑتا، مفلس کا آٹا گیلا ہو جاتا ہے۔ اگر ہمارا یہ کالم ڈاکٹر نارنگ کی نظر سے گزرے، تو ہم ان سے گزارش کریں گے کہ وہ آئندہ احتیاط سے کام لیں، واردات سے پہلے صاحبِ خانہ کی حیثیت کا خیال ضرور رکھا کریں۔

علمی اداروں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا ایک خطرناک رویہ ہے

ہمارے پڑھنے والے ازراہِ کرم ہمیں خط لکھتے رہتے ہیں۔ ان کے خطوں سے جہاں ہمیں اپنی بہت سی غلطیوں کو تصحیح کا موقع ملتا ہے، وہیں آئندہ بھی غلطیاں کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ بعض لوگ دوسروں کی غلطیوں کی تاک میں رہتے ہیں تو پھر انھیں مصروف رکھنے کے لیے غلطیاں کرتے رہنا ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے سب ہی مراسلہ نگار غلطیاں نہیں پکڑتے، بعض غلطیوں پر اکساتے بھی ہیں۔ خصوصاً وہ شعرائے کرام جو اپنے مجموعے بھیج کر ان پر کالم لکھنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ ایسے کرم فرماؤں سے ہم عموماً معذرت کر لیتے ہیں کیونکہ غلطی در غلطی کا مضمون باندھنے کی ہمیں عادت نہیں ہے۔ مجموعۂ کلام چھپوا کر جب ایک غلطی کر لی گئی تو اس پر کالم لکھ کر دوسری غلطی کیوں کی جائے۔

استاد اخگر مرادآبادی جب بھی ہمارے نام کوئی خط لکھتے ہیں تو وہ محکمۂ ڈاک والوں کے لیے ایک بیرنگ اور ہمارے خیال میں بے رنگ ہوتا ہے۔ استادِ محترم ہر خط میں ہماری زبان کی کم از کم پانچ چھ غلطیوں کی نشاندہی ضرور کرتے ہیں اور لفافے پر ٹکٹ چسپاں کیے بغیر پوسٹ کر دیتے ہیں تاکہ ڈاک کے ہاتھ ہمیں غلطیوں کی سزا بھی مل جائے۔ ایک مرتبہ تو انھوں نے تلفظ کی بھی کچھ غلطیاں پکڑ لیں۔ ملاقات پر ہم نے عرض کیا، ''آپ ہمارے چھپے ہوئے کالم کو پڑھ کر تلفظ کی غلطیاں کیسے پکڑیں؟'' انھوں نے فرمایا، ''جو شخص لکھنے میں غلطیاں کر سکتا ہے، وہ بولنے میں بھی ضرور کرتا ہے۔ اسی قیاس پر آپ کے تلفظ کی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مزید یہ کہ آپ کے

بعض جملوں میں اس وقت تک روانی پیدا نہیں ہوتی جب تک ان جملوں کے دو تین لفظوں کا تلفظ تبدیل نہ کیا جائے۔''

کچھ خط ایسے بھی موصول ہوتے ہیں جن میں بعض اہم اور سنجیدہ مسائل پر اظہار خیال کی فرمائش کی جاتی ہے۔ حالانکہ اہم اور سنجیدہ مسائل پر لکھنے میں ہی نہیں، ان مسائل کے بارے میں کچھ پڑھنے میں بھی ہمیں تکلف ہوتا ہے۔ ادب اور ادبی مسائل پر لکھتے رہنے کی وجہ سے ہم نے کبھی کسی اہم اور سنجیدہ مسئلے کو در خور اعتنا نہیں سمجھا۔ بہر حال اس مرتبہ ہم اپنی روش کے خلاف دو ایسے خط شائع کر رہے ہیں جو توجہ طلب ہیں۔

پہلا خط کراچی کے ایک بزرگ اور معروف ادیب کا ہے۔..... وہ اپنا نام بوجوہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ وہ لکھتے ہیں......

''مشہور شاعر محسن بھوپالی کے حلق کا ٹیومر کا آپریشن ۱۹۸۸ء کے وسط میں لندن میں ہوا تھا۔ سال بھر بعد انھیں مزید علاج اور چیک اپ کے لیے دوبارہ لندن جانا تھا۔ اس سلسلے میں اکادمی ادبیات کی سفارش پر وفاقی محکمۂ صحت نے جولائی ۱۹۸۹ء میں ایک میڈیکل بورڈ تشکیل دیا تھا، جس کی رپورٹ کی بنا پر محکمۂ مذکور نے فیصلہ کیا کہ علاج کی غرض سے محسن بھوپالی کا لندن جانا ضروری ہے۔ اگست ۱۹۸۹ء میں وفاقی محکمۂ صحت نے مجاز اتھارٹی کی منظوری سے اکادمی ادبیات کو ہدایت کی کہ وہ محسن بھوپالی کے علاج اور اخراجاتِ سفر کے لیے رقم فراہم کرے۔ اکادمی ادبیات نے ساڑھے تین ماہ تک اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کی۔ بار بار کی یاد دہانیوں کے بعد اکادمی نے کوئی مثبت قدم اٹھانے کی بجائے کام میں مزید تاخیر کی خاطر ۳۰ نومبر ۱۹۸۹ء کو محکمۂ تعمیرات حکومت سندھ کے سیکرٹری کے نام ایک خط لکھا، جس میں کہا گیا تھا کہ محسن بھوپالی چونکہ حکومت سندھ کے ملازم ہیں، اس لیے ان کے علاج کی ذمہ داری حکومت سندھ کی ہے۔ اکادمی کی طرف سے یہ خط اکادمی کے چیئرمین احمد فراز کے دستخط سے جاری ہوا تھا۔

اکادمی ادبیات کے پاس ادیبوں کے علاج کے لیے ایک بڑی رقم موجود ہے، اس کے باوجود اکادمی کا رقم کی فراہمی کے لیے حکومت سندھ کو خط لکھنا ایک عجیب سی بات ہے۔ اس مسئلے کا انسانی پہلو یہ ہے کہ محسن بھوپالی کا مرض نہایت خطرناک ہے، اس کے علاج میں تاخیر کسی طرح بھی

مناسب نہیں۔ یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ علاج کے اخراجات کون ادا کرے، اصل اہمیت فوری علاج کی ہے۔ اکادمی نے تو ساڑھے تین ماہ تک خاموشی اختیار کی اور پھر وفاقی حکومت کی واضح ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے حکومت سندھ کو خط لکھا جس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اکادمی کو ایک اہم شاعر کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ایسی صورت میں اکادمی کے وجود کا جواز کیا ہے۔''

اس خط کے ساتھ متعدد دستاویزات کے عکس بھی ہیں جن سے خط کے مطالب کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ بات واقعی بہت افسوسناک ہے کہ محسن بھوپالی، جو ہمارا قومی اثاثہ ہیں، ان کے ساتھ بے رحمانہ اور مجرمانہ سلوک ہو رہا ہے۔ محسن صاحب کینسر کے مریض ہیں اور ان کی بیماری کی نوعیت ایسی ہے کہ علاج میں ذرا سے بھی تاخیر مریض کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ حیرت ہے کہ اکادمی ادبیات نے اس سلسلے میں اولاً کوئی کارروائی نہیں کی اور کی بھی تو معاملے کو مزید الجھانے کے لیے۔ گویا

اس دل سے جو بار آیا جفا کی
اس دل کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اکادمی ادبیات کی طرف سے حکومت سندھ کو جو خط لکھا گیا ہے، اس پر اکادمی کے چیئرمین احمد فراز کے دستخط ہیں ہمیں یقین نہیں آتا کہ گیارہ برس تک "مزاحمتی" ادب تخلیق کرنے والے احمد فراز اپنے ہی قبیلے کے ایک ممتاز فرد اور "مزاحمتی" ادب تخلیق کرنے والے شاعر کے علاج کے سلسلے میں "مزاحمتی" رویہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ اس موقع پر ہمیں اکادمی کے سابق چیئرمین پریشان خٹک بہت یاد آ رہے ہیں۔ ان کے زمانے میں جب کسی ادیب کے علاج معالجے کا معاملہ درپیش ہوتا تھا تو وہ سب کام چھوڑ کر اس طرف توجہ کرتے تھے۔ محسن بھوپالی کا ۱۹۸۸ء میں جو آپریشن ہوا تھا، اس کا پریشان خٹک نے ہی انتظام کیا تھا۔ خٹک صاحب کا اصول یہ تھا کہ ایک ادیب کی جان بہت قیمتی ہوتی ہے، اس لیے ضابطے کی یا بے ضابطگی کی کارروائیوں میں وقت صرف کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔ خٹک صاحب کے اس قسم کے "عیبوں" کی وجہ سے موجودہ حکومت نے ادبیات کی سربراہی سے انھیں سبکدوش کر کے احمد فراز کو "گراں بار" کیا تھا مگر......
ہم احمد فراز کے بارے میں مزید کچھ نہیں کہیں گے کیونکہ آج کل وہ خود زیر عتاب ہیں اور وزیر بے

تعلیم غلام مصطفیٰ شاہ کے شاہانہ احکامات کے تحت اکادمی کی سربراہی سے برطرف کیے جا چکے ہیں۔ اس سلسلے میں محسن بھوپالی کا کردار یہ ہے کہ انھوں نے احمد فراز کی برطرفی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ ہم بھی محسن بھوپالی کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے احمد فراز کی برطرفی کی مذمت کرتے ہیں۔ اس معاملے میں ہم غلام مصطفیٰ شاہ کو احتجاجی مراسلہ لکھنے والے تھے کہ معلوم ہوا موصوف اپنے علاج کے سلسلے میں سرکاری خرچ پر امریکہ روانہ ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سیاسی سودے بازیوں کے نتیجے میں وزیر بننے والے کی جان ایک شاعر کی جان سے زیادہ قیمتی ہے۔ ہم شاہ صاحب کی صحت و سلامتی کی دعا کرتے ہوئے امید رکھتے ہیں کہ ان کی غیر حاضری میں اکادمی ادبیات کو نیکی کا ایک آدھ کام کرنے کی فرصت مل جائے گی۔ یعنی محسن بھوپالی کو علاج کے لیے بیرون ملک بھجوا دیا جائے گا۔

دوسرا خط کراچی سے تسنیم ضیائی صاحب نے لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں......

''حکومت نے ادب کے نام پر بے ادبی کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، اس کی وجہ سے ملک کے ادیبوں میں سخت بے چینی پائی جاتی ہے۔ اب تک لاکھوں روپے کے ادبی انعامات ایسے لوگوں میں تقسیم کیے جا چکے ہیں جن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ حکومت جس پسندیدہ شخص کو مالی فائدہ پہنچانا چاہتی ہے، اس کے لیے انعام کا اعلان کر دیتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ انعام شخص مذکور کی ادبی خدمات کے اعتراف میں دیا جا رہا ہے۔ ادب کے نام پر قومی خزانے کو لٹانا ادب اور قوم کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔

علمی اداروں میں بھی ایسے لوگوں کا تقرر کیا جا رہا ہے جن میں ان اداروں کے مقاصد کو پورا کرنے کی اہلیت و صلاحیت نہیں ہے۔ جغرافیے کی ایک سند یافتہ خاتون کو ان کی سیاسی خدمات کے صلے میں تاریخ سے متعلق ایک قومی ادارے کا سربراہ بنا دیا گیا ہے۔ داغ دہلوی کے رنگ میں شعر کہنے والے ایک شاعر کی بیگم کی سیاسی خدمات کے صلے میں، ان کے شوہر کو اقبال اکیڈیمی کی سربراہی سونپ دی گئی ہے۔ نثری نظمیں لکھنے والی ایک شاعرہ کو اردو سائنس بورڈ پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ یہ تقرریاں خالصتاً سیاسی ہیں۔ علمی اداروں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا ایک خطرناک رویہ ہے۔ اس سے علم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔''

محترم مراسلہ نگار نے جن باتوں پر تشویش کا اظہار کیا ہے، ہمارے نزدیک وہ دلی اطمینان

کا باعث ہیں۔ جس ملک میں ''جمہوریت'' کے نام پر کروڑوں روپے صرف کر کے ''عوامی نمائندوں'' کے ضمیر خریدے جاتے ہیں، وہاں چند لاکھ روپے ادب کے نام پر ضائع کر دینے میں کوئی قباحت نہیں۔ اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ ہماری حکومت ادب کی اہمیت سے واقف ہے اور وہ اس کے نام پر خرید و فروخت کا بازار گرم کر سکتی ہے۔

علمی اداروں کے معاملے میں بھی حکومت کا رویہ حقیقت پسندانہ ہے۔ تاریخ سے متعلق ادارے میں جغرافیہ داں خاتون کے تقرر پر اعتراض نامناسب ہے۔ تاریخ اور جغرافیے کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ جغرافیہ کے بغیر تاریخ وجود میں نہیں آ سکتی۔ موجودہ برسر اقتدار پارٹی ملک کے جغرافیے میں کاٹ چھانٹ کر چکی ہے، اب وہ تاریخ بھی از سر نو لکھوانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ کام وہی لوگ بہتر طور پر کر سکتے ہیں جو جغرافیے میں کاٹ چھانٹ کے اسباب سے واقف ہوں اور اس کا جواز پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس لیے ہماری رائے میں تاریخ کے ادارے کی سربراہی پر جغرافیہ داں خاتون کا تقرر تاریخ کے تقاضوں کے عین مطابق ہے......

اقبال اکیڈیمی کی سربراہی اگر کسی ایسے شاعر کو سونپی گئی ہے جو داغ کے رنگ میں شعر کہتا ہے تو یہ حکومت کی دور اندیشی کا ثبوت ہے۔ تاریخ ادب میں داغ کا مرتبہ بہت بلند ہے، وہ تو اپنے رنگ کے بہترین غزل گو ہی نہیں علامہ اقبال کے استاد بھی تھے۔ اس لیے اگر اقبال اکیڈیمی کا سربراہ ایک ایسے شاعر کو بنایا گیا ہے جو داغ کے رنگ میں غزلیں کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت علامہ اقبال کی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کے استاد کی خدمات کی بھی معترف ہے۔ اقبال کی خدمات کا اعتراف بہت ہو چکا، بہتر ہوگا کہ اب صرف داغ کی خدمات کا اعتراف کیا جائے اور اقبال اکیڈیمی کا نام تبدیل کر کے داغ اکیڈیمی رکھ دیا جائے تاکہ اقبال کا نام داغ دار ہونے سے محفوظ ہو جائے۔

ایک زمانے میں داغ کی غزلیں بہت مقبول تھیں۔ گوہر جان عرف چھپن چھری جیسی گانے والیوں کی وجہ سے کلام داغ بچے بچے کی زبان پر تھا۔ اقبال اکیڈیمی جب قانونی طور پر داغ اکیڈیمی بن جائے تو اسے چاہیے کہ کلام داغ کو دوبارہ مقبول بنانے کے لیے ٹھوس اقدامات کرے۔ مثلاً موجودہ دور کے ممتاز گلوکاروں کو اکیڈیمی میں بطور ریسرچ اسکالر ملازم رکھا جا سکتا ہے۔ جو محاورات داغ اور زبان پر تحقیق کر سکیں۔ کلام داغ کی تدوین نو کا کام سازندوں وغیرہ

سے لیا جا سکتا ہے۔ ادارے کے سربراہ سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ دفتری اوقات میں کلامِ داغ کی شرح اور فارغ اوقات میں کلامِ داغ کی پیروڈی لکھا کریں۔

فاضل مراسلہ نگار کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ نثری نظم لکھنے والی ایک شاعرہ کو اُردو سائنس بورڈ کا سربراہ کیوں بنایا گیا ہے۔ شاید مراسلہ نگار کو اس کا علم نہیں کہ اُردو سائنس بورڈ کا تعلق اُردو سے ہے نہ سائنس سے۔ اس لیے ہر وہ شخص اس کا سربراہ ہو سکتا ہے جسے اُردو یا سائنس سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ جب اشفاق احمد اس بورڈ کے ڈائریکٹر تھے تو کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ اب کشور ناہید ڈائریکٹر ہوئی ہیں تو ہر شخص اعتراض کر رہا ہے۔ کشور ناہید بڑی باصلاحیت خاتون ہیں، اُردو سائنس بورڈ کیا چیز ہے، وہ تو اس کی مستحق ہیں کہ انھیں اٹامک انرجی کمیشن کا سربراہ بنا دیا جائے۔ موجودہ حکومت برسرِ اقتدار رہی تو انشاء اللہ ہم انھیں اسی عہدے پر فائز دیکھ لیں گے۔

ہماری ہر دل عزیز حکومت کسی فرد کی اہلیت و صلاحیت کا اندازہ کاغذی ڈگریوں سے نہیں کرتی بلکہ وہ یہ دیکھتی ہے کہ عملی طور پر کوئی شخص کہاں تک حکومت کے کام آ سکتا ہے۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ بعض نامور ادیبوں کو ان کی سیاسی خدمات کے پیشِ نظر ایسے اداروں سے منسلک کر دیا جائے جہاں انھیں اپنی صلاحیتوں کو بہتر طور پر استعمال کرنے کا موقع مل سکے۔ مثلاً احمد فراز کو نشتر میڈیکل کالج کا پرنسپل، ڈاکٹر انور سجاد کو زرعی یونیورسٹی کا وائس چانسلر اور حبیب جالب کو اسٹیٹ بینک کا گورنر بنا دیا جائے تو ان اداروں کی کارکردگی بہت بہتر ہو سکتی ہے۔

اُردو میں انٹرویو کی روایت کا ارتقا

(۱)

ایک زمانہ تھا کہ ادیبوں کی شہرت کا انحصار ان کی تخلیقات پر ہوتا تھا، ادبی دنیا میں اس کی اہمیت ہوتی تھی کہ کس نے کتنا لکھا ہے اور کیسا لکھا ہے۔ اب یہ حال ہے کہ کسی ادیب کو اس وقت تک ادیب نہیں سمجھا جاتا، جب تک کہ اس کے درجن دو درجن انٹرویو نہ شائع ہو جائیں۔ انٹرویو، ادبی تخلیقات کا بدل بلکہ نعم البدل بن چکے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب ایسے ادیبوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے، جن کے نام سے سوائے انٹرویو کے اور کوئی چیز نہیں چھپی۔ معاف کیجیے گا یہ نصف صداقت ہے۔ ایک اور چیز بھی ادیب کے نام سے چھپتی ہے اور وہ اس کی تصویر۔ ہر انٹرویو کے ساتھ درجن بھر تصویریں ضرور ہوتی ہیں، جو اگر انٹرویو کے ساتھ نہ ہوتیں تو یہ گمان گزرتا کہ پولیس کے ریکارڈ سے نکال کر چھاپی گئی ہیں۔

بہر حال یہ طے ہے کہ اس وقت اُردو کی مقبول ترین "صنف" انٹرویو ہے اور وہ دن دور نہیں جب شاعری، افسانے اور ڈرامے وغیرہ کا چراغ گل ہو جائے گا اور لکھنے والے اپنی تخلیقات کے مجموعے چھپوانے کی بجائے انٹرویوز کے مجموعے چھپوایا کریں گے۔ اور پھر ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ ہماری یونیورسٹیوں میں "اُردو میں انٹرویو کی روایت کا ارتقا" جیسے موضوعات پر تحقیق ہوگی اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں اپنوں اپنوں کو دی جانے لگیں گی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بحث بھی چھڑ جائے گی کہ اُردو میں انٹرویو کا بانی بلکہ موجد کون ہے۔ جس طرح انشائیے کے بانی اور موجد پر بحثیں چل رہی ہیں، اسی طرح یہ معاملہ بھی قلم سے دست و پا تک پہنچ جائے گا اور ایک فساد کے بانی کے دماغ میں دوسرا فساد شروع ہو جائے گا۔ اس موقع مجادلے سے بچنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آج

ہی یہ فیصلہ کرلیا جائے کہ اُردو کے ادیبوں کے انٹرویوز کا سب سے پہلا مجموعہ کس نے شائع کیا تھا۔

ہم اگرچہ محقق نہیں ہیں، لیکن استاد لاغر مرادآبادی کی نیازمندی اور تضیع اوقات کے شغل کی وجہ سے ہر معاملے کو تحقیقی نظر سے دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ہماری تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ انٹرویوز کا سب سے پہلا مجموعہ ندا فاضلی نے ۱۹۷۱ء میں "ملاقاتیں" کے نام سے بمبئی سے شائع کیا تھا۔ یہ وہی ندا فاضلی ہیں، جن کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی پردہ کھینچ دیا رات ہوگئی

اس شعر کے ہیرو کی طرح ندا فاضلی بھی اپنی کتاب "ملاقاتیں" بازار میں لیے کھڑے رہے، مگر گاہکوں نے توجہ نہ کی۔ حالانکہ یہ ایک نہایت اہم کتاب ہے، جس میں ندا فاضلی نے فراق گورکھپوری، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی اور خواجہ احمد عباس جیسے ادیبوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بلکہ اکثر موقعوں پر آنکھیں نکال کر گفتگو کی ہے۔ یہ دلچسپ کتاب ندا فاضلی کے جرأت مندانہ سوالوں اور انٹرویو دینے والوں کے معذرت خواہانہ جوابوں کا عبرت خیز مرقع ہے۔

اس ضمن میں جو کتاب سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے، وہ طاہر مسعود کی "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" ہے۔ طاہر مسعود نے ادب کے ایک مخلص اور باخبر طالب علم کی طرح اپنے کچھ سوالوں کے جواب حاصل کرنے کے لیے ادیبوں سے تبادلۂ خیال کیا۔ انھوں نے محض ایک سائل کی حیثیت اختیار نہیں کی، بلکہ اپنے مقابل سے برابر کی سطح پر بات چیت کے ذریعہ مسائل کی گرہیں کھولی ہیں۔ ان کی یہ کتاب خاصی مقبول ہوئی اور پھر اس قسم کی کتابوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس نوعیت کی تازہ ترین کتاب حسن رضوی کی "گفت و شنید" ہے اور یہی آج کے کالم کا موضوع ہے اور اسی کی خاطر یہ تمہید لکھنے کی مشقت ہم نے کھینچی ہے۔ حسن رضوی نے ہمارے لیے اتنی ضخیم کتاب لکھی ہے تو کیا ہم اس کے شکریہ میں ایک مختصر تمہید بھی نہیں لکھیں!

حسن رضوی باکمال آدمی ہیں۔ ایک عدد پنجابی مجموعۂ کلام کے مصنف ہیں اور اُردو کے مشاعرے لوٹتے ہیں۔ شاعری کو وہ دور مار کی توپ کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اندرونِ ملک سے زیادہ بیرونِ ملک کے مشاعروں میں نظر آتے ہیں۔ اس وسیلے سے وہ پندرہ ملکوں کی سیاحت کر چکے ہیں۔ گویا اُردو کے گشتی سفیر ہیں۔ جہاں جاتے ہیں اُردو کا نام روشن کرتے ہیں اور جہاں اُردو کا نام پہلے ہی روشن ہوتا ہے وہاں اپنے نام کا چراغ جلا آتے ہیں۔ انھوں نے پندرہ ملکوں کی سیاحت کرنے کے باوجود سفرنامہ ایک ہی ملک کا لکھا ہے جو "دیکھا ہندوستان" کے نام سے چھپ کر مقبول ہو چکا ہے۔ یہ سفرنامہ اتنا دلچسپ ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد جی چاہتا ہے کہ حسن رضوی سے پوچھا جائے کہ حضرت باقی چودہ ملکوں سے کیا قصور ہوا تھا جو آپ نے سفرنامے نہیں لکھے۔ لیکن ہم نے یہ بات اس خوف سے نہیں پوچھی کہ موصوف جواباً چودہ سفرنامے لکھ ہی نہ ڈالیں۔

حسن رضوی "جنگ" لاہور کے ادبی صفحے کے مدیر ہیں۔ جس طرح وہ مشاعروں میں شرکت کر کے اپنا نام روشن کرتے ہیں، اسی طرح ادبی صفحے پر وہ دوسروں کے نام اچھالتے ہیں۔ اس صفحے کے لیے انھوں نے بہت سے لوگوں کے انٹرویو لیے، جن میں سے کچھ پہلے ہی سے ادیب تھے اور کچھ انٹرویو کی اشاعت کے بعد بطور ادیب مشہور ہو گئے۔ "گفت و شنید" انھی انٹرویوز کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے پر اگر ہمیں صرف ایک لفظ میں تبصرہ کرنے کے لیے کہا جائے، تو وہ سوائے "مزیدار" کے کوئی اور لفظ نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ یہ ایک مزیدار کتاب ہے، جسے پڑھ کر طبیعت شاد ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تحریروں کے ذریعہ رُلانے والے ادیب اپنی باتوں سے ہنسا بھی سکتے ہیں۔

حسن رضوی جس کا انٹرویو لیتے ہیں، اس سے رسمی سوالوں کے رسمی جواب حاصل نہیں کرتے، بلکہ اسے مجبور کرتے ہیں کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے، وہ اس کی زبان پر آجائے۔ اسی لیے اس کتاب کے ہر صفحہ پر ادیب سے زیادہ دل کی باتیں نظر آتی ہیں۔ یعنی ہر ادیب نے دوسرے ادیبوں کے خلاف دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب کاغذ پر نہیں، اوراقِ دل پر چھپی ہے۔

اس کتاب میں ۳۲ ادیبوں کے انٹرویو ہیں، لیکن کتاب کا ہیرو ایک ہی ہے اور وہ ہیں جناب انیس ناگی۔ انھوں نے دوسروں کے بارے میں علی الاعلان سچ بولا ہے اور دوسروں نے بھی ان کے بارے میں سچ بولنے میں کوتاہی نہیں کی۔ انیس ناگی جدید اُردو ادب کا بہت اہم نام ہیں۔ ان کا کام اہم ہے یا نہیں، اس بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ جس تیز رفتاری سے

لکھتے ہیں، ہم اتنی تیز رفتاری سے پڑھ نہیں پاتے۔ سچی بات یہ ہے کہ ان کی ایک آدھ کتاب کے مطالعے کے بعد ہی سے ہماری مطالعے کی عادت ختم ہو گئی اور بے خوابی کی عادت شروع ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب تک ہم مستنصر حسین تارڑ کی کسی کتاب کا ایک باب نہ پڑھ لیں، نیند نہیں آتی اور اگر کتاب دلچسپ ہو تو باب کے ختم ہونے سے پہلے ہی نیند آ جاتی ہے۔ گویا ہم انیس ناگی کی وجہ سے تارڑ کے قاری بنے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ تارڑ کے بارے میں خود انیس ناگی کی رائے یہ ہے......

"میں نے تارڑ صاحب کا ایک سفر نامہ پڑھا تھا۔ وہ تو بالکل چالو قسم کا تھا، جو انگلستان اور یورپ کے بارے میں تھا۔ میں فرانس میں رہا ہوں۔ انھوں نے بہت سی جگہوں کے نام ہی غلط لکھے ہیں۔ پیرس کی تفصیلات بھی غلط ہیں۔ مجھے یہ بھی گمان گزرا کہ ہو سکتا ہے تارڑ صاحب نے ان علاقوں کا دورہ بھی نہ کیا ہو۔ لیکن انھوں نے داستان کے طور پر علاقوں کا حوالہ بنایا ہے۔"
(ص ۱۳۹)

زیر نظر کتاب میں تارڑ صاحب کا انٹرویو بھی ہے۔ انھوں نے انیس ناگی سے اپنا حساب کتاب یوں برابر کیا ہے......

"انیس ناگی کو سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے، وہ ایک متفنی اور متکبر شخص ہیں۔ میں نے انھیں کسی کے بارے میں کلمۂ خیر کہتے نہیں سنا۔ شاید یہ اس بے ربط نثر کا اثر ہے، جو وہ لکھتے ہیں۔"
(ص ۳۴۷)

لفظ متفنی اگر "تفنن" سے مشتق ہے تو خیر، ورنہ تارڑ صاحب کو اتنا سخت لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جس شخص نے درجنوں کتابیں لکھ کر اور خود ہی شائع کر کے ادب کی بے لوث خدمت کی ہو، اس کو متفنی کہنا، ادبی بے ادبی ہے۔ تارڑ صاحب! آپ حسد کی وجہ سے انیس ناگی کو کتابیں لکھنے کی داد نہیں دیتے، نہ دیں، کئی کتابیں چھاپنے کی داد تو دیجیے۔ آپ نے اپنے انٹرویو میں کہا ہے کہ آپ قلم سے پیسہ کماتے ہیں۔ اگر کوئی اپنی کتابیں چھاپ کر قلم کے ذریعے پیسہ ضائع کرتا ہے، تو اس کی ہمت کی داد دینی چاہیے۔ ادب کے نام پر جیسے پیسہ کمانے والے بہت ہیں، لٹانے والا ایک ہی ہے۔ ہمیں اس کا احترام کرنا چاہیے۔ بلکہ اس پیسے کا بھی احترام کرنا چاہیے، جو ایک ہاتھ سے نکل کر بہت سے ہاتھوں میں پہنچ جاتا ہے۔ یعنی پریس والوں، جلد سازوں اور کا

ہوں وغیرہ میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

تارڑ صاحب کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ انیس ناگی متکبر ہیں۔ اگر وہ متکبر ہوتے تو کسی ادیب کا نام زبان پر نہ لاتے۔ بلکہ حسن رضوی کو بھی منع کر دیتے کہ میرے سامنے کسی کا نام نہ لو۔ اس کے برعکس انھوں نے نہایت فراخ دلی سے دوسرے ادیبوں کو اہمیت دی ہے۔ انھوں نے میر تقی میر کو از راہ کرم دوسرے درجے کا شاعر کہا ہے، حالانکہ وہ انھیں تیسرے اور چوتھے درجے کا شاعر بھی کہہ سکتے تھے۔ پریم چند، کرشن چندر اور فیض احمد فیض جیسے ادیبوں کے لیے "اونچی دکان پھیکا پکوان" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، حالانکہ وہ ان کی اونچی دکان کو نیچی دکان بھی کہہ سکتے تھے۔ جو دوسرے ادیبوں کے لیے اس درجہ ہمدردانہ جذبات رکھتا ہو، اسے متکبر کہنا حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔

تارڑ صاحب کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ انیس ناگی کسی کے بارے میں کلمۂ خیر نہیں کہتے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، زیر نظر کتاب میں شامل انٹرویو ہی میں انہوں نے بہت سے ادیبوں کے بارے میں کلمات خیر کہے ہیں۔ ان میں سے چند بطور نمونہ کلام پیش کیے جاتے ہیں۔

علی سردار جعفری: "...... بالکل پھکڑ ادیب ہیں ...... ان کی شاعری بے جان، پھسپھسی اور نعروں سے بھری ہوئی ہے۔" (ص ۱۳۱)

عبداللہ حسین: "...... اتنی ڈھیلی زبان لکھتا ہے کہ اگر ایک مرکب جملہ آ جائے تو اس سے سنبھلتا نہیں ...... وہ بیرون ملک رہتے ہیں اور ان کے دوستوں کا حلقہ ان کی تشہیر میں مگن رہتا ہے۔" (ص ۱۳۷)

بانو قدسیہ: "...... کمرشل رائٹر ہیں، ان کا تو ادب میں نام نہ لیجیے۔" (ص ۱۳۷)

شہرت بخاری: "...... اس کی اردو اتنی ڈھیلی ہے کہ جملے ان کے قابو میں نہیں آتے۔"
(ص ۱۳۹)

امجد اسلام امجد اور پروین شاکر...... "(اکادمی ادبیات کی) انعامی رقم کن کو ملتی ہے؟ امجد اسلام امجد کو، جس کا شعری مقام اور کردار ہمارے سامنے ہے۔ پروین شاکر کو، جو دوسرے درجے کی اول کو شاعرہ ہے۔" (ص ۱۳۵)

کشور ناہید: "...... کیلپڑی کیلپڑی کا شور ہے ...... انھوں نے جس طرح زندگی شروع کی، وہ

ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، جس طرح انھوں نے اپنا ادبی کیریئر شروع کیا، وہ بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ابتدا میں یہ خاتون صوفی تبسم اور احمد فراز کے ذریعے ادب میں آنے کی کوشش کرتی رہی۔ یہ ساری عمر غزل لکھتی رہی اور غزل میں بات نہ بنا سکی اور نئی شاعری کے بد ترین مخالفوں میں شامل تھیں...... انھوں نے چند (نثری) نظمیں لکھ کر شور مچایا کہ میں نثری شاعری کی موجد ہوں۔ یہ تو ان خاتون کا رویہ ہے، جن کی شاعری بہت کمزور ہے......" (ص ۱۳۲)

کلمۂ خیر کہنے کے معاملے میں انیس ناگی نے اپنے آپ سے بھی رعایت نہیں کی۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے اختلاف رائے رکھنے والوں ادیبوں" کی صفوں کو درہم برہم کیا، ان کو بے عزت کیا اور ان کی پگڑیاں اچھالیں۔" (ص ۱۳۳) شاید اس واقعے کے بعد ہی سے لاہور کے ادیبوں نے پگڑی کا استعمال ترک کر دیا تھا۔

تارڑ صاحب نے اپنے بیان کے آخر میں انیس ناگی کی نثر کو بے ربط کہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کو صاحب فکر ادیبوں کی نثر پڑھنے کا اتفاق کم ہوا ہے اور وہ ساری عمر اپنا ہی لکھا پڑھتے رہے ہیں۔ انیس ناگی ہما شما کے لیے نہیں لکھتے، ان کے پیش نظر ایسا قاری ہوتا ہے، جس کی ذہنی سطح بلند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب عام آدمی ان کی تحریر پڑھتا ہے تو وہ اسے متوازن معلوم نہیں ہوتی۔ بے ربطی دراصل پڑھنے والے کے اندر ہوتی ہے، جسے وہ انیس ناگی کی نثر سے منسوب کر دیتا ہے۔

تارڑ صاحب کے علاوہ بعض دوسرے ادیبوں کے انٹرویوز میں بھی انیس ناگی کا ذکر باندازِ دیگر ملتا ہے۔ مثلاً حسن رضوی نے جاوید شاہین سے پوچھا کہ انیس ناگی کو فیض کی شاعری میں کوئی تجربہ کیوں نظر نہیں آتا۔ جاوید شاہین نے جواب دیا:

"دراصل انیس ناگی کا مسئلہ یہ ہے کہ اسے سمجھ نہیں آرہی کہ اس نے ادب میں کرنا کیا ہے۔ وہ ہر راہرو کے ساتھ تھوڑی دور تک چلتا ہے اور پھر بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے۔ وہ اپنی منزل کا تعین نہیں کر پایا۔ ناکامی کے احساس نے اس کے اندر شدید جھنجھلاہٹ اور غصہ پیدا کر دیا ہے۔ وہ ہر وقت ایسی بات کہنے کے موڈ میں رہتا ہے، جو دوسرے کے اندر شدید ردعمل پیدا کرے اور اسے بولنے پر مجبور کرے۔ اور اس چیز کو انیس ناگی اپنی کامیابی سمجھتا ہے۔ فیض کے متعلق اس کا مذکورہ بیان بھی اس کے احساس کمتری کی پیداوار ہے۔ اگر اسے فیض کے ہاں کوئی بڑا تجربہ نظر نہیں

آتا تو یہ قصور فیض کا نہیں، اس کی اپنی بینائی کا ہے۔" (ص ۳۰۱)

جاوید شاہین کی باتوں کو ہم اس لائق نہیں سمجھتے کہ انھیں رد کیا جائے۔ ان کی شاعری کی طرح ان باتوں کو بھی زمانہ رد کر دے گا۔ زمانے کو فرصت نہ ملی تو انیس ناگی خود ہی مناسب قدم اٹھائیں گے۔

انیس ناگی کے انٹرویو میں بے شمار سوالوں کے دلچسپ جواب ملتے ہیں۔ کاش یہ سب کچھ ہم نقل کر سکتے۔ نمونے کے طور پر صرف ایک سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

حسن رضوی: کبھی آپ نے پنجابی زبان میں ادب تخلیق کیا ہے؟

انیس ناگی: ایک زمانے میں لکھا تھا تو میرے پیچھے پولیس لگ گئی تھی، اس لیے پنجابی میں لکھنا چھوڑ دیا......

انیس ناگی نے بہت اچھا کیا کہ ہمیشہ اردو ہی میں لکھا۔ اردو میں لکھنے کا ایک زبردست فائدہ یہ ہے کہ پولیس تو ایک طرف، پڑھنے والے بھی پیچھا نہیں کرتے۔ بلکہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ لکھنے والے نے کیا لکھا ہے۔

(۲)

حسن رضوی کی کتاب "گفت وشنید" پر کالم خاصا جانب دارانہ تھا۔ یعنی سارے کا سارا انیس ناگی کے بارے میں تھا جب کہ اس کتاب میں بعض دوسرے ادیبوں کے انٹرویو بھی خاصے دلچسپ ہیں۔ لہٰذا ہم جانب داری کے الزام سے بچنے کے لیے اور بعض دیگر الزامات اپنے سر لینے کے لیے مذکورہ کتاب کے روشن پہلوؤں کی نشاندہی کر رہے ہیں۔

ممتاز ناول نگار عبداللہ حسین ایک طویل عرصے سے لندن میں مقیم ہیں۔ پاکستان کے ادبی حلقوں سے ان کا رابطہ بہت ہی کم ہے۔ کبھی کبھار اپنے وطن آتے ہیں تو بھی منظر عام پر نہیں آتے۔ اخباروں میں بھی ان کے انٹرویو دیکھنے میں نہیں آئے۔ اس لیے

[illegible] گفتہ باشد
[illegible] باشد

کی کسوٹی پر انھیں پرکھنے کا کبھی موقع نہ ملا۔ حسن رضوی کے ذریعے ہمیں پہلی مرتبہ ان کے "فن" تک رسائی ہوئی ہے، جس سے ان کے عیب و ہنر تو ظاہر نہیں ہوئے، البتہ اُردو زبان کے عیب معلوم ہو گئے۔ فرماتے ہیں۔

"اُردو کی نسبت پنجابی زبان میں جذبۂ مزاحمت اور بیان کرنے کی قوت بے پناہ ہے۔ پنجابی میں ایک عظیم جذباتی رابطے کا احساس ہے، اُردو اس سے عاری ہے۔ اُردو میں پنجابی جیسی قوت اور شدت موجود نہیں...... دراصل لوگوں کو اُردو میں لکھنے اور پڑھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ چونکہ اُردو زبان رائج ہے۔ بہت سی کتابیں اخبارات اور رسائل اُردو میں چھپتے ہیں، اس لیے اُردو زبان لوگوں کو زیادہ آسان لگتی ہے...... یہ میرا یقین ہے کہ اگر یہاں اُردو کی بجائے پنجابی رائج ہوتی اور "اداس نسلیں" اردو کی بجائے پنجابی میں لکھا جاتا تو یہ صرف اس سے زیادہ مقبول ہوتا، بلکہ اس سے بہتر لکھا جاتا۔"

جہاں تک "اداس نسلیں" کے بہتر لکھے جانے کا سوال ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ناول پنجابی میں ضرور بہتر طور پر لکھا جا سکتا تھا، لیکن اُردو میں بھی اسے بہتر طور پر لکھنے کی خاصی گنجائش موجود ہے۔ لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ عبداللہ حسین ایک بار جو کچھ لکھ دیتے ہیں، وہ پتھر کی لکیر بن جاتا ہے۔ یہ لکیر اتنی گہری ہوتی ہے کہ اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ تبدیلی کرنے سے پتھر ہی کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

پنجاب میں اُردو کے رواج کے بارے میں عبداللہ حسین کے ارشادات قابلِ توجہ ہیں۔

"میرا نظریہ یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد پنجاب کے لوگوں کی ایک حاکمانہ ذہنیت رہی ہے کہ ہم حکمران طبقہ ہیں...... حکمران طبقے کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے...... پاکستان میں پنجابیوں نے انگریزی اور اُردو بولنے میں اپنی برتری سمجھی"......

مطلب یہ ہے کہ پنجاب میں اُردو کو اس لیے فروغ حاصل ہوا کہ پنجابی اپنے آپ کو "حکمران" سمجھتے تھے۔ حکمران طبقہ اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے عوام سے الگ زبان کو اپناتا ہے۔ عبداللہ حسین کی اس منطق کو اگر درست سمجھ لیا جائے، تو ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے کیا مجبوری تھی کہ پنجاب نے اردو کو اپنایا۔ اس وقت تو پنجابی محکوم تھے اور ان میں حاکمانہ ذہنیت بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۴۷ تک پنجاب اُردو کا ایک بہت بڑا مرکز بن چکا تھا اور

اس میں ایسا اُردو ادب تخلیق ہوا، جس کی مثال اہلِ پنجاب خود بھی دوبارہ پیش نہ کر سکے۔ پنجاب کی قیامِ پاکستان کے بعد کا اُردو ادب، قیامِ پاکستان سے پہلے کے اُردو ادب کے مقابلے پر ایسا ہی ہے، جیسے حبیب جالب کے مقابلے پر علامہ اقبال اور منٹو، اور غلام عباس کے مقابلے پر عبداللہ حسین۔

معاف کیجیے، ہم ضرورت سے کچھ زیادہ سنجیدہ ہو گئے، حالانکہ عبداللہ حسین کی باتوں پر سنجیدہ ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ موصوف کی آئندہ تمام کتابیں بھی پنجابی میں نہیں اُردو میں ہوں گی۔ ہاں وہ یہ کہتے رہیں گے کہ اگر یہ کتابیں پنجابی میں لکھی جاتیں تو بہتر ہوتیں۔ دراصل قصہ یہ ہے کہ اُردو اور پنجابی، دونوں عبداللہ حسین کی زبانیں ہیں۔ دونوں سے انھیں برابر کی محبت ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پنجابی سے محبت کا اظہار وہ زبانی طور پر کرتے ہیں اور اردو سے تحریری طور پر۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا، تو ان کی تحریروں کے پڑھنے والے ساری دنیا میں تو کیا، خود پنجاب میں بھی مشکل سے دستیاب ہوتے۔

ایک سوال کے جواب میں عبداللہ حسین نے یہ بھی لکھا ہے۔

"میں اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے لکھنا پڑتا ہے۔ میرے اندر لکھنے کی جو تحریک ہے، وہ مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں لکھوں، لیکن میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ میری تحریر کو زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھیں۔"

گویا اسی خواہش کے تحت عبداللہ حسین اُردو میں لکھتے ہیں۔ ان کے اندر لکھنے کی جو تحریک ہے، وہ انھیں مجبور کرتی ہے کہ وہ اُردو میں لکھیں۔ اس کے باوجود انھیں یہ کہنے کا حق ہے کہ ان کی کتابیں اگر اُردو کی بجائے پنجابی میں لکھی جاتیں تو زیادہ بہتر ہوتیں۔ بلکہ وہ چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی کتابیں کوئی دوسرا لکھتا تو وہ زیادہ بہتر ہوتیں۔

عبداللہ حسین سے حسن رضوی نے لندن کے ادیبوں کے بارے میں اظہارِ خیال کے لیے کہا تو انھوں نے جواب دیا: "مجھے تو ان میں کوئی بھی کام کا ادیب دکھائی نہیں دیتا۔" حسن رضوی نے بخش لائلپوری کا نام لے کر داد چاہی، تو انھوں نے کہا: "بس وہ ایسے ہی ہیں۔" پھر افتخار عارف کے بارے میں سوال کیا گیا تو جواب ملا، "وہ بھی بس ایسے ہی ٹھیک ٹھاک ہیں"...... ہمارے خیال میں اس جواب سے افتخار عارف کا تو کچھ بھی نہیں بگڑا، بخش لائلپوری کا بہت کچھ بن گیا۔ انھیں

عبداللہ حسین نے افتخار عارف کے برابر کھڑا کر دیا ہے۔ ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شعر کو سمجھنا شعر لکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ افتخار عارف کے اخلاق کی تعریف ہم نے سنی تھی، اب معلوم ہوا کہ وہ باحوصلہ انسان بھی ہیں۔ ان کی ہمت کی داد دینی چاہیے کہ وہ عبداللہ حسین جیسے "سخن فہموں" کے درمیان رہ کر "سخن فہمی عالم بالا" کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

افتخار عارف کا نام آیا ہے تو کچھ ان کے انٹرویو کا بھی ذکر ہو جانا چاہیے، جو زیر نظر کتاب میں شامل ہے۔ اس انٹرویو میں انھوں نے اگرچہ علامہ سید سلیمان ندوی کو ترقی پسند تحریک سے منسلک کر کے اور ترقی پسند تحریک کو سرسید کی تحریک سے زیادہ فعال بتا کر حسن رضوی کو ہنسانے کے ساتھ ساتھ حسن رضوی کی غزل گوئی کی تعریف کر کے انھیں بھی رلانے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کی باقی ساری باتیں بہت معقول ہیں۔ خصوصاً ان کی یہ بات ہمیں بہت اچھی لگی کہ اتنی شہرت اور مقبولیت کے باوجود انھیں اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی اور کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ ورنہ آج کل یہ حال ہے کہ چرس اور پندار کے نشے ایک ساتھ رنگ جماتے ہیں اور ٹوٹے پھوٹے مصرعے کہنے والا بھی اپنے آپ کو میر کے برابر سمجھتا ہے۔

افتخار عارف کی ایک اور بات سے بھی دل خوش ہوا کہ انھوں نے شاعری کے سلسلے میں سلیم احمد سے بہت کچھ سیکھنے کا اعتراف کیا ہے۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"جن لوگوں...... سے ہم نے بہت کچھ سیکھا، ان میں سلیم احمد کا نام نہ لینا احسان فراموشی کے مترادف ہوگا...... کراچی میں ان کا گھر ایک عجیب و غریب تربیت گاہ تھی۔"

واضح رہے کہ افتخار عارف نے یہ بات سلیم احمد کے انتقال کے بعد کہی ہے۔ اگر ان کی زندگی میں کہی ہوتی، تو یار لوگ اسے بھی "دنیاداری" کے کھاتے میں ڈال دیتے۔ سلیم احمد بھی افتخار عارف کو بہت پسند کرتے تھے۔ طویل نظم "مشرق" میں انھوں نے افتخار عارف کی تعریف میں جو شعر لکھے ہیں، وہ ان کی آواز تھے۔ بلاشبہ افتخار عارف اس تعریف کے ہر اعتبار سے مستحق ہیں۔

تعریف کے مستحق تو قتیل شفائی بھی ہیں، جنھوں نے اپنے انٹرویو میں فرمایا ہے۔

"مجھے بچپن میں گانے کا شوق تھا اور میری کوشش تھی کہ میرا شمار اچھے شوقیہ گلوکاروں میں ہونے لگے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد مجھے اپنے شاعر ہونے کا سراغ ملا تو میری توجہ بٹ کے رہ گئی اور پھر کچھ مدت گزرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے شوقِ گلوکاری میں اور ذوقِ شاعری میں کھوتا ہو گیا ہے کہ یہ دونوں مل جل کر میرا ہاتھ بٹائیں گے۔ چنانچہ میں ایک مترنم شاعر بن گیا...."

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ "مترنم" شعرا کو اگر گلوکار کہہ دیا جائے، تو وہ برا مان جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات گلوکاروں کے برا ماننے کی ہوتی ہے۔ یہ قتیل شفائی کی عظمت ہے کہ انھوں نے اپنی گلوکارانہ حیثیت کو شاعرانہ حیثیت کے برابر درجہ دیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی پہلی حیثیت، ان کی دوسری حیثیت پر ہمیشہ غالب رہی ہے۔

جناب قتیل شفائی نے ان نقادوں کی خوب خبر لی ہے، جو فلمی شاعری کو ادب کا حصہ نہیں سمجھتے۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں، "میں اپنی ادبی شاعری کے ساتھ ساتھ اپنی فلمی شاعری پر بھی فخر کرنے کا اعلان کرتا ہوں اور اپنے قارئین کو منصف بناتے ہوئے پوچھتا ہوں کہ کیا فلم میں معیاری شاعری نہیں ہو سکتی؟ کیا ادب میں بری شاعری موجود نہیں ہے؟"

جناب قتیل شفائی کا بے حد شکریہ کہ انھوں نے ہم جیسوں کو یعنی اپنے قارئین کو منصف بنایا ہے۔ اس منصب پر فائز ہونے اور ان کا کلام دوبارہ پڑھنے کے بعد ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ قتیل شفائی نے جو کچھ کہا ہے، ٹھیک کہا ہے۔ جس طرح فلم میں معیاری شاعری ہو سکتی ہے، اسی طرح ادب میں غیر معیاری شاعری بھی ہو سکتی ہے اور ہر شاعر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ دونوں کام بیک وقت انجام دے۔

ادب میں غیر معیاری شاعری کے تذکرے کے بعد ضروری ہے کہ کچھ اچھی شاعری کا بھی ذکر ہو جائے۔ ہندوستان کے منفرد نقاد وارث علوی سے حسن رضوی نے سوال کیا، "وہ کون سے افسانہ نگار ہیں، جن کو پڑھ کر آپ کو کوفت یا مسرت ہوئی؟" وارث علوی نے جواب میں کہا۔

"میرے سامنے جو چیزیں آئی ہیں انھیں پڑھ کر مسرت سے زیادہ کوفت ہی ہوئی ہے۔ [illegible] میں نے پسند نہیں کیا، بلکہ برداشت کیا ہے...... مجھے جس ادیب نے سب سے زیادہ [illegible] وہ ہیں انور سجاد اور اس سے زیادہ اذیت اس وقت ہوئی، جب میرے بڑے قریبی [illegible] (باقر مہدی) جن کی علمی قابلیت کا میں مداح ہوں، وہ انور سجاد کے پرستار اور بڑے [illegible]"

[illegible] بے حد افسوس ہے کہ ایک پاکستانی ادیب کے افسانے پڑھ کر ہندوستان کے ایک

ادیب کو کوفت ہوئی، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی عرض کریں گے کہ ہم اہل پاکستان اپنے ایک نامور ادیب کے بارے میں اس قسم کی رائے سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وارث علوی کو معلوم ہونا چاہیے کہ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات پہلے ہی خراب ہیں، اس قسم کی تنقیدی آراء سے مزید خراب ہو سکتے ہیں۔ وارث علوی کو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ انور سجاد کی شکایت وہی لوگ کرتے ہیں، جو انھیں پڑھتے ہیں۔ پاکستان میں ہم نے کسی کو انور سجاد کا شاکی نہیں پایا۔ لہٰذا وارث علوی کو جو کوفت ہوئی، اس کا سبب وہ خود ہیں۔ انھیں ہر وقت پڑھتے رہنے اور سب کچھ پڑھتے رہنے کی عادت ہے، اس لیے انھیں بعد میں کوفت ہوتی ہے۔

ہمیں اس پر بھی حیرت ہے کہ وارث علوی ایک طرف تو باقر مہدی کی علمی قابلیت کے مداح ہیں اور دوسری طرف انور سجاد کی افسانہ نگاری کی خوبیوں سے انکار بھی کر رہے ہیں، جو باقر مہدی نے اپنے علم کے زور پر بعد از خرابی بسیار تلاش کی ہیں۔ انور سجاد کے کمالات سے انکار، باقر مہدی کی علمیت سے انکار کے مترادف ہے۔ وارث علوی سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اپنے ممدوح کے ساتھ ایسا سلوک کریں گے۔

سننے میں آیا ہے کہ باقر مہدی نے وارث علوی سے کہا کہ وہ انور سجاد کے بارے میں اپنے الفاظ واپس لیں۔ وارث نے جواب دیا، "پہلے انور سجاد اپنے افسانے واپس لیں، پھر میں اپنے الفاظ واپس لوں گا۔"

ہمارے بیشتر ادیب اپنی کتابیں خود ہی چھاپتے ہیں

موجودہ حکومت نے ایک طرف کاغذ اور دیگر سامان طباعت کی قیمتوں میں ناقابل تصور اضافہ کیا ہے اور دوسری طرف اخبارات و رسائل جاری کرنے کے اجازت ناموں سے تمام پابندیاں اٹھالی ہیں، تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ جمہوری حکومت اظہار رائے کی آزادی کے خلاف ہے۔ حکومت کا یہ اقدام ایسا ہی ہے کہ جیسے پہلے تو کسی کی زبان کاٹ دی جائے اور پھر اس سے کہا جائے تمھیں بولنے کی پوری پوری آزادی ہے۔ سنا ہے نئے بجٹ میں اخبارات و رسائل اور دیگر مطبوعات پر ساڑھے بارہ فیصد ٹیکس عائد کیا جانے والا ہے۔ گویا اظہار رائے کی رہی سہی آزادی بھی جمہوریت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں کام آجائے گی۔

آسانی سے ڈیکلریشن مل جانے کی وجہ سے پچھلے ایک برس میں درجنوں نئے اخبارات و رسائل جاری ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر خریداروں کی نایابی، اشتہاروں کی عدم دستیابی اور مالکان کی خانہ خرابی کا شکار ہو کر دو ایک شماروں کے بعد ہی دم توڑ گئے یا جاں کنی کے عالم میں ہیں۔ کچھ اچھے ادبی رسائل بھی منظر عام پر آئے ہیں، جن میں سے بعض کا تعارف ہم کرا چکے ہیں، ایسا ہی ایک اور رسالہ اس وقت پیش نظر ہے، جس کا نام "علامت" ہے۔ یہ ماہنامہ لاہور سے ضیاء جالندھری، امجد الطاف، محمد منشا یاد اور سعید شیخ نے جاری کیا ہے۔ یہ چاروں پختہ کار ادیب ہیں اور ان کے اعلیٰ ادبی ذوق کی وجہ سے یہ رسالہ پاکستان کے ادبی منظر کا آئینہ دار بن گیا ہے۔

"علامت" کی سب سے پہلی خوبی یہ ہے کہ یہ کسی مخصوص ادبی گروہ کا ترجمان نہیں ہے۔ اسے پاکستان کے ایسے بہت سے لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہے، جن کی تخلیقات کسی بھی ادبی رسالے کے عمدہ معیار کی ضامن ہو سکتی ہیں۔ ممتاز مفتی، انتظار حسین، ڈاکٹر وزیر آغا، عزیز حامد

مدنی، جمیل الدین عالی، منیر نیازی، ڈاکٹر جمیل جالبی، شان الحق حقی، الطاف گوہر، حمید نسیم، ساقی فاروقی، مرزا ادیب، اشفاق احمد اور ان جیسے بہت سے اہل قلم کی تازہ ترین تخلیقات اگر پڑھنے کو مل جائیں، تو پڑھنے والوں کو اور کیا چاہیے۔

"علامت" کے اب تک پانچ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ یوں تو ان کے تمام مندرجات کسی نہ کسی اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں، لیکن ضیاء جالندھری کے اداریوں نے ہمیں سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ وہ ہر شمارے میں کسی اہم موضوع پر نہایت فکر انگیز گفتگو کرتے ہیں۔ ایک اداریہ انھوں نے معاشرے میں ادیب کے مقام کے بارے میں لکھا ہے، اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں......

"ادیبوں کے ایسے گروہ بھی پیدا ہو جاتے ہیں، جو ادبی اقدار کو پس پشت ڈال کر سرکار دربار میں شناخت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر اس سلسلے میں بڑی جدوجہد کی کوششیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ایسے ادارے بنائے جاتے ہیں جہاں خصوصی سرکاری سرپرستی کے امکانات زیادہ ہوں۔ بہانے بہانے ادبی اجتماعات میں، کتابوں کی رونمائی کے موقعوں پر خالص فنی جلسوں میں، حکومت کے اعلیٰ اہلکاروں، وزیروں، مشیروں وغیرہ کو مہمان خصوصی کے طور پر بحیثیت صدر مدعو کیا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر کا ادب اور فنون سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا اور عموماً یہ حضرات ایسے موقعوں پر اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں کہ ادیبوں اور شاعروں کی امامت کا فریضہ بھی انجام دیں۔ وہ ادیبوں کو سبق دیتے ہیں۔ انھیں بتاتے ہیں کہ انھیں کیا کرنا چاہیے، کیا لکھنا چاہیے کیسے لکھنا چاہیے، اور یہ بھی کہ کیا نہیں لکھنا چاہیے۔"

ہمیں تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی کہ سرکاری عہدیدار یا وزیر ادیبوں کی امامت کریں اور انھیں یہ مشورہ دیں کہ کیا لکھنا چاہیے اور کیسے لکھنا چاہیے۔ جن ادیبوں کو اس قسم کے مشوروں کی ضرورت ہوتی ہے، وہی سرکار دربار سے رابطہ پیدا کر کے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ویسے بھی قصیدہ گوئی ہماری روایت رہی ہے۔ جتنا بڑا شاعر ہوگا، اتنا ہی بڑا قصیدہ گو بھی ہوگا۔ میر، سودا اور غالب سے بڑھ کر کس نے قصیدہ گوئی کی ہے۔ اگر یہ قصیدہ گوئی نہ کرتے، تو ان کے حالات اتنے ابتر ہو جاتے کہ غزل گوئی کی طرف دھیان ہی نہ جاتا۔

جو ادیب سرکاری افسروں اور وزیروں کو ادب شناس سمجھتے ہیں، ان کے پیش نظر ادب کا

نہیں، خود اپنا مفاد ہوتا ہے۔ وہ ادب کو وسیلہ بنا کر اہل اقتدار کے قریب آتے ہیں تاکہ کچھ فوائد حاصل کر سکیں۔ ادب کی عام طور پر تعریف کی جاتی ہے کہ یہ انسانی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کا ایک وسیلہ ہے۔ اگر کوئی ادیب، جو ظاہر ہے کہ انسان بھی ہوتا ہے، اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے، تو اس میں کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

ضیاء جالندھری نے ایک اداریہ اس موضوع پر بھی لکھا ہے کہ ادیبوں کو اپنی کتابیں چھپوانے کے سلسلے میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کا سد باب ہونا چاہیے۔ انھوں نے ایک دلچسپ تجویز پیش کی ہے، جس کا خلاصہ انھی کے الفاظ میں یہ ہے۔۔۔

"کئی ممالک میں...... ادیبوں کو اپنی کتابوں کی اشاعت کے لیے براہ راست چھاپنے والوں کے پیچھے پھرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ یہ کام نہایت احسن طریقے سے ادبی ایجنٹوں کے ذریعے سرانجام دیا جاتا ہے...... یہ نہ صرف حقوق اشاعت اور دوسرے متعلقہ قوانین کے ماہر ہوتے ہیں، بلکہ بازار میں کتابوں کی مانگ کے متعلق بھی مکمل آگاہی رکھتے ہیں اور ادیبوں کو ادبی سطح پر پرکھنے کے اہل بھی ہوتے ہیں۔ یہ اگر ایک طرف ادیب کے لیے اچھے سے اچھے ناشر سے معاملہ طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو دوسری طرف ناشر کے مفاد کا بھی پورا خیال رکھتے ہیں...... ان ایجنٹوں کو اپنے کام کا جو کمیشن ملتا ہے، اس سے ان کے روزگار کا معقول بندوبست ہو جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں اس چیز کی اشد ضرورت ہے کہ یہاں اس قسم کی ایجنسیاں قائم کی جائیں تاکہ ادیب ان مسئلوں سے بے نیاز ہو کر اپنی تمام توجہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں صرف کر سکیں۔"

ضیاء جالندھری کے ارشادات سر آنکھوں پر، لیکن وہ جن ملکوں کی مثال پیش کر رہے ہیں، وہاں کتابیں ضروریات زندگی میں شامل ہیں، نیز ادیب اور ناشر دونوں پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بیشتر ادیب تلمیذ الرحمٰن ہوتے ہیں اور کتابیں چھاپنے کا کاروبار وہ کرتے ہیں، جو کتاب کے سرورق کے ڈیزائن سے اندازہ کرتے ہیں کہ کتاب کا الٹا سیدھا کیا ہوتا ہے۔ پھر ان ملکوں میں تعلیم عام ہے اور ایک بڑا طبقہ ادب سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ہمارے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایسی صورت میں یہ توقع رکھنا کہ ادیب اور ناشر کے درمیان ادبی ایجنٹ کو موجود ہونا چاہیے محض ایک خوش خیالی ہے۔ ہمارے ہاں خود ادیب تو اپنی تخلیقات سے اپنے روزگار کا

بندوبست کر نہیں سکتا تو بیچارہ ادبی ایجنٹ کس طرح اتنا کما سکتا ہے کہ روح و تن کا رشتہ برقرار رکھ سکے۔

دو چار ادیبوں کو چھوڑ کر پاکستان میں کوئی ادیب ایسا نہیں ہے، جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس کی کتاب کا ایک ہزار کا ایڈیشن عام پڑھنے والوں نے خریدا ہے۔ ہمارے بیشتر ادیب اپنی کتابیں خود ہی چھاپتے ہیں اور اپنے دوستوں میں مفت تقسیم کر دیتے ہیں اور بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوست کتاب مفت لینے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس کتاب کو رکھنے کی جگہ مصنف کے گھر میں نہیں اس کتاب کے لیے ہمارے گھر میں گنجائش کیسے نکل سکتی ہے۔

یہ واقعہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ ایک مشہور نقاد نے اپنے مضامین کا مجموعہ بصرف زرِ کثیر شائع کیا اور عام دستور کے خلاف یہ طے کیا کہ وہ کسی کو اپنی کتاب مفت نہیں دیں گے۔ حالانکہ انھیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ تنقید مفت بھی ملے تو مہنگی پڑتی ہے۔ انھوں نے ایک کتب فروش کو شیشے میں اتارا اور یہ باور کرایا کہ ان کی کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جائے گی۔ کتاب کا پورا اسٹاک انھوں نے کتب فروش کے حوالے کر دیا اور طے پایا کہ سال بھر بعد حساب فہمی ہوگی۔ جب حساب فہمی ہوئی تو کتب فروش نے نقاد کو کچھ دینے کی بجائے ایک خاصی معقول رقم طلب کی۔ نقاد نے اس کی وجہ پوچھی تو کتب فروش نے کہا، "سال بھر میں آپ کی دو سو روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ آپ کی کتاب کے اسٹاک کو گودام میں رکھنے کا کرایا ایک ہزار روپے ادا کیا گیا۔ اپنے دو سو کاٹ کر باقی آٹھ سو عنایت فرما دیجیے۔"

عریانی اور فحاشی ایک متنازع مسئلہ ہے

سوال: آپ کے خیال میں ایک اچھے اور کامیاب صحافی میں بنیادی طور پر کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے؟

جواب: ...... خوبیاں جو میرے والد محترم میں ہیں۔ اس طرح کی خوبیاں اگر کسی صحافی میں ہوں تو میں اسے کامیاب صحافی کہوں گا۔

سوال: آپ کے والد محترم میں ایک صحافی کی حیثیت سے جو خوبیاں ہیں، ان کی کچھ وضاحت کر دیجیے۔

جواب: میرے والد صاحب سب کے سامنے ہیں، ان کی خوبیوں کا سب کو علم ہے۔

سوال: ضروری نہیں ایک شخص جو آپ کا یہ انٹرویو پڑھے، وہ آپ کے والد صاحب کی خوبیوں سے آگاہ ہو۔ اس لیے آپ اپنی بات کی کچھ تو وضاحت کریں۔

جواب: کچھ باتیں صرف محسوس کی جا سکتی ہیں، انھیں بیان کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

سوال: آپ اپنے محسوسات کو اگر پوری طرح بیان نہیں کر سکتے، تو جس حد تک ممکن ہو اس حد تک تو آپ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کریں۔

جواب: میں نے ایک اچھے صحافی کی خوبیوں کے بارے میں جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ دیا ہے۔

یہ مکالمات کسی مزاحیہ ڈرامے کے نہیں ہیں اور نہ یہ کسی فرضی انٹرویو کے اقتباسات ہیں۔ یہ بی بی سی کی ایک گفتگو کا حصہ ہیں۔ سوال صحافی محمد آصف جھلی کے ہیں اور جواب میر شکیل الرحمٰن کے، جو روزنامہ "جنگ" لاہور کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ اگر یہ انٹرویو "ندا" لاہور جیسے موقر جریدے

میں شائع نہ ہوتا تو ہم یہی سمجھتے کہ کسی نے میر شکیل الرحمن کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اب تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ چھوٹے میر صاحب نے اپنی نیک نامی کے لیے خود ہی راہ ہموار کی ہے۔ اگر موصوف ایک اچھے اور کامیاب صحافی کی خوبیاں بیان فرما دیتے، تو دنیائے صحافت کا ایک اہم راز فاش ہو جاتا۔ سرکاری رازوں کی طرح بعض غیر سرکاری رازوں کا فاش ہو جانا بھی مشکلات کا باعث بن سکتا ہے۔ میر شکیل الرحمن نے جس احتیاط سے کام لیا ہے، اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ خود بھی ایک اچھے اور کامیاب صحافی ہیں۔

مذکورہ مکالمات سے انٹرویو کا آغاز ہوتا ہے۔ اصولاً ان مکالمات پر ہی انٹرویو کو ختم ہو جانا چاہیے تھا، کیونکہ آگے گفتگو کی گنجائش نہیں تھی، لیکن وہ صحافی ہی کیا جو خاموش ہو جائے۔ بھٹی صاحب نے سوال کیا، "ایک اچھے اخبار کے محاسن آپ کے نزدیک کیا ہیں؟" جواب ملا، "جس طرح کہ ہمارا یہ اخبار "جنگ" ہے، اس طرح کی خوبیاں اگر کسی اخبار میں ہوں گی تو میرے نزدیک وہ اچھا اخبار ہوگا۔" سبحان اللہ! اگلے زمانے میں شاعر سہل ممتنع میں شعر کہا کرتے تھے، اب اخبار کے چیف ایڈیٹر بھی اس شعری صنعت میں رواں ہو گئے ہیں۔ چھوٹے میر صاحب نے ایک اچھے اخبار کا جو معیار متعین فرمایا ہے، وہ بلاشبہ مثالی ہے۔ کیونکہ سوائے ایک اخبار کے کوئی دوسرا اخبار اس معیار تک نہیں پہنچ سکتا اور اگر کوئی اس معیار تک پہنچنے کی کوشش کرے گا، تو اسے خود اپنے معیار سے نیچے اتر آنا پڑے گا۔

سلسلۂ گفتگو آگے بڑھا تو بھٹی صاحب نے کہا، جنگ میں باوثوق ذرائع سے جو خبریں شائع ہوتی ہیں، ان میں سے بعض خبروں کو چھوڑ کر زیادہ تر خبریں بعد میں غلط ثابت ہوتی ہیں۔ اس طرح اخبار کی ساکھ متاثر ہوتی ہے۔ چیف ایڈیٹر صاحب نے بے ساختہ فرمایا، "ہمارے اخبار ہی کی ساکھ متاثر ہوتی ہے، اس سے آپ کو تو نقصان نہیں پہنچتا۔" جواب بالکل درست ہے۔ اخبار میر صاحبان کا ہے۔ وہ جھوٹی خبریں چھاپیں یا سچی یا سرے سے خبریں ہی نہ چھاپیں، صرف اشتہاروں یا مزاحیہ کالموں پر گزارا کریں، اس سے کسی کو کیا۔ ساکھ بنے یا بگڑے مالکان کا ذاتی معاملہ ہے، ذاتی معاملات میں غیروں کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ ایسا مسکت جواب سننے کے بعد اصولاً بھٹی صاحب کو اپنے سوال پر معذرت کرنی چاہیے تھی، لیکن انھوں نے ہر طرح کے اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا، "مجھے نقصان کیوں نہیں پہنچتا۔ جب مجھے اخبار میں

پڑھنے کے لیے جھوٹی اور بے بنیاد خبریں ملیں گی، تو اس سے مجھے فائدہ تو نہیں پہنچے گا، نقصان ہی ہو گا۔" اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ آپ اخبار پڑھتے ہی کیوں ہیں، ٹی وی کا خبرنامہ دیکھا کیجیے، تا کہ سچ اور جھوٹ کی تمیز جاتی رہے۔ جس ملک میں آدمی پیدا ہوتے ہی اخباروں کے چیف ایڈیٹر بن جائیں، وہاں اخباروں میں سچی خبریں تلاش کرنا، نثری نظم میں محاسن ڈھونڈنے کے مترادف ہے۔

دوران گفتگو چھوٹے میر صاحب کو بتایا گیا، بعض حلقوں کا خیال ہے کہ ان کا اخبار عریانی اور فاشی پھیلاتا ہے۔ انھوں نے فرمایا، "جو چیزیں ہم بڑی احتیاط اور چھان بین کے بعد شائع کرتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو ان میں عریانت نظر آتی ہو، لیکن قارئین کی اکثریت کو ہم پر اعتماد ہے..... اگر آپ ہمیں عریانی اور فاشی پھیلانے کا الزام دے رہے ہیں، تو پھر عوام کو بھی مورد الزام ٹھہرائیں کہ وہ بھی فاشی چاہتے ہیں۔"

دراصل بات یہ ہے کہ عریانی اور فاشی ایک متنازعہ مسئلہ ہے۔ ایک چیز جو سوال کرنے والے کو فحش نظر آتی ہے، ضروری نہیں کہ وہ جواب دینے والے کے نزدیک بھی فحش ہو۔ جس طرح ان مسائل میں بھی اختلاف رائے ہوتا ہے، اسی طرح عریانی اور فاشی کے معاملے میں بھی ہر انسان کی سوچ مختلف ہوتی ہے۔ سوچ کے ساتھ یہ معاملہ نظر کا بھی ہے۔ میر شکیل الرحمن صاحب فکر ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب نظر بھی ہیں، انھیں معلوم ہے کہ فاشی کیا چیز ہے اور کہاں نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز انھیں اپنے اخبار میں نظر نہیں آئے گی۔ ہاں دوسرے اخباروں میں والے، تو پی دیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے تو انھوں نے مزید یہ فرمایا ہے: "آپ نے جنگ ہی کو عریانی اور فاشی پھیلانے کا ذمہ دار کیوں ٹھہرایا ہے۔ آپ نوائے وقت کے مالکان سے بھی یہ سوال پوچھیں کہ عریانی اور فاشی پھیلانے میں ان کا کیا کردار رہا ہے، وہ بھی تو نوائے وقت میں بلاوجہ اور بے ہودہ خواتین کی تصاویر بڑے نمایاں انداز میں شائع کر رہے ہیں۔ کیا آپ لوگوں کو نوائے وقت میں عریانی اور فاشی نظر نہیں آتی۔ آپ نوائے وقت اور جنگ کے مندرجات اور تصاویر کا تقابلی جائزہ لیں، تو آپ میری بات تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ فاشی ہم نہیں بلکہ نوائے وقت [illegible] ہے۔"

میر صاحب نے جو کچھ فرمایا اس کا ملخص یہ ہے کہ ان کے اخبار میں عریانی اور فاشی بلاوجہ

اور بلا جواز نہیں ہے، چونکہ عوام ایسا چاہتے ہے اس لیے ان کی خواہش کا احترام کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس نوائے وقت کی عریانی اور فحاشی بلاوجہ اور بلا جواز ہے، جس کے ذمہ دار اس اخبار کے مالکان ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ چھوٹے میر صاحب نے اپنے اخبار کے اداریوں کے برعکس صاف گوئی سے کام لے کر ایک بہت اہم مسئلے کو طے کر دیا۔ آئندہ عریانی اور فحاشی کی تعریف یہ ہوگی کہ یہ وہ چیز ہے، جو نوائے وقت کے صفحوں پر بے نقاب نظر آتی ہے، لیکن جنگ کے صفحات پر شائستگی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ عریانی و فحاشی کے ذریعے نوائے وقت لوگوں کا اخلاق خراب کرتا ہے، جنگ انھیں اخلاق اور شائستگی کی تعلیم دیتا ہے۔

چھوٹے میر صاحب نے اچھا کیا کہ یہ بھی بتا دیا کہ عریانی و فحاشی پھیلانے کے اصل ذمہ دار عوام ہیں۔ چونکہ عوام فحش تحریریں پڑھنے اور عریاں تصاویر دیکھنے کے خواہش مند ہیں اس لیے جنگ اس ضمن میں عوام کی خدمت کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ غلطی سے اخبار میں کچھ غیر فحش چیزیں بھی چھپ جاتی ہیں۔ یقیناً اس سے عوام کی دل آزاری ہوتی ہوگی، لیکن عوام کو بھی سوچنا چاہیے کہ اخبار والے بھی آخر انھیں کی طرح انسان ہیں، اگر ان سے غلطی ہو جائے تو اسے نظر انداز کر دینا چاہیے۔

بھلی صاحب نے ایک سوال یہ بھی کیا: ''ایک اہم اخبار کے ایڈیٹر کا یہ موقف ہے کہ جنگ کی کوئی پالیسی نہیں ہے اور جنگ ایک مادر پدر آزاد اخبار ہے۔ اس الزام کا آپ کیا جواب دیں گے۔'' ''ہمارے خیال میں اس قسم کے سوال اٹھانا صحافتی اخلاق کے منافی ہے۔ اول تو جنگ پر بڑے میر صاحب کا پورا پورا کنٹرول ہے، اس لیے اسے مادر پدر آزاد اخبار کہنا غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ پالیسی کوئی ریڈی میڈ لباس نہیں ہے، جو بازار سے خریدا اور پہن لیا۔ یہ تو بنتے بنتے بنتی ہے اور عام طور پر بننے ہی کے مرحلے میں رہتی ہے۔ پالیسی ایک مرتبہ بن جائے، تو اس کے بگڑنے یعنی تبدیل ہونے کا اندیشہ رہتا ہے، لیکن جس چیز کا وجود ہی نہ ہو، اس کے بگڑنے یا تبدیل ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ کسی پالیسی کا نہ ہونا بھی ایک پالیسی ہے اور دانش مندوں کے نزدیک یہی سب سے بہتر پالیسی ہے۔

ایک اچھے اخبار کی پالیسی ہمیشہ حکومت وقت کی پالیسی کے تحت ہوتی ہے، اشتہار لیتے رہنے اور حکومت کی تائید میں خبریں چھاپتے رہنے ہی میں عافیت ہے۔ ہاں اگر کچھ لوگ کلاشنکوف

وغیرہ لے کر آ جائیں، تو ان کی مرضی کی خبریں چھاپنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ایک اچھا ایڈیٹر جس طرح عوام کے جذبات کا خیال رکھتا ہے، اسی طرح اسے کلاشنکوف کے جذبات بلکہ عملی اقدامات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔

معاف کیجیے بھلی صاحب کے سوال کا جواب ہم نے اپنی طرف سے دے دیا اور یہ نہیں بتایا کہ جن صاحب سے یہ سوال کیا گیا تھا، انھوں نے کیا فرمایا۔ وہ فرماتے ہیں: ''عوام جنگ کو ایسا اخبار خیال کرتے ہیں جو قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ اگر ہماری کوئی پالیسی نہ ہو تو ہم عوام کی رہنمائی کا فرض کیوں کر ادا کر سکتے ہیں؟'' چیف ایڈیٹر صاحب نے بہت اچھا کیا، یہ بتا دیا کہ ان کا اخبار قوم کی رہنمائی کر رہا ہے۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ اخبار کی ترقی ہو رہی ہے اور قوم رو بہ زوال ہے، لیکن ہم قوم کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ جنگ میں ''تین مرد تین کہانیاں'' کا پرجوش اور ولولہ انگیز ہفتہ وار سلسلہ شروع ہو چکا ہے، جسے پڑھ کر جلد ہی قوم اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے گی۔

بھلی صاحب نے ایک دلچسپ سوال یہ کیا: ''صحافت میں آنے کے بعد کیا کھویا اور کیا پایا؟'' چیف ایڈیٹر صاحب نے جواب دیا: ''چین، سکون اور آرام کھویا، عزت، دولت، شہرت یہ تمام نعمتیں مجھے صحافت کی وجہ سے میسر آ گئیں۔'' اس جواب کا پہلا حصہ مبہم ہے۔ واضح طور پر بتانا چاہیے تھا کہ کس کا چین، سکون اور آرام غارت ہوا۔ جواب کے دوسرے حصے میں ''عزت'' کا لفظ دولت اور شہرت کے قافیے کے اعتبار سے تو ٹھیک ہے، لیکن معنی کے اعتبار سے بے محل معلوم ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ خوش مزاج اور معاملہ فہم کاتب نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہو؟

اور اب آخر میں انٹرویو کا سب سے اہم سوال اور اس کا جواب بھی ملاحظہ فرمائیے۔

سوال۔ کیا آپ کا ضمیر اس اعتبار سے مطمئن ہے کہ ایک صحافی کی حیثیت سے آپ پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں، آپ نے ہمیشہ انھیں پوری دیانتداری سے ادا کیا ہے؟

جواب۔ نہیں میرا ضمیر مطمئن نہیں ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں اپنی صحافتی ذمہ داریوں کو ہمیشہ پوری دیانتداری سے ادا نہیں کر پایا۔

ہم اس سوال اور اس کے جواب پر تبصرہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، کیونکہ ہمیں ''ضمیر'' اور ''دیانتداری'' کے معنی معلوم نہیں ہیں۔ ان لفظوں کے معنی جاننے کے لیے ہم نے صحافت کی لغت

دیکھی، تو معلوم ہوا، یہ دونوں الفاظ لغت میں موجود ہی نہیں۔

احمد فراز شاعری سے زیادہ گائیکی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں

ہم فقیر گوشہ نشین ہیں، ہمیشہ ایک ہی حال میں رہتے ہیں، کسی نئی حکومت کے آنے سے خوشی ہوتی ہے، نہ پرانی حکومت کے جانے کا غم۔ جانے والے ہم سے اجازت لیے بغیر رخصت ہو جاتے ہیں اور آنے والے پیشگی اطلاع کے بغیر آ جاتے ہیں۔ لیکن پیپلز پارٹی کی حکومت بنی تو ہمیں اس وجہ سے خوشی ہوئی کہ ہمارے وہ ادیب اور دانشور، جو ایک عرصے سے ادب اور دانشوری کے نام پر دربدری کا عذاب سہہ رہے ہیں، روزگار سے لگ جائیں گے۔ یہی ہوا، ہمارے کئی ادیبوں، شاعروں اور شاعرات کو ایسے ایسے اداروں کی سربراہی مل گئی، جہاں عام حالت میں انھیں نوکری بھی مشکل سے مل سکتی تھی۔

ہمیں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ احمد فراز کو اکیڈمی آف لیٹرز کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ کوئی کچھ بھی کہے ہم احمد فراز کے دل سے قدر دان ہیں۔ شیر شاہ سوری کے بعد وہ دوسرے پٹھان ہیں جنھوں نے پورے برصغیر پر حکومت کی ہے۔ شیر شاہ سوری نے تلوار کے زور پر زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تھی، احمد فراز نے قلم کے ذریعے یہ اعزاز حاصل کیا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں کہیں بھی چلے جایئے، گانے والوں اور گانے والیوں کی زبانوں پر احمد فراز ہی کی غزلیں ملیں گی۔ [illegible] کہتے ہیں کہ جب احمد فراز غزل لکھتے ہیں تو وہ یہ بات ذہن میں رکھتے ہیں کہ ان کی غزلیں گائی جائیں گی، لہٰذا وہ شاعری سے زیادہ گائیکی کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ ہمیں اس [illegible] سے اتفاق نہیں ہے۔ احمد فراز شاعری کرتے ہوئے ذہن کو درمیان میں لاتے

ہی نہیں، دل سے کام لیتے ہیں۔ کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ اچھی شاعری کی تعریف یہ ہے کہ "از دل خیزد، بر دل ریزد"، یعنی شاعری وہ ہے جو دل سے اٹھے اور دل کو متاثر کرے۔

ہاں تو جب احمد فراز کو اکیڈمی آف لیٹرز کا چیئرمین بنایا گیا تو ہمیں اس لیے خوشی ہوئی کہ جس طرح احمد فراز کے دن پھرے ہیں، اسی طرح پاکستان کے تمام ادیبوں کے دن پھر جائیں گے۔ اکیڈمی صحیح معنوں میں ادیبوں کے مفادات کا خیال رکھنے والا ادارہ بن جائے گی۔ مگر افسوس کہ ابھی احمد فراز کے اعزاز میں مبارکبادی تقریبات کا سلسلہ جاری تھا کہ انھیں اکیڈمی کی چیئرمین شپ سے برطرف کر دیا گیا۔ حکومت نے احمد فراز کے ساتھ وہی سلوک کیا، جو غالب سے اس کے محبوب نے کیا تھا۔

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کر کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

گیارہ برس تک مزاحمتی ادب تخلیق کرنے کا یہ صلہ اس حکومت نے دیا، جس کے قیام کے لیے احمد فراز نے شب و روز محنت کی تھی۔ ہمیں احمد فراز کی برطرفی کی اطلاع لاہور کے چند ادیبوں کے اس بیان سے ہوئی، جو اخباروں میں چھپا تھا اور موصوف کو ان کے عہدے پر بحالی کے لیے مطالبہ کیا گیا تھا۔ کراچی کے ادیبوں کو بھی اس سانحے پر دلی افسوس ہوا اور ایک دردناک اپیل تیار کی گئی، جس پر کچھ ادیبوں نے دستخط کیے اور کچھ نے انگوٹھے کا نشان ثبت کیا۔ آج کل انھی انگوٹھا چھاپ ادیبوں کا طوطی بول رہا ہے، کیونکہ یہ طوطی بول ہی سکتا ہے، لکھ نہیں سکتا۔ افسوس کہ یہ اپیل اخباروں میں شائع نہیں ہوئی، کیونکہ جن ادیبوں کو اپیل کی اشاعت کا کام سونپا گیا تھا، انھوں نے اسے اس بنا پر تلف کر دیا کہ اس سے عوامی حکومت بدنام ہوگی۔

پھر ان اخباروں میں ایک دلچسپ خبر چھپی، کسی اخبار نویس نے وزیرِ تعلیم سید غلام مصطفی شاہ سے احمد فراز کی برطرفی کا سبب پوچھا تو انھوں نے فرمایا: "میں نے سوچا احمد فراز کو اکیڈمی سے چلے جانا چاہیے، لہٰذا وہ چلا گیا۔" قطع نظر اس سے کہ اس جملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب سوچتے بھی ہیں، یہ جملہ شاہ صاحب کی شخصیت کی عمدہ تصویر پیش کرتا ہے۔ ایک ایسی تصویر، جو غرور، تکبر، فرعونیت اور خود پسندی کے رنگوں سے بنائی گئی ہو۔ ہمارا خیال تھا کہ شاہ صاحب کے اس بیان کی اشاعت کے بعد آمریت کے زمانے میں مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والے ادیب یکجا ہو کر

اس آمرانہ اندازِ گفتگو کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں گے، لیکن کسی طرف سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام "مزاحمتی ادیب" آج کل برسرِ روزگار ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک ہو، جو احمد فراز کے ساتھ ہوا ہے۔

یہ تو تصویر کا ایک رُخ تھا، دوسرا رُخ احمد فراز کے ایک انٹرویو کے ذریعے سامنے آیا، جو پچھلے دنوں انگریزی رسالے "ہیرلڈ" میں شائع ہوا ہے۔ اس انٹرویو میں احمد فراز نے اکیڈمی سے اپنی علیحدگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ سید غلام مصطفی شاہ ذاتی نمود و نمائش کے لیے اکیڈمی کو استعمال کرتے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ماضی قریب میں شاہ صاحب نے قائد اعظم اور علامہ اقبال کے بارے میں جو بد زبانی کی تھی، اس کے خلاف شدید ردِ عمل ہوا تو موصوف نے احمد فراز سے کہا، "ایسے ادیبوں کی خدمات حاصل کرو، جو میرے حق میں لکھیں۔" فراز نے جواب دیا: "اس قسم کے کام اس طرح نہیں ہوتے۔ ادیبوں کی خدمات حاصل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، آپ نے قائد اعظم اور اقبال کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اگر آپ اسے درست سمجھتے ہیں، تو اپنے موقف پر ثابت قدم رہیے اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے خیالات کو صحیح طور پر پیش نہیں کیا گیا تو ایک وضاحتی بیان جاری کر کے اپنے اصل خیالات پیش کر دیجیے۔" شاہ صاحب کو فراز کا یہ جواب پسند نہ آیا، ان کا خیال تھا کہ فراز فوراً کرائے کے ادیبوں کو جمع کریں گے اور اکیڈمی کے فنڈ [illegible] پیش کر کے شاہ صاحب کے حق میں مضامین لکھوائیں گے، لیکن احمد فراز کے جواب نے انھیں مایوس کر دیا۔

[illegible] دامن کے دھبوں کو دھونے کے لیے شاہ صاحب نے دوسرا طریقہ اختیار کیا، انھوں نے اکیڈمی آف لیٹرز کے فنڈ سے پانچ لاکھ روپے اقبال اکیڈمی کے کھاتے میں منتقل کر دیے تاکہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ وہ اقبال کے خلاف نہیں ہیں۔ شاہ صاحب نے قائد اعظم کی شان میں جو گستاخی کی تھی، اس کی تلافی کے لیے قائد اعظم پر ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا گیا۔ اس کے اخراجات بھی اکیڈمی نے برداشت کیے، جو لاکھوں میں تھے۔ احمد فراز نے شاہ صاحب کو سمجھایا کہ اس قسم کی باتوں کے لیے وزارتِ تعلیم کو اپنے وسائل کام میں لانے چاہییں۔ "اکیڈمی کے فنڈز کو صرف ادیبوں پر خرچ کیا جانا چاہیے۔" لیکن شاہ صاحب نے سنی ان سنی کر دی۔

اختلافات کی خلیج اس وقت اور وسیع ہو گئی جب شاہ صاحب نے اپنے ایک جیبی ادارے سندھ گریجویٹس ایسوسی ایشن کے لیے اکیڈمی کی طرف سے ایک لاکھ روپے کے عطیے کا اعلان کیا۔ گویا اکیڈمی نہ ہوئی حلوائی کی دکان ہو گئی، سندھ گریجویٹس ایسوسی ایشن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس غلط بخشی پر احمد فراز نے بقول خود، شدید احتجاج کیا۔ ظاہر ہے ان حالات میں شاہ صاحب یہی سوچ سکتے تھے کہ احمد فراز کو اکیڈمی سے چلے جانا چاہیے، سو ایسا ہی ہوا۔

اس سارے جھگڑے میں غلطی احمد فراز کی ہے، یہ ضیاء الحق کی آمریت کا زمانہ تو تھا نہیں کہ احمد فراز جو چاہتے سو کرتے۔ چھ سال تک غیر ممالک میں آمریت کے خلاف مہم بھی چلاتے رہے اور ضیاء الحق کے دور ہی میں واپس آ کر چھ سال کی تنخواہ بھی یکمشت وصول کر لیتے۔ یہ جمہوریت کا دور ہے، اس میں تو وہی کچھ ہوگا جو جمہوریت کے مائی باپ چاہیں گے۔ ہمارے خیال میں احمد فراز کو شاہ صاحب کے مقابلے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ فنڈ اکیڈمی کا ہے، اگر شاہ صاحب اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، تو اس میں کسی کی گرہ سے کیا جاتا ہے۔

احمد فراز کے مذکورہ انٹرویو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کو ادب اور ادیبوں کے مفادات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ درست نہیں، شاہ صاحب نے ہمیشہ ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لیے سوچا ہے۔ ہم جگہ کی کمی کی وجہ سے صرف ایک مثال پیش کریں گے۔ پچھلے دنوں شاہ صاحب نے اکیڈمی کے سربراہ کی حیثیت سے اعلان کیا تھا کہ اکیڈمی اپنے خرچ پر مرحوم ادیبوں کے مزار تعمیر کرائے گی۔ اس جملے میں جو جہانِ معنی پوشیدہ ہیں، جس کی تفصیل کے لیے تو دفتر کے دفتر درکار ہوں گے، اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے، زندہ ادیبوں کے مزار بنوانے کی اس لیے ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ اکیڈمی کا دفتر ہی کافی ہے، جہاں پہنچ کر ادیب اپنے آپ کو زندہ درگور محسوس کرتے ہیں۔ مرحوم ادیبوں کے مزار بنوانے کا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح مرنے کے بعد ادیبوں کی قدر دانی کی روایت قائم ہوگی۔ ہم اگر زندوں کے حقوق ادا نہ کر سکیں تو کم از کم مُردوں کی دیکھ بھال ضرور کرنی چاہیے۔ یہ نیکی کا کام ہے اور نیکی کبھی ضائع نہیں جاتی۔ نیکی کو دریا میں ڈالنے سے بہتر ہے کہ ادیبوں کے قبرستان میں ڈالی جائے۔

زندہ ادیبوں کی دیکھ بھال ایک معمولی اور آسان کام ہے۔ شاہ صاحب کی مشکل پسند طبیعت کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے ایک بڑے کام کو ہاتھ میں لیا ہے۔ اب اکیڈمی ایک قبر

ادارے کی صورت اختیار کر لے گی اور ادیبوں کے شاندار مزار تعمیر کروائے گی۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ اکیڈمی کا نام اس کے کام سے مناسبت نہیں رکھتا، لہٰذا بہتر ہوگا کہ اسے ''انجمن برائے تعمیر مزارات اہل ادب'' کا نام دے دیا جائے۔ ہمارے خیال میں نام کی تبدیلی مناسب نہیں ہے کہ اکیڈمی موجودہ نام سے خاصی مشہور ہو چکی ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ لفظ بڑھا دیا جائے، جو مزارات کی تعمیر کے کام سے مناسبت رکھتا ہو۔ ہماری تجویز ہے کہ اکیڈمی آف لیٹرز کو اکیڈمی آف ڈیڈ لیٹرز کہا جائے۔

آج کل بہترین مزاحیہ ادب فلیپوں اور دیباچوں کے ذریعے منظرِ عام پر آتا ہے

کتاب پڑھنا، کتاب لکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ جب کوئی شخص کتاب لکھنے کا فیصلہ کر لیتا ہے (اور یہ فیصلہ عموماً قوتِ فیصلہ کی کمی کے باوجود کیا جاتا ہے) تو کاغذ اور قلم کو ایک دوسرے کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ ان دونوں کے گھتم گتھا ہونے کے نتیجے میں سفید کاغذ اچھی طرح زرد و سیاہ ہو جاتا ہے، تو کتاب وجود میں آ جاتی ہے اور جوش صاحب کا یہ قول:

لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں انگلیاں

سچ ثابت ہو جاتا ہے، کیونکہ آج کل کتابیں ذہن کی بجائے انگلیوں ہی کی محنت کا حاصل ہوتی ہے۔

اس کے برعکس کتاب پڑھنا ہفت خوانِ رستم طے کرنے کے مترادف ہے۔ سب سے پہلا مرحلہ تو کتاب خریدنے کا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے، تحت الثریٰ میں محفوظ کیے جانے کے قابل کتابوں کی قیمتیں بھی آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ کتاب کی قیمت اگر سو روپے سے کم ہو، تو عام طور پر ناشر کو کم ہمت، مصنف کو غیر اہم اور خریداروں کو مفلس سمجھا جاتا ہے اور یہ نکتہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ افلاس کا تعلق کتاب کی قیمت سے نہیں، اس کے متن سے ہوتا ہے۔ بہر حال کتاب کی ظاہری خوبصورتی سے متاثر ہو کر کتاب خرید لی جائے اور اسے پڑھنا شروع کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ظاہر و باطن کا فرق انسانوں ہی میں نہیں، کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ پچھلے دس برسوں میں دو چار کتابیں ہی ایسی ہوں گی، جنھیں ہم نے لفظاً بلفظاً پڑھا ہو گا اور

کتاب اور مصنف کا نام دیکھ کر ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر کیا ہو گا اور کیا نہیں ہو گا، گویا ہم لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں۔ بعض کتابیں اس لائق ہوتی ہیں کہ ان کے فلیپ کی عبارتیں پڑھی جا سکتی ہیں اور بعض کے دیباچے بھی لائقِ مطالعہ ہوتے ہیں، بشرطیکہ فلیپ کی طرح وہ بھی دوسروں کے لکھے ہوئے ہوں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آج کل بہترین مزاحیہ ادب فلیپوں اور دیباچوں ہی کے ذریعہ منظرِ عام پر آ رہا ہے۔

کتابیں خرید کر پڑھنے والی بات تو ہم نے تکلفاً عرض کی ہے، ورنہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہمیں کتابیں عموماً تحفۃً ملتی ہیں، جنھیں ہم ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ انھیں پڑھنے کی ہمت اس لیے نہیں ہوتی کہ کردہ گناہوں کی سزا سے خوف آتا ہے۔ لیکن کسی کسی کتاب کے ظاہری محاسن سے متاثر ہو کر دھوکا کھا کر ہم اس کے باطن میں بھی جھانک لیتے ہیں اور اس کا نتیجہ کبھی کبھار خوشگوار بھی ہوتا ہے۔

اس وقت ایک ایسی ہی کتاب ہمارے سامنے ہے، جس کا نام ہے "آئینہ کیوں نہ دوں" اور مصنف کا نام نامی ہے، اظہر حسین صدیقی۔ کتاب کا نام تو ہمارے لیے نیا نہیں، البتہ مصنف کا [illegible] سنا ہے، اگر یہ بھی غالب کے کسی مصرعے کا جزوِ اول یا جزوِ آخر ہوتا، تو ہم اس سے بھی [illegible]۔

مصنف بننے کا عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے اخباروں کے ادبی صفحے پر اپنا نام اچھالا جاتا ہے، پھر ادبی رسالوں میں ان کے مدیروں کی تعریف میں خطوط چھپوائے جاتے ہیں اور آخر میں ان [illegible] کر تخلیقات شائع کرائی جاتی ہیں۔ اظہر حسین صدیقی نے یہ طویل راستہ [illegible] راست اقدام کے ذریعہ ایک عدد کتاب کے ساتھ ادبی دنیا پر حملہ آور ہوئے [illegible] طرح کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جو مالِ غنیمت سمیٹ کر واپس چلے جاتے ہیں اور [illegible] کے بعد خطۂ غیر میں مستقل طور پر آباد ہو جاتے ہیں۔ اظہر صاحب دوسری طرح [illegible] معلوم ہوتے ہیں، ادبی دنیا میں وہ مستقل طور پر بود و باش کا ارادہ رکھتے ہیں۔

[illegible] مصنف کے ذاتی حالات سے واقف ہونا چاہا، تو کتاب نے کوئی رہنمائی نہ کی۔ [illegible] پوچھا، تو صرف اتنا معلوم ہوا کہ موصوف "جنگ" کراچی میں "[illegible]" کے [illegible] سے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھتے رہے ہیں اور انکم ٹیکس کے محکمے میں اعلیٰ عہدے پر

فائز رہے ہیں۔ اس کے بعد مزید کچھ جاننے کی ضرورت نہ رہی، کیونکہ اکثر ٹیکس والے دوسروں پر ٹیکس لگانے یعنی انھیں اذیت پہنچانے کے عادی ہوتے ہیں، اسی عادت کے تحت کبھی کبھی وہ کتابیں بھی لکھ دیتے ہیں۔ لیکن اظہر صاحب کی کتاب پڑھ کر اندازہ ہوا کہ یہ محکمانہ عادت کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ یہ ان کے صاف ستھرے ادبی ذوق کی آئینہ دار ہے، اس کا مقصد اذیت رسانی نہیں، مسرّت خیزی ہے۔

یہ کتاب ان طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، جو مصنف نے گزشتہ ۱۰۔۱۵ برسوں میں وقتاً فوقتاً لکھے ہیں۔ ان مضامین کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بے شمار معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، جن میں ادب اور سیاست بھی شامل ہیں۔ معاشرے کے بہت سے تاریک پہلوؤں اور منافقانہ رویوں پر پڑے ہوئے تہ در تہ نقاب اس ہنرمندی سے اٹھائے گئے ہیں کہ مصنف کے مشاہدے کی گہرائی اور انداز تحریر کی دلکشی کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ وہ معاشرتی برائیوں کی نشاندہی اس طرح نہیں کرتے، جس طرح انسداد منشیات کے اشتہاروں میں کی جاتی ہے، یعنی خوف ناک اور عبرت انگیز انجام سے ڈرا کر برائیوں کی بیخ کنی کی دعوت نہیں دیتے، بلکہ وہ مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر کے قاری کو مثبت انداز میں سوچنے کی راہ دکھاتے ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے، لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔

اوپر کے پیراگراف میں ہم نے کتاب اور مصنف کی اتنی تعریف کر دی ہے کہ اپنے لکھے پر ہمیں کسی پیشہ ور دیباچہ نگار کی تحریر کا گمان ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ کتاب کا ایک آدھ اقتباس دعوے کے ثبوت کے طور پر پیش کر دیا جائے، تاکہ یہ کوئی نہ کہہ سکے کہ ہم جب کسی مصنف کے عیب گنواتے ہیں، تو بے شمار ثبوت پیش کرتے ہیں اور تعریف کرتے ہیں تو دعویٰ ثبوت کے بغیر ہوتا ہے۔

آج کل شادیوں میں ویڈیو فلم بنانے کا ایسا رواج ہو گیا ہے کہ شادی کا مقصد خانہ آبادی سے زیادہ فلم سازی نظر آنے لگا ہے۔ اس سلسلے میں جناب مصنف لکھتے ہیں......

"شادی بیاہ میں نکاح کی تقریب تو ایک ثانوی سی شے ہو کر رہ گئی ہے، جب کہ اصل تقریب فوٹو اور ویڈیو فلم کی تیاری ہے۔ کیونکہ فلم بنانے والے کے بغیر نہ تو برات روانہ ہو سکتی ہے اور نہ نکاح ہو سکتا ہے۔ ہم خود ایک ایسی تقریب نکاح میں شریک ہو چکے ہیں، جہاں ویڈیو فلم بنانے والے کے وقت پر نہ پہنچنے کے سبب تمام تقریب مع تفصیلات کے دوبارہ منعقد ہوئی ...... ان

[illegible] کو دیکھتے ہوئے ہم نے یہ طے کیا ہے کہ آئندہ بچوں کی شادی کی تقریب کے کارڈ کا مضمون کچھ اس طرح ہوگا۔

محترمی! ہمارے بیٹے کی ویڈیو فلم بننا طے پایا ہے۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی تقریب نکاح بھی ہوگی، ہم آپ کے بے حد ممنون ہوں گے، اگر آپ اس تقریب سعید میں شرکت فرما کر ہمیں فلم بنانے کا موقع دیں گے اور ہمارے اہل خانہ کے ساتھ فلم سازی میں شریک ہوں گے۔

نوٹ۔ فلم رنگین بنے گی، اس لیے گزارش ہے کہ لباس اسی مناسبت سے پہن کر آئیں۔"

مصنف سے ہمیں ایک شکایت ہے کہ انھیں خامہ فرسائی کا ضرورت سے زیادہ شوق ہے۔ [illegible] یہ کہ پوری کتاب انھوں نے خود ہی لکھی ہے، بلکہ سرورق پر جہاں خالی جگہ نظر آئی [illegible] بھی اپنے ارشادات و ملفوظات سے پُر کر دیا ہے۔ دیباچہ اور فلیپ عموماً مشاہیر ادب سے لکھوائے جاتے ہیں، تاکہ کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو، یہ چیزیں جناب مصنف نے خود ہی لکھی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کتاب کی صرف قیمت ہی میں اضافہ ہو سکا، قدر کا معاملہ التوا میں پڑ گیا۔

دائیں طرف کے فلیپ پر جناب مصنف لکھتے ہیں......

"دستور کے مطابق کتاب کے فلیپ پر ممتاز دانشوروں اور نامور ادیبوں کی آرا کتاب اور [illegible] کتاب کے بارے میں چھپنا ضروری ہیں۔ اول تو کوئی مستند نقاد اور ادیب ہمارے اور [illegible] کتاب کے بارے میں لکھ کر ادب میں اپنا نام کھونے پر تیار ہی نہیں ہوا، البتہ کچھ لوگوں کو ہم [illegible] کرنے کی کامیاب دھونس دے کر راضی بھی کر لیا تھا، مگر جتنی تعریف ہم چاہتے [illegible] کرنے پر تیار نہیں ہوئے، اس درمیان میں یہ ہوا کہ...... ہمارا ضمیر ایک دم جاگ اٹھا اور اس [illegible] اپنے ذرا سے فائدہ کی خاطر کیوں دوسروں کو خوار کراتے ہو۔ اور ہم نے پہلی دفعہ بے [illegible] اس کی بات مان لی اور فلیپ نہیں لکھوایا۔"

اظہر صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ آج کل فلیپ نگاری کی "صنعت" خاصی ترقی کر چکی [illegible] ممتاز دانشور اور نامور ادیب موجود ہیں، جنھوں نے فلیپ لکھنے کی سوا کوئی دوسرا [illegible] کیا، بلکہ یہ کام بھی وہ خود نہیں کرتے، صاحب کتاب ہی سے فلیپ لکھواتے ہیں اور [illegible] کے منسوب کر دیتے ہیں۔ اظہر صاحب نے ضمیر کے جاگنے والی جو بات کہی ہے اسے [illegible] بیان کہنا چاہیے۔ دوسروں سے چند سطریں لکھوانے پر جن کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے،

حیرت ہے کہ خود پوری پوری کتابیں لکھ دیتے ہیں، مگر ضمیر سوئے کا سویا ہی رہتا ہے۔

دوسرے فلیپ پر اظہر صاحب نے اپنے کوائف ان الفاظ میں درج کیے ہیں……

"فلیپ کے اس حصے پر آج کل کے رواج کے مطابق مصنف کا سنِ پیدائش (اب اتنی پرانی باتوں کا کیا ذکر کرنا) جائے پیدائش (جو سارے جھگڑوں کی جڑ ہے)……اس کا پیشہ (جو کوئی قابلِ فخر بات نہیں ہے)…… یہ تمام باتیں لکھی جانی ضروری خیال کی جاتی ہیں، ہمارا خیال ہے کہ صرف کتاب ضروری ہے، سو وہ حاضر ہے۔"

ہمارے خیال میں یہ سطریں لکھ کر بلا ضرورت مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر مصنف کو اپنا سالِ پیدائش ضرور بتا دینا چاہیے، ورنہ جس طرح علامہ اقبال کے سالِ پیدائش پر محققوں میں طویل معرکہ آرائیاں ہو چکی ہیں ویسی ہی معرکہ آرائیاں ہر مصنف کے سالِ پیدائش کے مسئلے پر ہوتی رہیں گی، نتیجتاً اس کی پیدائش ہی مشکوک ہو کر رہ جائے گی۔ ہر مصنف کو اپنی جائے پیدائش بھی ضرور ظاہر کر دینی چاہیے، اس طرح مصنف کی اولاد کو بیروزگار ہونے کی صورت میں یہ معلوم ہو جائے گا کہ بیروزگاری کا سبب کوٹا سسٹم نہیں، غلط جائے پیدائش ہے۔ ہر مصنف کو اپنا اصل پیشہ بھی ضرور بتا دینا چاہیے تاکہ پڑھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ موصوف کس قسم کی پریشانیوں کی وجہ سے اپنے پیشہ ورانہ فرائض کو نظرانداز کر کے ادب کی خدمت فرما رہے ہیں۔

مذکورہ اقتباس کا آخری جملہ ("صرف کتاب ضروری ہے، سو وہ حاضر ہے") بھی لکھنے والے کی خوش فہمی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور بڑی حد تک مبہم ہے۔ مصنف کو صاف صاف بتانا چاہیے تھا کہ کتاب کی اشاعت کس کے لیے ضروری ہے، خود اس کے لیے۔ یا دوسروں کے لیے جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے اس کی اکثریت تو دیوانِ غالب کو بھی غیر ضروری سمجھتی ہے۔

سرورق کے بائیں جانب کے صفحے پر ایک خالی چوکھٹا چھاپا گیا ہے اور اس کے نیچے مصنف نے تفصیل سے بتایا ہے کہ انھوں نے اپنی تصویر سے چوکھٹے کی عزت افزائی کیوں نہیں کی، انھوں نے اگرچہ اس کی کئی معقول وجوہ بیان کی ہیں، لیکن اصل وجہ نہیں بتائی۔ اصل وجہ وہی ہے، جو ہم کچھ عرصہ قبل کسی دوسری کتاب پر تبصرہ لکھتے ہوئے بیان کر چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ…… ہمارے بیشتر مصنف اپنی جو تصویریں چھپواتے ہیں انھیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ شاید پولیس کے ریکارڈ سے نکال کر چھپوائی گئی ہے۔

کشور ناہید کی سالگرہ کا جشن

کوئی کچھ بھی کہے، ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ پاکستان میں کشور ناہید سے زیادہ نمایاں ادبی شخصیت کوئی نہیں ہے، وہ صفِ اول کی شاعرہ، صفِ دوئم کی نثر نگار، صفِ سوم کی ایڈیٹر اور صفِ چہارم کی مترجم ہیں، گویا دنیائے ادب کی ساری صفوں پر انھی کا قبضہ ہے۔ ادب سے ہٹ کر بھی ان کے کمالات کا اظہار ہوا ہے، وہ ایک سرکاری عہدے پر فائز ہیں اور مارشل لاء کی زیادتیوں کی برسرِعام مذمت کرنے کے باوجود مارشل لاء ہی کے دور میں وہ درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے اس عہدے تک پہنچی ہیں۔ پاکستان میں حقوقِ نسواں کے حصول کے لیے انھوں نے بڑی جدوجہد کی ہے، اگرچہ وہ عورتوں کو ان کے حقوق نہیں دلا سکیں، لیکن اس بہانے بین الاقوامی مذاکروں میں شرکت کے لیے کئی ملکوں کی سیاحت کر چکی ہیں، جس سے ان کے تجربات و مشاہدات میں اضافہ ہوا ہے۔ ان تجربات و مشاہدات نے ان کی شاعری میں گہرائی بھی پیدا کی اور گیرائی بھی۔

ہر بڑے آدمی کے مداح بھی ہوتے ہیں اور بدخواہ بھی۔ حلیف بھی ہوتے ہیں اور حریف بھی۔ اس معیار سے دیکھا جائے تو کشور ناہید کو بڑے آدمیوں میں شمار کیے بغیر بات نہیں بنتی۔ انھیں جہاں ایک بہت بڑے حلقے میں پسند کیا جاتا ہے، وہیں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کشور ناہید کی شہرت و مقبولیت سے خائف ہو کر ان کی مخالفت پر کمربستہ ہے۔ اس حلقے میں بیشتر وہی لوگ شامل ہیں جو پہلے کشور ناہید کے مداح تھے، لیکن جب مداحی کرتے کرتے تھک گئے تو محض تبدیلی کے لیے مخالف کیمپ میں جا بیٹھے۔ لیکن کشور ناہید مخالفوں کی پروا نہیں کرتیں، اپنے مداحوں کے درمیان مگن رہتی ہیں۔ ویسے انھیں ملامتوں کے درمیان مگن رہنا بھی آتا ہے، اسی

لیے انھوں نے اپنے ایک مجموعے کا نام ”ملامتوں کے درمیان“ رکھا ہے۔

پچھلے دنوں لاہور میں کشور ناہید کی پچاسویں سالگرہ دھوم دھام سے منائی گئی۔ ایک جلسہ ہوا، جس میں ادبی اور غیر ادبی مشاہیر نے جھولیاں بھر بھر کر خراج عقیدت پیش کیا۔ کراچی میں بھی ان کے عقیدت مندوں نے آصف فرخی کی صدارت میں ایک تقریب منعقد کی، جس میں کشور ناہید کے فکر و فن پر گفتگو ہوئی۔ اس تقریب میں طاہر مسعود نے یہ تجویز پیش کی کہ آئندہ ہر سال کشور ناہید کی سالگرہ پر عام تعطیل ہونی چاہیے، کیونکہ وہ قومی اہمیت کی شاعرہ ہیں۔ اس موقع پر ایک کتاب بھی شائع کی گئی ہے، جس کا نام ”نئے زمانے کی برہمن“ ہے اور جسے اصغر ندیم سید نے مرتب کیا ہے۔ اس وقت یہی کتاب ہمارے سامنے ہے۔ اس میں دو تین مضمون نئے اور غیر مطبوعہ ہیں اور باقی سب پرانے اور مطبوعہ ہیں۔ نئے مضمون اگر ہمیشہ غیر مطبوعہ ہی رہتے تو اچھا تھا۔ پرانے مضامین میں سے بعض اپنے مطالب کے اعتبار سے اتنے پرانے ہیں کہ کشور ناہید کی پیدائش سے پہلے کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، شاید انھیں تبرکاً شامل کر لیا گیا ہے، ورنہ [illegible] حسن اور مختار صدیقی کے مضامین میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ انھیں دوبارہ شائع کیا جاتا۔ کچھ اخباری تبصروں اور کالموں کو بھی مضامین کی صورت دے دی گئی ہے، جن میں جملے بازی تو ہے، کام کی باتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کتاب کے پچیس مضامین میں سے پندرہ کتاب کی ضخامت بڑھانے کے لیے اور باقی دس کشور ناہید کو آگے بڑھانے کے لیے ہیں۔ کشور ناہید جیسی باکمال اور صحت مند شاعرہ کو ان بیساکھیوں کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ ایک غیر روایتی شاعرہ پر ایسی روایتی تنقید اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئی۔

کتاب کی ضخامت کا چھٹا حصہ (تقریباً پچاس صفحے) باقر مہدی کی جولانی طبع کا آئینہ دار ہے۔ ان کا مضمون جتنا طویل ہے، مطالب کے اعتبار سے اتنا ہی مختصر ہے۔ باقر مہدی جدید دور کے اہم نقاد ہیں۔ انھوں نے اپنے بیشتر مضامین میں جس تنقیدی بصارت اور بصیرت سے کام لیا ہے، اس سے ان کا زیر نظر مضمون محروم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کشور ناہید پر لکھنے کا فیصلہ تو کر لیا، لیکن یہ فیصلہ نہ کر سکے انھیں کیا لکھنا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا مضمون منتشر خیالی کا مرقع بن گیا۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ کشور ناہید نے دوسرے ملکوں کے شاعروں کے جو نثری ترجمے کیے ہیں، ان کے اقتباسات بھی باقر مہدی نے اس فراخ دلی اور کشادہ دستی سے درج کیے ہیں

جیسے یہ کشور ناہید کا طبع زاد کلام ہو۔ یہی نہیں، کشور ناہید کی عظمت کی جو دلیلیں دی ہیں، ان میں ”ماہ نو“ کی ادارت اور پاکستان نیشنل سینٹر کی سربراہی کو بھی شامل کر لیا ہے۔ کشور ناہید کے دوسرے مجموعہ کلام ”بے نام مسافت“ میں ”زیاں کوش“ اور ”ہم دوش“ جیسے الفاظ کے استعمال سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ ”راشد کے اثر کو قبول کرتی جا رہی ہیں۔ وہی فارسی آمیز خوبصورت لب و لہجہ، وہی تراکیب اور الفاظ کی نشست و برخاست۔“ (ص ۵۶) قطع نظر اس سے کہ کہاں راشد اور کہاں کشور ناہید، یہ پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ انسانوں کی طرح لفظ بھی نشست و برخاست سے تعلق رکھتے ہیں۔ ”نشست“ کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ لفظ مصرعے میں بیٹھ جاتے ہیں، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ لفظوں کی ”برخاست“ کیا ہوتی ہے۔ ممکن ہے باقر مہدی نے ان لفظوں کی طرف اشارہ کیا ہو جنھیں کشور ناہید نے اپنی شاعری سے برخاست کر دیا ہے، یعنی استعمال نہیں کیا۔

باقر مہدی عموماً کھردرے اور خشک لہجے میں تنقید کرتے ہیں، لیکن زیر نظر مضمون میں انھوں نے نرم و نازک اور تر لہجے میں بات کی ہے۔ بات کیا کی ہے، شاعری کی ہے۔ فرماتے ہیں:

”سب سے خوبصورت اس کا (کشور ناہید کا) انداز اظہار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، بادلوں سے واقعی خوش بودار رس بھرے پھول برس رہے ہوں۔“ (ص ۷۸)

باقر مہدی نے تنقید نہیں لکھی، ”رس بھرے پھول“ برسائے ہیں۔

تنقید کا ایک اور انداز بھی دیدنی ہے۔ فرماتے ہیں……

”ملامتوں کے درمیان ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ مجھے مجموعہ اتفاق سے مل گیا تھا۔ ایک اردو نقاد کے پاس اس مجموعے کی کئی جلدیں تھیں۔ انھوں نے یہ کہہ کر مجھے عنایت کیا کہ تمھیں کشور ناہید [illegible] اس لیے یہ کتاب لے جاؤ۔ ظاہر ہے میں شکریے کے علاوہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ اتفاق سے [illegible] سے سر شام بڑے شہروں میں مدتوں بعد ملاقات ہو جائے، تو جی چاہتا ہے کہ دیر تک اس کی باتیں سنتے رہیں۔ میں نے اسی شام یہ کتاب پڑھ ڈالی اور یہ جان کر خوش ہوا کہ زندگی میں ان کی اہمیت ہمیشہ رہے گی۔“ (ص ۸۲)

باقر مہدی نے جس اردو نقاد کا ذکر کیا ہے، وہ ضرور کوئی کتب فروش ہوگا، ورنہ ایک سے زیادہ جلدیں رکھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ بہر حال وہ کچھ بھی ہو سخن فہم ضرور تھا کہ اس نے کتاب کا ایک نسخہ باقر مہدی کو دے دیا۔ باقر مہدی نے اگرچہ نقاد کا شکریہ بروقت ادا کر دیا تھا، لیکن ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعے پر لکھتے ہوئے بھی باقر مہدی ''اظہار تشکر'' کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

ہمارے نقاد عموماً مختصر مقالے لکھتے ہیں، لیکن جب کسی شاعرہ کو موضوع بناتے ہیں تو اختصار سے کام نہیں لیتے۔ عشرت آفریں پر سردار جعفری اور پروین شاکر پر نظیر صدیقی نے طومار نویسی کا جو ریکارڈ قائم کیا تھا، باقر مہدی نے اسے توڑ دیا ہے، جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

شہرت بخاری کا مقالہ بھی ''اظہار تشکر'' کے ذیل میں آتا ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ جب وہ اپنا ذاتی مکان بنوا رہے تھے تو مالی مشکلات کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔ کشور ناہید اس کڑے وقت میں کام آئیں اور ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے قرض دلوا دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کشور ناہید دردمند خاتون ہیں اور وہ دوسروں کی پریشانیوں میں ہمدردی کا عملی اظہار کرتی ہیں۔ لیکن شہرت بخاری نے اظہار تشکر کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں......

''بعض لوگوں کا احساس، جو ان کے تجربے کی بنیاد پر ہے، مجھ سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ منافقت کا لفظ تو بہت سخت ہے، البتہ کشور ناہید اتنی بھی معصوم نہیں، جتنا تم بیان کر رہے ہو۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی کو ناراض نہ ہونے دے۔ ہر ایک سے اس انداز میں ملتی ہے کہ ہر کسی کو یہ غلط فہمی رہتی ہے کہ وہ میری دوست ہے، میری بہی خواہ ہے۔ اس سلسلے میں اس کو اگر کسی کی غیبت کرنی پڑے، تو کر گزرتی ہے۔ وہ ''تیری تیرے منھ پر اور میری میرے منھ پر'' کے مسلک کی خاتون ہے۔ میں ان حضرات کی اس رائے سے جزوی طور پر اتفاق کرتا ہوں۔ یعنی پہلی بات میں نے بھی محسوس کی ہے کہ وہ کسی سے بگاڑ پیدا نہیں کرتی، تو اس میں عیب کی کیا بات ہے، یہ تو ہنر ہے...... رہا غیبت کا سوال تو یہ بات کہنے والے بھول جاتے ہیں کہ کشور ناہید ایک عورت ہے، اور عورت، عورت نہیں ہوتی اگر غیبت کی نعمت سے محروم رہے۔'' (ص ۳۳)

شہرت بخاری کو جو کچھ خود کہنا تھا اسے بزبانِ دیگراں بیان کر کے بظاہر جزوی تائید کی ہے، جو در اصل مکمل تائید ہے۔ یہی نہیں، انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ کشور ناہید ''خوشامد پسند ہو گئی ہے۔ ایسا ہونا فطری ہے، مگر ڈر یہ لگتا ہے کہ یہ چیز کہیں اس کے زوال کا باعث نہ ہو جائے۔ لکھنے والے کے اردگرد جب بھی مصنوعی مداحین کا اجتماع ہونے لگتا ہے، اس کا ہنر منفی طور پر متاثر ہو جاتا ہے۔ وہ اتنی مشہور ہو چکی ہیں کہ اسے قناعت کرنی چاہیے مگر دولت اور شہرت ایسی چیزیں ہیں کہ ان میں اضافے کے لیے مزید کوشش نہ کرنا اور قناعت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اتنے قوی اعصاب کم لوگوں کے ہوتے ہیں۔''

شہرت بخاری نے بڑی خوبصورتی سے کشور ناہید کے خوشامد پسند ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ وہ دولت اور شہرت کے پیچھے بھاگتی ہیں۔ جو کچھ انھیں مل چکا ہے اس پر قانع نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں بخاری صاحب نے کشور ناہید کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ہر وہ شخص جو خوشامد پسند ہوتا ہے، بنیادی طور پر خوشامدی بھی ہوتا ہے۔ ایک طرف وہ اپنی جھوٹی انا بھی کی تسکین کرتا ہے تو دوسری طرف دوسروں کے نفس امارہ کو غذا بہم پہنچاتا ہے۔ کشور ناہید کی بے باکی ضرب المثل ہے۔ ایسا شخص خوشامد پسند ہو سکتا ہے، نہ خوشامدی۔ جہاں تک دولت اور شہرت کا تعلق ہے، کشور ناہید نے ان دونوں کا کبھی پیچھا نہیں کیا۔ یہی دونوں کشور ناہید کے پیچھے ماری ماری پھرتی ہیں۔ دولت سے مراد اگر دولتِ سخن ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ شہرت بخاری کے مقابلے پر کشور ناہید زیادہ دولت مند ہیں۔ معلوم نہیں کہ اتنی دولت کا وہ کیا کریں گی، اگر اس کا کچھ حصہ وہ مستحقین میں تقسیم کر دیں، تو یہ ثواب کا کام ہوگا۔

دورِ دوم

ساڑھے تین سال قبل ہم نے کالم نگاری کو اس ارادے کے ساتھ ترک کیا تھا کہ اب دوبارہ اس کوچۂ رسوائی میں قدم نہ رکھیں گے۔ لیکن جب رسوائی مقدر بن چکا ہو تو انسانی ارادے کی حیثیت ہی کیا! ہم سمجھتے کہ کالم نگاری ترک کر کے سکون و عافیت کی زندگی بسر کریں گے مگر اس طرح تو رہا سہا سکون بھی غارت ہو گیا۔ کیونکہ جو بھی ملتا تھا، یہی پوچھتا تھا کہ اس ترکِ ادب یا ترکِ لذات کا سبب کیا ہے؟ بقول احمد فراز، ہم کس کس کو جدائی کا سبب بتاتے اور کہاں کہاں تک بتاتے، لہٰذا سوال کرنے والوں کو مطمئن کرنے کے لیے ہم کوچۂ رسوائی میں واپس آ گئے ہیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ سوال کرنے والے مطمئن نہیں ہوں گے، وہ اب ہماری واپسی کا سبب پوچھیں گے۔

کالم نگاری چھوڑنے کے بے شمار اسباب تھے۔ سب سے بڑا سبب تو ہم خود تھے کہ ہمیں اپنے کالموں میں یکسانیت نظر آنے لگی تھی۔ جیسے ہمارے کالم نہ ہوں مشکور حسین یاد کے انشائیے ہوں۔ ایک ہی جیسی باتیں اور ایک ہی جیسا انداز اور ایک ہی جیسے لوگوں کا تذکرہ ہوتا تھا۔ وہی انیس ناگی، وہی ساقی فاروقی، وہی ڈاکٹر انور سدید، وہی ڈاکٹر سلیم اختر، وہی بشیر بدر، وہی باقر مہدی۔ اور حد تو یہ ہے کہ وہی استاد لاغر مراد آبادی، جن کے سامنے ہم نے اپنے کالموں کی یکسانیت کا مسئلہ پیش کیا تو انھوں نے فرمایا، اردو ادب کی دنیا محدود ہے۔ جب اسی میں وسعت اور تنوع نہیں ہے تو آپ کے کالموں میں نئی بات کہاں سے آئے گی۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، بس اپنا فرض ادا کرتے رہیے۔ ہم نے پوچھا، ہمارا فرض کیا ہے؟ فرمایا، یہی کہ ایک ہی جیسی باتیں ایک ہی جیسے انداز میں لکھتے رہیے۔

کالم نگاری چھوڑنے کا دوسرا سبب یہ تھا کہ فرمائشوں نے ہمیں پریشان کر دیا تھا۔ بلا مبالغہ درجنوں کتابیں اس فرمائش کے ساتھ موصول ہوتیں کہ ہم ان پر اظہار خیال کریں۔ ظاہر ہے کہ ہر کتاب اس لائق نہیں ہوتی کہ اظہار خیال کیا جائے، کیونکہ اکثر کتابیں تو اخفائے خیال کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں۔ نیز کالم میں اتنی گنجائش کہاں سے آئے کہ ہر مصنف کی خواہش پوری کی جائے۔ ظاہر ہے کہ ہم منتخب کتابوں سے ہی انصاف کر سکتے تھے اور پھر انصاف کا معیار بھی ہمارا خود ساختہ ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ جن کتابوں سے انصاف کرنے کی نوبت نہیں آتی تھی، ان کے مصنّفین ناراض ہو جاتے تھے اور ناراضی بھی اتنی شدید ہوتی تھی کہ وہ ہمیں ذہنی اذیت پہنچانے کے لیے اپنی مزید تصانیف بھیجتے رہتے تھے۔ طرفہ تماشا یہ کہ جن کتابوں پر ہم طبع آزمائی کرتے تھے، ان کے مصنّفین بھی ہم سے خوش نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ بعض تو اس حد تک ناخوش ہو جاتے تھے کہ قانونی کارروائی کی دھمکیاں دینے لگتے تھے۔ ایک آدھ نے وکیل کے ذریعے نوٹس بھی بھجوا دیا۔ کراچی میں مستقل قیام کی وجہ سے ہم لاقانونیت سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا قانون سے ڈرتے ہیں۔ وہ تو خدا بھلا کرے ''تکبیر'' کے مدیر محترم محمد صلاح الدین کا، کہ انھوں نے نوٹس کا جواب بھجوا دیا اور بات آئی گئی ہو گئی، ورنہ کالم نویسی شروع کرنے کی بجائے اب تک ہم کالم کی قسطیں ادا کر رہے ہوتے یا قسطوں کی عدم ادائیگی کی صورت میں کسی ''کنج تنہائی'' میں محسن بھوپالی کی حکایات پڑھ رہے ہوتے کہ ہم جیسے ایسی ہی عبرتناک قید با مشقت کے مستحق ہیں۔ ایسی باتوں کی وجہ سے تو ہم کالم نگاری کو کوچۂ رسوائی کہتے ہیں۔

کالم نگاری ترک کرنے کا تیسرا اور سب سے اہم سبب یہ ہوا کہ مشتاق احمد یوسفی کی کتاب آبِ گم شائع ہو گئی۔ اس کتاب کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ نثر کیسے لکھی جاتی ہے اور طنز و مزاح کسے کہتے ہیں۔ یوسفی صاحب کو ہم عموماً نہیں پڑھتے کہ کہیں ان کی چال چلنے کی کوشش میں ہم اپنی چال بھی نہ بھول جائیں۔ لیکن شامت اعمال سے ہم نے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی اس رائے کو پڑھا کہ پچھلے برسوں میں اردو نثر میں ''آبِ گم'' جیسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ یہ کتاب پڑھ ڈالی۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد ہم پروفیسر صاحب کی رائے سے اس حد تک متفق ہوئے کہ خود اپنی تصانیف پر برسوں پہلے لکھی ہوئی کتابوں کا گمان ہونے لگا اور خود اپنی تحریریں ہمیں ان کی تحریریں نظر آنے لگیں جن کو لکھنے سے باز رکھنے کے لیے ہم کالم لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ

"آپ گم" کی موجودگی میں ہم جیسوں کا طنزیہ و مزاحیہ کالم لکھنا ایسا ہی ہے جیسے اقبال صفی پوری کا سہگل کی طرز میں غزلیں گانا۔

نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر یوسفی صاحب سے یہ عرض کر دیا جائے کہ آپ ضرور لکھیے، مگر ایسا بھی کیا کہ دوسروں پر لکھنے کے سارے راستے بند کر دیے جائیں۔ کبھی کبھار منھ کا مزہ بدلنے کے لیے ایک آدھ چیز ہمارے معیار کی بھی لکھ دیا کیجیے تاکہ کہا جا سکے کہ کرنل محمد خان کی طرح یوسفی صاحب بھی ترقی معکوس کو برا نہیں سمجھتے۔

یہ تو ہوئے اسباب ترک اور ترک ترک کا سبب یہ ہے کہ ہمارے بعض قارئین ایسے بھی ہیں جو ہماری دائمی مفارقت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ وہ اکثر ہمیں اپنے حصار عافیت سے باہر نکلنے کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔ ہم لاکھ سمجھاتے ہیں کہ جب غالب خستہ کے بغیر کام بند نہیں ہوئے تو ہمارے نہ لکھنے سے کیا فرق پڑے گا۔ ہم خستہ نہیں واماندہ و درماندہ بھی ہیں۔ مگر ہماری بات کسی نے نہیں سنی۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ استاد لاغر مرادآبادی نے بھی لعن طعن کی اور فرمایا، جب نثری نظم لکھنے والوں اور ساختیات و پس ساختیات کی پھلجھڑی چھوڑنے والوں کو کوئی نہیں ٹوکتا تو آپ کالم لکھنے سے کیوں شرماتے ہیں۔ لکھنے سے پہلے شرمانے سے بہتر ہے کہ آدمی لکھنے کے بعد نادم ہو، تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ندامت بلاسبب ہے۔ یہ دلیل ایسی تھی کہ سر تسلیم خم کیے بغیر چارہ نہ رہا۔

استاد گرامی نے بیکار بیٹھنے کی جو بات کی ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ ہم اپنے عہد رہائی یعنی کالم نہ لکھنے کے زمانے میں بیکار نہیں رہے۔ کیونکہ یہ زمانہ بھی کالم نگاری کے کھاتے میں درج ہوا۔ اس ابہام کی توضیح یہ ہے کہ مکتبۂ جامعہ دہلی کے شاہد علی خاں صاحب ہمارے کرم فرما ہیں اور اپنے رسالے "کتاب نما" کے ذریعے ہمارے کالموں کو ایک بہت بڑے حلقے تک پہنچاتے رہے ہیں۔ ہندوستان کے ادبی حلقوں میں ہماری باریابی خان صاحب ہی کی مرہون منت ہے۔ اگر وہ ساڑھے چھ برسوں تک باقاعدگی سے ہر مہینے ہمارا کالم شائع نہ کرتے تو آج ہندوستان میں ہمیں جاننے والے اتنے بھی نہ ہوتے کہ ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے۔ اب خدا کے فضل سے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

شاہد علی خاں صاحب نے فرمائش کی، اب آپ فارغ ہیں تو اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے

ہوئے اپنے کالموں کا ایک انتخاب تیار کر دیجیے تاکہ اسے آپ کی پہلی اور آخری یادگار کے طور پر شائع کر دیا جائے۔ گویا خان صاحب یہ چاہتے تھے کہ کالم نگار اپنے کام سے گیا ہے تو گیا، ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ ان کی یہ تجویز ہمیں پسند آئی کہ بغیر محنت کے صاحب کتاب بننے کا موقع مل رہا تھا۔ "تکبیر" میں چھپے ہوئے کالموں کو جمع کیا، ان پر ایک نظر ڈالی۔ اندازہ ہوا کہ سبھی کالم سراپا انتخاب ہیں بشرطیکہ ناقابل انتخاب کالموں کا مجموعہ چھاپنا ہو۔ ظاہر ہے "آپ گم" کے مطالعے کے بعد یہی ہونا تھا!

اس مرحلے پر اردو کے منفرد نقاد مظفر علی سید نے ہماری دستگیری کی اور انتخاب کی ذمہ داری قبول کر لی۔ ہماری حوصلہ افزائی کے خیال سے انھوں نے فرمایا، کوئی مصنف اپنی تحریروں کا انتخاب خود نہیں کر سکتا، کیونکہ اسے اپنی ہر تحریر "عالم میں انتخاب" اور آپ کو "کالم میں انتخاب" نظر آتی ہے۔ میں انتخاب کروں گا تو یہ نہیں دیکھوں گا کہ اچھا کالم کونسا ہے اور برا کون سا۔ میں تو اس پر نظر رکھوں گا کہ کون سا کالم کم برا ہے اور کون سا زیادہ۔ اس طرح ایک اچھا انتخاب آسانی سے مرتب ہو جائے گا۔

انتخاب مرتب کرنے کا یہ کڑا معیار سید صاحب ہی کے بس کی بات ہے کیونکہ ان کی نگاہ خوبیوں سے زیادہ عیبوں کی قدرداں ہے۔ اور پھر اس معاملے میں وہ خاصے تجربہ کار بھی ہیں۔ اس کا ثبوت نظیر صدیقی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا وہ انتخاب ہے جو سید صاحب نے مرتب کیا تھا اور چند سال پہلے شائع ہو چکا ہے۔ شاید اسی انتخاب کی وجہ سے لوگ بھول چکے ہیں کہ نظیر [illegible] صرف نقاد نہیں، طنز و مزاح میں بھی رواں ہیں۔ ایسا ہونا چاہیے تھا۔ کسی نقاد کو اس کی [illegible] نہیں کہ وہ تنقیدی مقالات رقم کرتے ہوئے الگ سے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے۔

سید صاحب نے نہایت توجہ اور محنت سے ہمارے کالموں کو پڑھا اور ان تمام کالموں کو [illegible] کر دیا جو ان کی پسندیدہ شخصیات کے بارے میں تھے۔ یہاں تک کہ وہ کالم بھی ان کے [illegible] جو خود ان کے اعزاز میں لکھا گیا تھا اور جس میں ان کے وزیٹنگ کارڈ کو ان کی [illegible] مستقل تصنیف قرار دیا گیا تھا، اور تصنیف بھی ایسی جس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہوں۔ [illegible] پایا تھا کہ سید صاحب کے مسترد کردہ کالموں کو بطور انتخاب شائع کر دیا جائے تاکہ ان کی [illegible] کارکردگی کا دستاویزی ثبوت لوح جہاں پر حرف مکرر کی طرح باقی رہ جائے، لیکن

اس قسم کے کالم تعداد میں بہت زیادہ تھے لہٰذا دوسری قسم کے کالم ہی کتابی صورت میں محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے بعد نظرِ ثانی کا مرحلہ آیا۔ دو چار کالم پڑھ کر ہی فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کتابت کی غلطیاں زیادہ ہیں یا معنوی اغلاط۔ سچی بات ہے کہ ہمیں کالموں کی معنوی اغلاط بھی کاتب کے کمالِ فن کا اظہار نظر آتی ہیں۔ بہر حال ہم نے بڑی محنت سے کتابت کی غلطیاں دور کر دیں اور باقی ہر طرح کی اغلاط کو اصل کے مطابق باقی رہنے دیا تاکہ ہم پر اصل میں تحریف کا الزام نہ آئے۔ اب یہ انتخاب جلد ہی مکتبۂ جامعہ دہلی سے شائع ہوگا۔ اس کے بعد اس کا جعلی ایڈیشن پاکستان سے شائع کیا جائے گا۔ اس اہتمام کا سبب یہ ہے کہ پاکستان میں ہندوستانی کتابوں کے جعلی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔

ادبی رسالے یا کشکولِ گدائی

اردو کے عام ادبی رسالوں کے بارے میں ہم نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ ان کے مدیروں [illegible] پوسٹ مین کی سی ہوتی ہے جو مصنفین کے بند لفافے قارئین تک پہنچانے کا کام سر [illegible] ہیں، اور انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان بند لفافوں میں کیا ہے۔ یہ بھی عرض کیا تھا کہ یہ [illegible] گدا کے کشکول کی طرح ہوتے ہیں۔ کسی نے اس میں باسی روٹی کا ٹکڑا ڈال دیا اور کسی [illegible] کا۔ یہ سب کچھ صبر و شکر کے ساتھ قبول کر لیا جاتا ہے اور کشکول ان لوگوں کی خدمت [illegible] دیا جاتا ہے جن کے لیے وہ در در کی گدائی کی گئی تھی۔ بہت کم رسالوں میں مدیر ایسے [illegible] معلوم ہو کہ ادبی رسالہ کشکولِ گدائی نہیں ہوتا، ادب کی رفتار کو جانچنے کا پیمانہ اور [illegible] سے آگاہی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ معیاری ادبی تخلیقات کی اشاعت کا وسیلہ ہی نہیں [illegible] کے باہمی تبادلۂ خیالات کے لیے ایک فورم بھی مہیا کرتا ہے۔ ادبی رسالے کے [illegible] ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اپنے عہد کے ادب سے بلکہ ماضی کے ادبِ عالیہ سے بھی [illegible] واقف ہو نیز ادب اور غیر ادب میں جو فرق ہے، اسے پہچاننے والی آنکھ بھی رکھتا ہو۔

[illegible] اب یہ حال ہے کہ رسالوں میں ادبی تخلیقات سے زیادہ اشتہاروں کے حصول پر توجہ [illegible] "ادبی تخلیقات" بھی وہی شائع کی جاتی ہیں جن پر لکھنے والا رسالے کا خریداری نمبر [illegible] غیر ملکوں میں آباد اردو ادیب تو اتنے محتاط ہوتے ہیں کہ وہ اپنی تخلیقات کے [illegible] ہیں تاکہ مدیر کے "خسارے" کے بوجھ میں کچھ کمی ہو جائے۔ اور بعض شاعر تو [illegible] غزل لکھ ڈالتے ہیں تاکہ چیک اور غزل ایک ساتھ ہی کیش ہو جائیں۔ ایسے [illegible] میں جو دو چار رسالے ادب کی صحیح معنوں میں خدمت کر رہے ہیں، ان کی دل

سے دعا نکلتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ ان کا حلقۂ اشاعت اس حد تک وسیع ہو جائے کہ کوئی ادب دوست ان کے مطالعے سے محروم نہ رہے۔ آج ایک ایسے ہی رسالے کا ذکر کرنے کے لیے یہ تمہید اٹھائی ہے۔

رسالہ ''سوغات'' ہندوستان کے شہر بنگلور سے سال میں دو مرتبہ شائع ہوتا ہے اور اس کے مدیر محمود ایاز ہیں جو ادب اور ادبی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ''سوغات'' کے اب تک چھ شمارے شائع ہو چکے ہیں اور ہر شمارہ اپنے مندرجات کے اعتبار سے ایک فکر انگیز ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ چھٹا شمارہ جو حال ہی میں شائع ہوا ہے، اس وقت پیش نظر ہے۔ اس کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی ادیبوں کے ساتھ ساتھ پاکستانی ادیبوں کو بھی برابر اہمیت دی گئی ہے۔ طنز و مزاح نگار محمد خالد اختر کا خصوصی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جو دو سو [illegible] صفحات پر مشتمل ہے۔ ناول نگار، افسانہ نویس، نقاد عزیز احمد مرحوم کی شادی کے لیے بھی ایک گوشہ [illegible] کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار غلام عباس پر فیصل جعفری کی ایک زیر تحریر کتاب کا ایک باب شائع [illegible] ہے۔ عزیز حامد مدنی کی شاعری کا مفصل تنقیدی جائزہ نوشتہ حمید نسیم اور خود حمید نسیم پر ڈاکٹر اسلم [illegible] کا مضمون بھی اس شمارے میں شامل ہیں۔ ان تحریروں کے علاوہ بھی کئی پاکستانی ادیبوں کی تخلیقات شائع کی گئی ہیں اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ ''سوغات'' ایک ایسا رسالہ ہے جو صرف ہندو [illegible] تک محدود نہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی اردو ادب تخلیق ہو رہا ہے اس کے لیے اس رسالے کے دامن میں گنجائش ہے۔

''سوغات'' میں اختر الایمان کی خودنوشت ''اس آباد خرابے میں'' بالاقساط شائع ہو [illegible] ہے۔ زیر نظر اس شمارے میں اس کا گیارہواں باب شائع ہوا ہے جو شیخ سعدی کی گلستان [illegible] پانچویں باب سے زیادہ دلچسپ اور ''رنگین'' ہے۔ اختر الایمان اردو کے پہلے خودنوشت نگار [illegible] جنھوں نے سچائی اور بے باکی کے ساتھ اپنے حالات لکھے ہیں اور دوسروں کے بارے [illegible] یادداشتوں کو بغیر کسی مصلحت کے پیش کیا ہے۔ زیر نظر قسط ان کی زندگی کے اس دور سے تعلق [illegible] ہے جب وہ شالیمار پکچرز سے نئے نئے وابستہ ہوئے تھے اور انھیں جوش ملیح آبادی اور کرشن [illegible] کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ اختر الایمان نے فلمی زندگی کے ایسے بہت سے واقعات [illegible] کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کا باوا آدم ہی نرالا تھا۔ فلمیں بنانے کے ساتھ [illegible]

کاری میں بھی نئے نئے تجربے کیے جا رہے تھے۔ ایک ایسا ہی تجربہ بھنگ کی پکوڑیاں کھانے کا تھا۔ یہ پکوڑیاں کھا کر اختر الایمان اور ان کے ساتھیوں پر جو گزری اسے دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے وقت لکھنے والے نے بھی بھنگ کی پکوڑیاں کھا رکھی تھیں۔

اختر الایمان نے جوش کے بارے میں بڑی نادر معلومات پیش کی ہیں۔ جوش صاحب اپنے اور اپنے باپ دادا کے بارے میں ایسے ایسے قصے سناتے تھے کہ سننے والے حیران رہ جاتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ انھوں نے بتایا کہ ان کے دادا کثرت اولاد کی وجہ سے اپنے بچوں کو پہچان نہیں [illegible] تھے۔ ۳۰، ۳۲ بیویوں میں سے کسی کا بچہ ان کے پاس آنے سے انکار کر دیتا یا انھیں نہیں پہچان پاتا تو اس زور سے طمانچہ مارتے تھے کہ بچے کا دم نکل جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ان کے چھوٹے بیٹے نے ان کے بارے میں کہہ دیا تھا، میاں تو لکھنؤ کے نوابوں کی چال چلتے ہیں۔ کیونکہ وہ ذرا سست گام تھے اور تیز چلنے کو بدتمیزی شمار کرتے تھے۔ جب انھیں یہ اطلاع ملی کہ ان کے لڑکے نے ان کے بارے میں ایسی رائے کا اظہار کیا تو تلوار لے کر اس کے گھر پہنچ گئے اور راستے میں جو کتا بلی نظر آیا اسے مارتے گئے۔''

اس قسم کے ''طبع زاد'' واقعات پڑھ کر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جوش صاحب نے ''یادوں کی برات'' تو بہت بعد میں لکھی، لیکن اس کی زبانی نشر و اشاعت کا کام بہت پہلے سے شروع کر رکھا تھا۔

محمد خالد اختر اردو کے طرح دار ادیب ہیں۔ ان کا اسلوب تحریر ہی منفرد نہیں، بلکہ وہ موضوعات بھی نئے نئے تلاش کرتے ہیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار طنز و مزاح، سفرنامے اور ناول میں ہوا ہے، لیکن بحیثیت طنز و مزاح نگار ان کا درجہ بہت بلند ہے، اور یہی صنف ادب ان کی [illegible] ہے۔ ''سوغات'' کے زیر نظر شمارے میں ان کی تحریروں کا ایک نمائندہ انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب ایسا عمدہ ہے کہ اگر محمد خالد اختر کی باقی تمام تحریریں ضائع بھی ہو جائیں تو وہ اس انتخاب کی بنا پر ہمارے قدآور ادیبوں میں شمار ہوتے رہیں گے۔

اس انتخاب کے ساتھ خالد کی شخصیت اور فن کے بارے میں تین مضامین بھی شامل ہیں۔ ان مضامین میں موضوع کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ مضمون نگاروں نے زیادہ تر [illegible] سے سروکار رکھا ہے۔ شکووں میں سرفہرست یہ ہے کہ نقادوں نے خالد سے بے

اعتنائی برتی ہے۔ مثلاً ایک مضمون نگار لکھتے ہیں:

"محمد خالد اختر کس مرتبے کا ادیب ہے؟...... اس بارے میں اگر آپ اُردو کے نقادوں سے رجوع کریں تو وہاں آپ کو سوائے خاموشی کے کچھ نہیں ملے گا۔ اس لیے کہ خالد کو بالکل نظر انداز کرنے میں انھوں نے شروع سے اب تک بڑی استقامت دکھائی ہے...... ایک بات جو آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ پاکستان میں اُردو کے چار پانچ جتنے بھی معروف مزاح نگار ہیں، وہ یوں تو سب خالد کے مداح ہیں، لیکن جب وہ کتابوں کے فلیپوں پر یا اشتہاری بروشروں میں ایک دوسرے کی تحسین کرنے پر آتے ہیں تو خالد کا کہیں نام نہیں لیتے اور اسے اپنے حلقے سے یوں خارج کردیتے ہیں جیسے وہ ان کے قبیلے کا فرد ہی نہ ہو۔"

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس اقتباس میں خالد سے ہمدردی کی گئی ہے یا ان کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ نقادوں کی بے اعتنائی کا شکوہ تو سمجھ میں آتا ہے لیکن کتابوں کے فلیپوں اور اشتہاری بروشروں میں خالد کا ذکر نہ ہونے کی شکایت خاصی مضحکہ خیز ہے۔ کیا فلیپوں اور اشتہاری بروشروں میں خالد کا ذکر آجانے سے ان کے ادبی مرتبے میں اضافہ ہو جائے گا؟

ان مضمون نگاروں نے خالد کی عظمت کی جو دلیلیں دی ہیں وہ کچھ اس قسم کی ہیں کہ انھیں ایک کتاب پر آدم جی انعام مل چکا ہے اور پنجاب یونیورسٹی میں ان پر ایم اے کا ایک مقالہ لکھا جا چکا ہے۔ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ ماضی میں جن ادیبوں کو آدم جی انعام ملا تھا وہ رسوائی کے خوف سے کسی سے اب اس کا ذکر تک نہیں کرتے کیونکہ یہ انعام زکوٰۃ و خیرات کی مد سے دیا جاتا تھا اور ایک آمرِ مطلق کے ہاتھوں سے دلوایا جاتا تھا۔ رہا ایم اے کا مقالہ لکھنے کا معاملہ تو یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ آج کل ایسے ادیبوں پر بھی مقالے لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی جا رہی ہیں جن کا نام کسی کتاب پر بطور مصنف چھپ جاتا ہے تو وہ کتاب ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔

اسی مضمون نگار نے یہ شکوہ بھی کیا ہے کہ "مسلم ادبی مرتبے کے باوجود خالد کی کتابیں بازار میں نہیں بکتیں۔ بیسٹ سیلر ہونا تو دور کی بات ہے، اس کی کتاب "کھویا ہوا افق" جو انعام یافتہ بھی اس کا پہلا ایڈیشن بارہ تیرہ برس میں کہیں جا کر ختم ہوا۔" محققوں کے بارے میں تو سنا تھا کہ ان کی کتابیں فروخت نہیں ہوتیں، لیکن یہ پہلی مرتبہ سنا ہے کہ کسی طنز و مزاح نگار کے ساتھ خریداروں نے ایسا سلوک کیا۔ جب خالد کی انعام یافتہ کتاب بارہ تیرہ برسوں میں ختم ہوئی تو خدا جانے ان

انعام یافتہ کتابوں کا کیا حشر ہوا ہوگا۔

کتابوں کے فروخت نہ ہونے کا سبب مضمون نگار نے یہ بتایا ہے کہ خالد کی تحریروں سے لطف اندوز ہونے کے لیے تعلیم یافتہ ہونا بہت ضروری ہے۔ ان کی تحریریں اوسط درجے کے قاری کے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔ یہ بات ہمارے دل کو لگتی ہے کیونکہ اس سے نقادوں کی بے اعتنائی کا سبب معلوم ہو جاتا ہے۔ ہمارے نقاد چونکہ ادب کے اوسط درجے کے قاری ہوتے ہیں، اس لیے خالد کی تحریریں ان کے سروں کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔

"سوغات" میں اور بھی کام کی بہت سی چیزیں ہیں۔ مثلاً رشید احمد صدیقی اور راجندر سنگھ بیدی کے غیر مطبوعہ خطوط، تازہ ترین افسانے اور ان کے تجزیے، قارئین کے خطوط کا حصہ بھی خاصا بھرپور ہے۔ قارئین کے خطوط دراصل ادیبوں ہی کے خطوط ہیں جن میں "سوغات" کے پچھلے شماروں کے مندرجات پر دلچسپ تبصرے کیے گئے ہیں۔ اس حصے میں نظیر صدیقی کا بھی ایک خط شامل ہے جو انھوں نے اپنے ہم عصر سخن شناسوں کے نام لکھا ہے۔ یہ ایک نہایت دردناک خط ہے جس میں انھوں نے تفصیل سے اپنی شاعری کی خصوصیات بیان کی ہیں اور آخر میں یہ مطالبہ پیش کیا ہے:

"میں نے اُردو شاعری کے بہت اچھے سرمائے میں معتد بہ اضافہ کیا ہے۔ میرے اشعار زبان و بیان اور قواعد و عروض کی خامیوں سے بڑی حد تک پاک ہیں...... حسن خیال سے قطع نظر محض زبان و بیان کے اعتبار سے بھی میرے اشعار توجہ کے مستحق ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود میری شاعری کیوں نظر انداز ہوتی رہی ہے۔ اس پر غور کرنا دوسروں کا بھی بلکہ دوسروں ہی کا فرض ہے۔ میں اپنے عہد کے سخن شناس اور صاحبِ نظر طبقے سے درخواست کے طور پر نہیں بلکہ ایک مطالبے کے طور پر کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے۔"

اس خط کو پڑھ کر ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ افسوس کہ سخن شناسوں نے ایک اہم شاعر کے ساتھ ظلم اور ناانصافی کی ہے۔ نظیر صدیقی نے اس خط کے ساتھ اپنے ۵۵ شعر بطور نمونہ کلام بھی شامل کیے ہیں۔ ان شعروں کو پڑھ کر ہماری آنکھوں میں مزید آنسو آئے کہ خود شاعر نے بھی شاعری کے ساتھ ناانصافی کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔

شاعری اور ڈپریشن

اگر کوئی شخص اپنی محنت اور ذاتی جدوجہد سے بے پناہ دولت کمائے اور اس دولت کو سامان عیش و عشرت کی بجائے رفاہ عامہ کے کاموں میں صرف کر دے اور خود پوری زندگی ایک شیروانی، ایک پاجامے اور کرائے کے مکان میں بسر کر دے تو ایسے شخص کو دیوانہ کہا جائے گا یا حکیم محمد سعید......

حکیم صاحب نے قوم کی جسمانی صحت کے لئے ہمدرد کی دواؤں کو اتنا عام کر دیا ہے کہ غریب سے غریب آدمی بھی ان کے دواؤں کے استعمال کی استطاعت رکھتا ہے، بلکہ بعض دوائیں تو اتنی لذیذ ہوتی ہیں کہ انھیں شوقیہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ انھیں "شوقیہ دواؤں" میں روح افزا بھی شامل ہے جسے لوگ شربت سمجھ کر پیتے ہیں۔ اس کی تاثیر یہ ہے کہ جو اسے ایک دفعہ پی لیتا ہے وہ پھر کسی دوسرے مشروب کے قریب نہیں جاتا، گویا یہ مانع منشیات دوا ہے۔ جوش صاحب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ زندگی بھر بادۂ ناب سے غم غلط کرتے رہے لیکن جب روح افزا سے واسطہ پڑا تو پھر کبھی کسی دوسرے مشروب کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس کا ثبوت ان کے کلام سے بھی ملتا ہے۔ اس وقت رباعی یاد آ رہی ہے۔

ساقی خس کو مزاج دریا دے دے
پیاسا ہوں بہت جوہر مینا دے دے
ہاں اس لب جاں بخش کی خوشبو کی قسم
ہمدرد کا جام روح افزا دے دے

مختصر یہ کہ ہمدرد کی دوائیں اس کثرت سے استعمال کی جاتی ہیں کہ خدا کے فضل سے

ایک بڑا حصہ صحت مند ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ملک کے ہر پانچویں شہری کے ہاتھ میں کلاشنکوف ہے، جس کے ذریعے وہ اپنی صحت مندی کا مظاہرہ اور غیر صحت مند لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے۔

شاید یہی صورتِ حال دیکھ کر حکیم صاحب کو خیال آیا کہ صرف جسمانی صحت کافی نہیں ہے، قوم کی تعلیمی اور اخلاقی حالت کو بھی بہتر بنانا چاہیے۔ تعلیمی پسماندگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے حکیم صاحب نے مدینۃ الحکمت آباد کیا اور اخلاقی پستی کو ختم کرنے کے لیے "آوازِ اخلاق" کے نام سے ایک تحریک شروع کی۔ مدینۃ الحکمت تیزی سے آباد ہو رہا ہے، انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب قوم کے ہر فرد کے ہاتھوں میں کلاشنکوف کی بجائے کتاب ہو گی۔ لیکن اخلاق کا معاملہ خاصا [illegible] نظر آتا ہے۔ لوگ آوازِ اخلاق سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور اگر غلطی سے سن لیتے ہیں تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتے ہیں۔

بہت غور و فکر کے بعد حکیم صاحب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قوم کی اخلاقی حالت کی خرابی کا سبب بد دلی، افسردگی، مایوسی اور پست حوصلگی ہے جس کے لیے انگریزی میں ڈپریشن کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جب تک ڈپریشن ختم نہیں ہوگا، ہماری اخلاقی حالت سدھر نہیں سکتی۔ حکیم صاحب نے ڈپریشن کا علاج بھی دریافت کر لیا ہے اور وہ شاعری ہے۔ حکیم صاحب کا خیال ہے کہ شاعری میں چونکہ انسان کے نفیس ترین جذبات و خیالات کا اظہار ہوتا ہے، اس لیے وہ انسان کو صرف بد دلی اور افسردگی وغیرہ سے نجات دلاتی ہے بلکہ اسے مہذب اور شائستہ بھی بنا دیتی ہے۔ مہذب و شائستہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان نے آوازِ اخلاق سن لی اور اس پر عمل کر کے وہ پیکرِ اخلاق بن گیا۔

شاعری کے ذریعے قوم کی اخلاقی حالت سدھارنے کے لیے حکیم صاحب نے ایک جامع پروگرام مرتب کیا ہے۔ کراچی، لاہور اور اسلام آباد وغیرہ میں شاعروں کے ساتھ شامیں منائی جاتی ہیں۔ ان میں لوگ بذریعہ دعوت نامہ شریک ہوتے ہیں۔ گویا فی الحال انھیں لوگوں کا اخلاق سدھارا جاتا ہے جنھیں دعوت نامہ ملتا ہے۔ امید ہے کہ آگے چل کر دعوت نامے کی پابندی اٹھالی جائے گی اور عام لوگوں کو بھی اپنی اخلاقی حالت بہتر کرنے کا موقع دیا جائے گا۔

بعض لوگ، جو ہر اچھی بات میں برائی کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں، اور ہر کام کو منفی

نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، وہ حکیم صاحب کی تحریک درستی اخلاق بذریعہ شاعری سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعروں کا اپنا اخلاق درست نہیں ہوتا اور ان کی شاعری بھی بڑی حد تک مخرب اخلاق ہوتی ہے، اس لیے اخلاقی معاملات میں ان کو شریک کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اپنے اس دعوے کی دلیل میں یہ لوگ اس قسم کے شعر پیش کرتے ہیں:

لے شب وصل غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک
(مومن)

کودا تیرے گھر میں کوئی یوں دھم سے نہ ہوگا
وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہوگا
(انشا)

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن
(غالب)

معترضین کے خیال میں پہلے شعر میں بے غیرتی کی، دوسرے میں جرم پیشگی کی، اور تیسرے میں سوقیانہ پن کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس قسم کی شاعری سے تو قوم کا اخلاق ہی نہیں، صحت بھی متاثر ہوگی۔

افسوس کہ معترضین سخن فہم نہیں ہیں۔ حکیم صاحب نے ہرگز یہ نہیں کہا کہ شاعری براہ راست اخلاق کو درست کرتی ہے، بلکہ انھوں نے یہ فرمایا ہے کہ شاعری ڈپریشن کو ختم کرتی ہے، اور ڈپریشن جب ختم ہو جاتا ہے تو اخلاق خود بخود درست ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ڈپریشن کو ختم کیا جائے۔ مذکورہ بالا شعروں سے خوش دلی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ پڑھنے والا مسکراتا ہے، اس سے افسردگی کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ قاری مومن خاں مومن کو اس کی داد دیتا ہے کہ وہ اتنا وسیع القلب تھا کہ اپنی شب وصل سے محروم ہو کر غیر کی شب وصل ہنسی خوشی سے گزار لیتا تھا۔ انشاء اللہ خاں انشاء کی بہادری قابل رشک نظر آتی ہے کہ وہ بے خوف و خطر دوسروں کے گھروں میں کود جاتا تھا اور ہاتھ پاؤں اور عز

انسان کی بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ غالب تو قاری کو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے کیونکہ اس نے اپنے اشعار میں نہایت خوب صورتی سے اس الزام کی تردید کی ہے کہ شاعر بے عمل ہوتے ہیں۔ نور اللغات میں "دھول دھپا" کے جو معنی لکھے ہیں، ان کی سند میں یہی شعر پیش کیا گیا ہے۔ معنی یہ ہیں:

"آپس میں ایک دوسرے کے سر پر تھپڑ مارنا" اس شعر کا بنیادی خیال یہ ہے کہ آدمی کو باعمل ہونا چاہیے۔ حرکت ہی میں برکت ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں حکیم صاحب نے ڈپریشن کو ختم کرنے کے لیے موجودہ عہد کے شاعروں کے ساتھ شامیں منانے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، وہ دراصل شامیں خراب کرنے کا منصوبہ ہے۔ موجودہ دور میں اتنی خراب شاعری ہو رہی ہے کہ اسے سن کر ڈپریشن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان معترضین کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ جس شاعری کو خراب سمجھ رہے ہیں وہ شعرائے کرام کے نزدیک بہترین شاعری ہے۔ لہٰذا شاعری کو خراب کہنے کے بجائے اپنے شعری ذوق کی تربیت کرنی چاہیے، اور جیسی شاعری ہو رہی ہے اسی کو بہترین سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے تاکہ شاعروں کے ساتھ شامیں منانے کا پروگرام کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہے۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ پوری قوم کا ڈپریشن ایک ساتھ ختم نہیں ہوگا۔ یہ کام مرحلہ وار کیا جائے گا۔ پہلے مرحلے میں شاعروں کا ڈپریشن ختم کیا جائے گا۔ شاعر جب تک کلام سنا نہ لے، اس پر بے دلی کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ حکیم صاحب کی عنایت سے اسے جب کلام سنانے کا موقع ملے گا تو اسے ڈپریشن سے نجات مل جائے گی۔ اس طرح ایک ایک کر کے پاکستان کے شاعروں کو ڈپریشن کے شکنجے سے آزاد کرا لیا جائے گا۔ اس کے بعد سامعین کی باری آئے گی۔

ممکن ہے کہ یہ تفصیل جان کر کوئی یہ کہے کہ اس طرح تو شاعری کے ذریعے پوری قوم کا ڈپریشن ختم کرنے کے لیے کئی صدیاں درکار ہوں گی۔ اس کے جواب میں عرض ہے کہ قوموں کی زندگی میں صدیاں پلک جھپکنے میں گزر جاتی ہیں، اس لیے ہمیں توقع رکھنی چاہیے کہ حکیم صاحب کی کوششوں کے مثبت نتائج جلد ظاہر ہوں گے۔

سرسید نے مولانا حالی سے مسدس لکھوا کر شاعری کو اعلیٰ قومی مقاصد کے حصول کا ذریعہ

بنایا تھا۔ حکیم محمد سعید کا اقدام اسی تسلسل میں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سرسید کے زمانے میں ان کی مخالفت کی گئی تھی، اسی طرح حکیم صاحب کے خلاف بھی ادبی حلقوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں، اگرچہ کسی نے کھلم کھلا ان کی مخالفت نہیں کی، لیکن اشارتاً کنایتاً باتیں بنائی جا رہی ہیں۔ مشہور نقاد اور شاعر قمر جمیل نے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں کہا ہے کہ:

"بیسویں صدی شاعری کی نہیں نثر کی صدی ہے۔ ہماری صدی فکر، عقل، منطق، شعور اور سائنس کی صدی ہے۔ ہمارا عہد تنقید کا عہد ہے۔ ایسے عہد میں شاعری کا جادو چلنا مشکل ہے، البتہ کہانیاں، ناول اور تنقید چل سکتی ہے۔"

صاف ظاہر ہے کہ یہ بات قمر جمیل نے حکیم صاحب کی تحریکِ شاعری کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہی ہے۔ "شاعری کا جادو چلنا مشکل ہے" کے الفاظ اسی جادو کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو حکیم صاحب چلانا چاہتے ہیں۔ ہمیں حیرت ہے کہ قمر جمیل زندگی بھر شعر کہنے کے بعد شاعری سے اس قدر مایوس ہو گئے ہیں کہ انھوں نے نہ صرف بیسویں صدی کی شاعری کو بلکہ اکیسویں صدی کی شاعری کو بھی مردود قرار دیا ہے جو ابھی وجود میں نہیں آئی۔ ہمیں مزید حیرت اس بات پر ہے کہ قمر جمیل کا شاعری کا ذاتی تجربہ کچھ ایسا مایوس کن بھی نہیں ہے، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ وہ ہمارے دور کے بہترین شاعروں میں سے ہیں، اگرچہ ہمارا دور بہترین شاعری کا دور نہیں ہے۔ قمر جمیل اس لائق ہیں کہ حکیم محمد سعید ان کے ساتھ ایک شام منائیں تا کہ ان کا ڈپریشن دور ہو اور وہ شاعری کے بارے میں مایوس کن باتیں نہ کریں۔

قمر جمیل کو ہم نے موجودہ دور کے بہترین شاعروں میں شمار کیا ہے، ممکن ہے ہماری اس جسارت پر اہلِ نظر کو تعجب ہو، لہٰذا ہم اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر قمر جمیل کا ایک شعر پیش کرتے ہیں

ایک پتھر جو دستِ یار میں ہے
پھول بننے کے انتظار میں ہے

ہماری رائے میں یہ شعر قمر جمیل کو اردو ادب میں زندہ رکھے گا، بالکل اسی طرح جس طرح حکیم آزاد انصاری اس شعر کی وجہ سے زندہ ہیں۔

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

اور رام نرائن موزوں اس شعر کی وجہ سے

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

لہٰذا قمر جمیل ہمارے دور کے رام نرائن موزوں ہیں، اگرچہ شاعری کے بارے میں انھوں نے بعض ناموزوں باتیں کی ہیں مگر جو ان کا حق ہے وہ انھیں ضرور ملنا چاہیے۔

اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام

ڈاکٹر تاثیر کی ایک نظم ہے "اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام"۔ اس میں وہ کہتے ہیں:

اگلے وقتوں کے شاعران کرام
کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے
شب مہتاب پائے ساقی پر
اپنا سر رکھ کر خوب سوتے تھے
صبح دم قطرہ ہائے شبنم سے
موتیوں کی لڑی پروتے تھے
پھول کو دیکھ کر چہکتے تھے
اور بلبل سے مل کر روتے تھے
کاٹتے تھے فراق کی راتیں
اور الفت کے بیج بوتے تھے
اگلے وقتوں کے شاعران کرام
کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے

اگلے وقتوں کے شاعران کرام واقعی خوش نصیب تھے کہ ان کی دنیا بڑی محدود تھی۔ انھیں فراق و وصل ہی کے معاملات سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ کسی اور طرف توجہ کر سکیں۔ وصل تو ایک خیالی چیز تھی، ورنہ شعرائے کرام کا اصل مسئلہ فراق ہی رہا ہے، اسی عالم فراق میں وہ زندگی گزارتے اور دیوان مرتب کر جاتے تھے۔ آج ہم پرانے شاعروں کے دیوان دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیسی کیسی مشکل زمینوں میں شعر کہتے تھے۔ ایک تو محبوب کی جدائی کا غم

مشکل زمینوں میں شعر کہہ کر زندگی کو مزید مشکل بنالینا کوئی آسان کام نہ تھا۔

ہم یہیں تک کالم لکھ پائے تھے کہ استاد لاغر مراد آبادی اخباروں اور کتابوں کا پلندہ بغل میں دبائے ہوئے تشریف لے آئے۔ حسب عادت، ہم سے پوچھے بغیر نامکمل کالم انھوں نے سامنے سے اٹھالیا۔ اسے پڑھا۔ اس کے بعد ہم میں اور ان میں کچھ گفتگو ہوئی۔ یہ گفتگو سامان عبرت ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

وہ: نئے شاعروں سے تو آپ بے تکلف تھے ہی، اب آپ پرانے شاعروں پر بھی طبع آزمائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنی تحریروں کو نئے شاعروں تک محدود رکھیں۔ قدیم ادب پر لکھنے کے لیے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ علم کہیں بازار میں تو بکتا نہیں جو آپ بقدر ضرورت خرید لائیں۔

ہم: نئے شاعروں پر ہم بہت کچھ لکھتے ہیں۔ اب اگر پرانے شاعروں کے بارے میں بھی پڑھنے والوں کو کچھ بتادیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔

وہ: آخر آپ کیا بتانا چاہتے ہیں۔

ہم: یہی کہ وہ بہت خوش نصیب تھے۔ بے فکری کی زندگی بسر کرتے تھے۔ فرضی محبوبوں کے غم سہتے تھے۔ خیالی ہجر و وصال کے مزے لوٹتے تھے۔ فرضی رقیب اور اصلی محتسب سے تے تھے۔ وقت ان مشاغل کے بعد بھی بچ رہتا تھا، اس لیے وہ سنگلاخ زمینوں میں تھے۔

وہ: یوں کہیے کہ سنگلاخ زمینوں میں پھول کھلاتے تھے۔ آج کل کے شاعروں کی طرح زمینوں میں گھاس نہیں کاٹتے تھے۔ پرانے زمانے کا خراب سے خراب شاعر بھی آج کل کے اچھے سے اچھے شاعر سے زیادہ زبان و بیان پر قدرت رکھتا تھا۔ وہ ریاض کرتا تھا۔ آج کل کے "ریاض" کے معنی بھی معلوم نہیں، بلکہ انھیں تو ان لفظوں کے معنی بھی معلوم نہیں ہوتے، شعروں میں استعمال کرتا ہے۔

ہم: لیکن یہ بھی تو دیکھیے کہ پرانے شاعروں کے دیوانوں میں بڑی حد تک بے مقصد ہے۔ میر و غالب جیسے چند شاعروں کو چھوڑ کر، کسی شاعر نے شاعری سے کوئی بڑا کام

وہ: آج کل کے شاعروں میں کون ایسا ہے جو شاعری سے بڑا کام لے رہا ہے۔ شاعری سے جو کام لیا جا رہا ہے اس کی وجہ سے شاعر اور شاعری دونوں کی کوئی وقعت نہیں رہی۔

ہم: یہ محض آپ کا خیال ہے۔

وہ: یہ میرا خیال نہیں ہے، بلکہ میں کسی اور کا ہم خیال ہوں۔

ہم: وہ کون خوش قسمت ہے جسے آپ کی ہم خیالی کا شرف حاصل ہوا ہے۔

وہ: بزرگ دانشور اور صاحبِ اسلوب شاعر حمید نسیم۔

ہم: ہم نے تو حمید نسیم صاحب کی کوئی ایسی تحریر نہیں دیکھی جس میں انھوں نے موجودہ دور کے شاعروں اور شاعری کی مذمت کی ہو۔

وہ: آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔ حمید نسیم کا دوسرا مجموعۂ کلام "جستِ جنوں" دیکھیے جو ابھی پچھلے دنوں شائع ہوا ہے۔ اس کے دیباچے میں انھوں نے آج کل کے شاعروں اور ان کی شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر خودکشی کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ہم: آخر حمید نسیم نے ایسی کون سی بات لکھ دی ہے جو آپ زندگی سے بیزار ہو رہے ہیں۔

وہ: اتفاق سے یہ کتاب اس وقت میرے پاس موجود ہے۔ اس کے دیباچے کی صرف چند سطریں سن لیجیے۔ وہ فرماتے ہیں:

"ہمارے ہاں چند لائق تعظیم استثنائی شخصیتوں کے سوا ادب میں ایک انتشار اور نراج کی سی فضا عام ہو گئی ہے۔ موزوں کلام میں زندگی کی اعلیٰ قدروں کی ترجمانی رہی نہ شاعرانہ صلاحیت قابلِ لحاظ سطح پر نظر آتی ہے۔ ادب میں سیاست در آئی ہے۔ دھڑے بن گئی ہیں۔ تحسینِ باہمی کی انجمنیں بن گئی ہیں...... نظم نظم رہی نہ غزل غزل رہی۔ بے علم اور بے ادب لوگ تک بندی اور فلمی گیتوں کی سطح کی تک بندی کو ادبِ عالیہ قرار دیئے گئے ہیں۔ ایک ایسے ہی بے علم نے مجھ سے بصد افتخار فرمایا کہ بڑا شاعر وہ ہے جس کا کلام باقی شاعروں سے زیادہ گایا جاتا ہو......"

ہم: بات تو ٹھیک ہے، آخر بڑائی کا کوئی نہ کوئی معیار تو ہونا چاہیے۔

وہ: ابھی حمید نسیم کی بات پوری نہیں ہوئی۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے، وہ پہلے سن لیجیے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ شاعر

"نامور مغنیاؤں اور معتبر گلوکاروں کے گرد پروانوں کی طرح ہجوم کیے رہتے ہیں کہ وہ ان کی غزلیں ان کے گیت گائیں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے پروڈیوسروں سے پی آر محکم رکھی جاتی ہے کہ وہ ان کے کلام کی اچھی دھنیں بنوا کر انھیں پروڈیوس کریں۔"

ہم: حمید نسیم صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ سر آنکھوں پر، لیکن وہ پرانے زمانے کے بزرگ ہیں۔ حیرت ہے کہ انھیں یہ معلوم نہیں کہ گانے والوں کی وجہ سے شاعری کا حلقۂ اثر وسیع ہوا ہے۔ ایسی شاعری کس کام کی جسے کوئی نہ پڑھے اور وہ کتابوں میں دفن رہے۔

وہ: مگر آج کل جو شاعری ہو رہی ہے وہ کتابوں سے زیادہ زمین میں دفن ہونے کے لائق ہے۔ ایسی شاعری کا حلقۂ اثر وسیع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بدمذاقی کا حلقۂ اثر وسیع ہوگا۔

ہم: شاعری کا مذاق ہر عہد میں بدلتا رہتا ہے۔ استاد ذوق اپنے زمانے کے مقبول ترین شاعر تھے مگر آج انھیں کوئی نہیں پوچھتا۔

وہ: مگر آج کل کے شاعروں کی تو خود ان کے اپنے زمانے میں کوئی قدر نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سب شاعر ایک ہی جیسی بے مزہ شاعری کر رہے ہیں۔ کسی کی کوئی انفرادی شناخت نہیں ہے۔ اگر میری بات کا یقین نہیں ہے تو مشہور شاعر انجم رومانی کا یہ انٹرویو پڑھ لیجیے جو ابھی ہوئے اخبار "نوائے وقت" میں چھپا ہے۔

ہم: اس میں انھوں نے کیا خاص بات کہہ دی ہے؟

وہ: انھوں نے موجودہ ادبی صورتِ حال کی بہت عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آج تخلیق ہونے والی شاعری ایک ہی شاعر کی تخلیق کردہ ہے۔ خدوخال ہوتے ہیں جن سے انفرادیت متعین ہوتی ہے۔ اس حوالے سے آج کے تمام شاعر لاشیں معلوم ہوتے ہیں۔"

ہم: انجم رومانی صاحب نے یہ بات بڑے اعتماد سے کہی ہے کہ آج کل کے شاعروں کو کوئی ایک ہی شاعر لکھ کر دیتا ہے۔ کیا تعجب کہ وہ خود ہی یہ زحمت فرماتے ہوں کیونکہ کہنہ مشقی کی وجہ سے ان کے لیے شعر کہنا اتنا ہی آسان ہے جتنا ہمارے آپ کے لیے گفتگو کرنا۔ جہاں تک سرکی تعلق ہے تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ پولیس والے لباس سے اس کی شناخت کر لیتے ہیں۔

وہ: ہاں اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ پولیس والے ہی شاعروں کو شناخت کریں گے۔

ہم: وہ کیوں؟

وہ: شاعروں کی اخلاقی حالت بھی روز بروز گرتی جا رہی ہے۔

ہم: یہ بہت بڑا الزام ہے۔

وہ: یہ الزام نہیں، حقیقت ہے۔ اب شریف لوگ شاعروں سے دور ہی رہتے ہیں۔

ہم: واقعی آپ خیالوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔

وہ: یہ میرا خیال نہیں، مشہور شاعرہ شاہدہ حسن کا خیال ہے۔ یہ کراچی کا ماہنامہ ''خوبصورت'' ہے۔ اس میں شاہدہ حسن کا انٹرویو دیکھیے۔

ہم: آج تو آپ ہر بات کا دستاویزی ثبوت بھی ساتھ لے کر آئے ہیں۔ ذرا بتایئے تو شاہدہ حسن کیا کہتی ہیں؟

وہ: وہ کہتی ہیں:

''جب میں نے دیکھ لیا کہ شاعروں کی شخصیت اور شاعری میں کوئی مطابقت نہیں ہوتی اور وہ اکثر منافق ہوتے ہیں...... اور پھر کچھ دوسروں (شاعرات) کے تجربات سے اندازہ ہو گیا بہتر یہی ہے کہ میں ادیب اور شعراء حضرات سے دور ہی رہوں۔''

ہم: مانا کہ شاہدہ حسن بہت اچھی شاعرہ ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنی برادری کے معزز اراکین کے بارے میں ایسے سخت الفاظ استعمال کریں۔

وہ: وہ اچھی شاعرہ اس لیے ہیں کہ لفظوں کا صحیح استعمال جانتی ہیں۔

ہم: چلیے جدید شاعروں میں کوئی تو آپ کو ایسا نظر آیا جس میں کوئی خوبی ہے۔

وہ: ایسی بات نہیں، جدید شاعروں میں اور بھی کئی مجھے پسند ہیں۔

ہم: مثلاً

وہ: پروین شاکر۔

ہم: انھوں نے تو شاعری چھوڑ کر کالم نگاری شروع کر دی ہے۔

وہ: یہی تو پسندیدگی کی وجہ ہے۔ دوسرے شاعروں کو بھی چاہیے کہ ان کی تقلید کریں۔

ہم: شاعری چھوڑ کر کالم نگاری شروع کر دیں؟

وہ: جی ہاں، اسی میں شاعری کا بھلا ہے۔

ہم: اگر سب ہی شاعروں نے کالم نگاری شروع کر دی تو گانے والوں کے لیے غزلیں اور گیت کون لکھے گا؟

وہ: غزلوں اور گیتوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ گانے والے اگر ذرا سی کوشش کریں تو وہ کالم بھی گا کر سنا سکتے ہیں۔ آخر ضیاء محی الدین نے غالب کے خط گا کر ہی تو سنائے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

''ڈاکٹر وزیر آغا تو میرے دوست تھے، بلکہ جب میں سرگودھا جاتا تھا تو انھیں کے ہاں ٹھہرتا تھا۔ میں نے اپنا پرچہ ''فنون'' نکالا جس میں بھارت کے ایک بہت اچھے لکھاری عمیق حنفی نے مضمون لکھا۔ اس پر ڈاکٹر وزیر آغا نے اعتراض کیا۔ اس کے بعد عمیق حنفی نے ان کو جواب دیا کہ اس میں آپ کے اشارے اور حوالے سب غلط ہیں اور آپ کا انداز اور معیار بھی غلط ہے اور آپ کو دھرتی پوجا کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں ہے، لہٰذا اس قسم کی تحریریں آپ نہ لکھا کریں۔ اس کے بعد میرے دوست اور مشہور نقاد فتح محمد ملک نے ایک مضمون جدید اُردو شاعری پر لکھا اس میں انھوں نے راشد، میراجی، فیض، مجید امجد اور دوسرے جو سینئر شعراء تھے، ان کا حوالہ دیا وزیر آغا کے بارے میں انھوں نے یہ لکھ دیا کہ ان کو دھرتی پوجا کے فلسفے سے اس لیے محبت ہے کہ وہ خود دھرتی کے ایک بڑے حصے پر قابض ہیں۔ یعنی بڑے زمیندار ہیں۔ یہ جملہ کوئی ایسا نہیں تھا کہ برہم ہوا جاتا بلکہ اسے اچھے موڈ میں لینا چاہیے تھا۔ اس بات پر وہ سخت غصے میں آ گئے اور انھوں نے..... ایسے ایسے مجھ پر حملے کیے کہ میں دہراتا ہوں تو مجھے شرم آتی ہے۔''

ڈاکٹر وزیر آغا

''اوراق اور مدیر اوراق سے احمد ندیم قاسمی کی نفرت کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۹۶۶ء کے ''اوراق'' میں فتح محمد ملک کا مضمون ''فیض کی دو آوازیں'' چھپا۔ مدیر اوراق نے اس مضمون سے وہ حصے حذف کر دیے جن میں ملک صاحب نے فیض اور ندیم کا موازنہ کر کے ندیم کو فیض سے بہتر شاعر ثابت کرنے کی مضحکہ خیز کوشش کی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ فرمائشی مضمون تھا۔ بس اس بات پر ملک صاحب اور ندیم صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے۔ چنانچہ پچھلے ۲۶ برس میں وقتاً فوقتاً ''فنون'' میں میرے خلاف لکھا جاتا رہا ہے جب کہ ''اوراق'' اس ضمن میں خاموش

ہا۔''

ہم اپنے اس عہد پر قائم ہیں کہ ان اقتباسات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جائے گا۔ تاہم فتح محمد ملک کو بڑے دل سے معیار کیار دینے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ عہد حاضر میں ادب کی سب سے بڑی معرکہ آرائی انھی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

شاعری کے کھوٹے سکے

اُردو ادب میں استادی شاگردی کی روایت بہت پرانی ہے۔ پرانے زمانے میں یہ خیال عام تھا کہ جس طرح کوئی شخص استاد کی جوتیاں سیدھی کیے بغیر بڑھئی یا لوہار نہیں بن سکتا، اسی طرح شاعر بننے کے لیے بھی کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنا ضروری ہے۔ گویا قلم گھسنا بھی رندہ پھیرنے اور ہتھوڑا چلانے جیسا کام تھا۔ دلی اور لکھنؤ میں ایک ایک استاد کے سینکڑوں شاگرد تھے، اور پھر فارغ الاصلاح شاگردوں کے بھی شاگرد ہوتے تھے جو اپنے استاد کے استاد کو دادا استاد کہتے تھے۔ اس طرح ہر شاعر کے دو شجرہ ہائے نسب ہوتے تھے جن میں سے ایک کا باپ اور دوسرے کا استاد سے تعلق ہوتا تھا۔ باپ والے شجرۂ نسب کو کوئی نہیں پوچھتا تھا مگر استاد والے شجرۂ نسب کے بغیر مشاعرے میں شرکت کی اجازت نہیں ملتی تھی۔

پرانے استادوں میں مصحفی استاذ الاساتذہ تھے۔ ان کے شاگردوں، اور پھر شاگردوں کے شاگردوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ جن دنوں وہ لکھنؤ میں مقیم تھے، اس شہر کے آدھے سے زیادہ شاعر انھی کے سلسلۂ سخن سے تعلق رکھتے تھے۔ شہر کے باقی شعرا، انشاء اللہ خاں انشا کے شاگرد تھے۔ دونوں استادوں میں جب جھگڑا ہوا تو ان کے شاگردوں نے قلم کی جگہ تلواریں سنبھال لیں۔ بعض با اثر لوگوں کے دخل دینے سے بات آگے نہ بڑھی ورنہ اُردو ادب کی تاریخ میں ایک باب "شہیدانِ سخن" کے عنوان سے لکھا جاتا جس میں ان شاعروں کے حالات درج ہوتے جو اس جھگڑے میں کام آتے۔

پرانے زمانے میں بڑے بڑے نوابوں اور امیروں کو بھی شاعری کا شوق تھا کیونکہ اس زمانے میں بٹیر بازی اور مرغ بازی کی طرح شاعری بھی ایک تفریح کا درجہ رکھتی تھی۔ نواب اور امیر عموماً موزوں طبع نہیں ہوتے تھے، اس لیے کسی نامور شاعر کو صیغۂ شاعری میں ملازم رکھ لیا

تھے۔ یہ شاعر استاد کہلاتا تھا جس کا کام اپنے شاگرد یعنی آقائے ولی نعمت کے نام غزلیں لکھنا ہوتا تھا۔ بعض استاد نوکری نہیں کرتے تھے، کھلے بازار میں غزلیں بیچتے تھے۔ مصحفی کے بارے میں مشہور ہے کہ جتنا کلام ان کے نام سے موجود ہے، اس سے کہیں زیادہ انھوں نے فروخت کر دیا تھا۔ اُردو کے مشہور شاعر میر سوز نے البتہ دانش مندی سے کام لیا۔ وہ ایک عرصہ تک فرخ آباد اور وہاں کے ایک بڑے عہدیدار مہربان خان رند کے پاس صیغۂ شاعری میں ملازم رہے۔ استاد اور شاگردوں کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ دونوں کے دیوانوں میں بہت سی غزلیں مشترک ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ سوز اپنے شاگرد کو جو غزل لکھ کر دیتے، اسے اپنے دیوان میں بھی درج کر لیتے تھے۔

پرانے زمانے میں بڑا شاعر اسے نہیں سمجھا جاتا تھا جس کا کلام سب سے اچھا ہو، بلکہ اسے اچھا شاعر مانا جاتا تھا جس کے شاگردوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو۔ اس سلسلے میں غالب کے شاگرد صفیر بلگرامی کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے پاس ایک رجسٹر تھا جس میں وہ شاگردوں کے نام اور شاگرد ہونے کی تاریخ درج کرتے تھے۔ آخر آخر شاگرد بنانے کا شوق اتنا بڑھا کہ اگر کوئی ملاقات کے لیے آتا تھا تو اس کا نام بھی شاگردوں کے رجسٹر میں لکھ لیتے تھے۔ ان کے بیٹے کی شادی میں جتنے مہمان شریک ہوئے ان کے نام بھی انھوں نے اس رجسٹر میں درج کر لیے۔ اس طرح ایک دن میں سو سے زیادہ لوگوں نے ان کی شاگردی قبول کی۔

ہم تو سمجھتے تھے کہ استاد داغ اور پھر ان کے شاگرد علامہ سیماب اکبر آبادی کے ساتھ استادی شاگردی کی روایت ختم ہو گئی لیکن یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ جناب راغب مراد آبادی کی صورت میں یہ روایت آج بھی زندہ ہے۔ ۷؍ جولائی کے روزنامہ "نوائے وقت" کراچی میں ان کا انٹرویو چھپا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ ان کے بے شمار شاگرد ہیں۔

اس انٹرویو کے مندرجات پر گفتگو بعد میں ہوگی، پہلے یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ راغب مراد آبادی اپنی نوعیت کے منفرد شاعر ہیں۔ اگر انھیں سراپا سخن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے غرض کہ ہر حالت میں ان کی طبیعت موزوں رہتی ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ وہ سوتے میں بھی شعر کہتے ہوں۔ زبان و بیان پر تو انھیں بے مثال قدرت حاصل ہے۔ کوئی بھی موضوع ہو، اس پر فوراً لکھ دیتے ہیں۔ ان کے سوچنے اور بولنے کی رفتار یکساں ہے۔ یعنی جس وقت وہ

شعر پڑھ رہے ہوتے ہیں، اسی وقت تخلیق بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ عروض کے وہ ایسے ماہر ہیں کہ مشکل سے مشکل بحر میں گفتگو کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ ہم نے ان کے بارے میں لکھا تھا کہ ان کے کلام میں کوئی عروضی خامی اور کوئی غیر عروضی خوبی نہیں پائی جاتی۔

راغب صاحب نثر کو کلام موزوں میں منتقل کرنے میں جو غیر معمولی مہارت رکھتے ہیں اس کا اعتراف جناب مشتاق احمد یوسفی نے بھی کیا ہے۔ راغب صاحب کے اعزاز میں ایک جلسے میں انھوں نے فرمایا: ”وہ اگر چاہیں تو تعزیرات پاکستان کی دفعات اور ضابطۂ فوجداری کو اس خوبی سے نظم کر دیں کہ وکلا بغلیں اور ملزمان ہتھکڑیاں بجاتے رہ جائیں۔“

اگرچہ یوسفی صاحب کی کسی تحریر پر اضافہ کرنا ممکن نہیں ہے، تاہم یہ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ راغب صاحب ریلوے ٹائم ٹیبل اور ٹیلی فون ڈائریکٹری کو بھی بحر متقارب مثمن سالم میں منتقل کر سکتے ہیں تاکہ ریل گاڑیوں کے لیٹ ہونے اور ٹیلی فونوں پر غلط نمبروں کے ملنے کا جواز پیدا ہو سکے۔

ہاں تو ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ آج بھی استادی شاگردی کی روایت راغب صاحب کی وجہ سے زندہ ہے۔ ان کے مذکورہ انٹرویو سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کئی نامی گرامی لوگ ان کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ ان نامیوں گرامیوں میں سے صرف ایک کا نام ظاہر کیا گیا ہے۔ راغب صاحب نے فرمایا ہے کہ انھوں نے حبیب جالب پر بہت محنت کی، اور اسی کے نتیجے میں اس نے شاعری میں اونچا مقام حاصل کیا۔

راغب صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ وہ ہمارے دور کے ایک مقبول ترین شاعر کے استاد ہیں۔ مگر حبیب جالب خوش قسمت نہیں تھے کیونکہ انھوں نے ہمیشہ راغب صاحب کی شاگردی سے انکار کیا۔ ہمیں اس وقت جالب کا انٹرویو یاد آ رہا ہے جو ان کی وفات سے چند ہفتے پہلے شائع ہوا تھا اور پھر وفات کے بعد دوبارہ اخبار ”جنگ“ لاہور میں ۳۰ مارچ ۱۹۹۳ء کو چھپا تھا۔ اس انٹرویو میں جالب نے صاف لفظوں میں راغب صاحب کی شاگردی سے انکار کیا ہے۔ ان سے پوچھا گیا کیا آپ راغب مرادآبادی کے شاگرد ہیں؟ جالب نے جواب دیا: ”بھئی کہاں۔ کسی بزرگ کے قریب سے آپ گزر جائیں تو وہ کہہ دے گا کہ یہ میرا شاگرد ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“

افسوس کہ حبیب جالب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، ورنہ ہم ان سے یہ کہتے کہ راغب صاحب کی زندگی کا حاصل اور سرمایۂ فخر یہی بات تھی کہ وہ آپ کے استاد ہیں، ان کی شاگردی سے انکار کر کے آپ نے راغب صاحب سے اچھا سلوک نہیں کیا کیونکہ اب وہ اپنی تصنیف ہی کو زندگی کا حاصل اور سرمایۂ فخر سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ہم راغب صاحب کی خدمت میں بھی عرض کر دیں گے کہ وہ جالب کے اعلان برأت سے آزردہ خاطر نہ ہوں اور ان کی جگہ کسی اور مشہور شاعر کو اپنی شاگردی میں لے لیں۔ ہمارے خیال میں اس ضرورت کو فیض احمد فیض پورا کر سکتے ہیں۔ فیض صاحب کی طرف سے تردید کا اندیشہ تو کیا امکان بھی نہیں ہے۔ ہاں اس کا اندیشہ ہے کہ بعض لوگ یہ کہیں گے کہ فیض کے کلام میں زبان و بیان کی بعض اغلاط پائی جاتی ہیں، راغب صاحب جیسے زبان دان اور قادرالکلام شاعر کا کوئی بھی شاگرد ایسی غلطیاں نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فیض تمیذ الرحمٰن تھے، راغب صاحب کے شاگرد نہیں تھے۔ اس قسم کی باتیں کہنے والوں کو یہ جواب دے کر خاموش کیا جا سکتا ہے کہ فیض کے کلام کے جس حصے میں فنی اسقام موجود ہیں، وہ شاگردی اختیار کرنے کے زمانے سے پہلے کا ہے۔

راغب صاحب نے اپنے انٹرویو میں اعتراف کیا ہے کہ وہ دوسروں کو شعر لکھ کر دیتے ہیں اور انھوں نے بہت سے متشاعروں کو شاعر بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا موقف یہ ہے کہ خدا اگر کسی کو دولت دیتا ہے تو وہ اسے خدا کی راہ میں صرف کر دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو دولتِ سخن مل جائے تو اسے دوسروں میں تقسیم کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ راغب صاحب نے یہ بھی بتایا کہ وہ دوسروں کو جو کلام لکھ کر دیتے ہیں، اس کا کوئی معاوضہ قبول نہیں کرتے۔ فرماتے ہیں: ”میرے بیرون ملک جو شاگرد ہیں وہ چیک وغیرہ بھیج دیتے ہیں لیکن میں شکریے کے ساتھ واپس کر دیتا ہوں۔“

راغب صاحب کی یہ اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ اپنی دولتِ سخن کو ضرورت مندوں اور محتاجوں پر بے دریغ صرف کرتے ہیں۔ ان جیسا مخیّر اردو ادب کی تاریخ میں کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔

یہاں ہمیں ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جس کا اوپر کی عبارت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں ہم اسے اس لیے لکھ رہے ہیں کہ کہیں یہ واقعہ ذہن سے نکل نہ جائے۔

ایک بخیل شخص کے پاس بہت سے کھوٹے سکے تھے۔ جب کوئی اندھا گداگر آتا تو وہ اسے

ایک سکہ دے دیتے۔ ایک مرتبہ اس نے آنکھوں والے ایک گداگر کو غلطی سے ایک کھوٹا سکہ دے دیا۔ اس نے سکہ دیکھ کر کہا، "یہ میرے کس کام آئے گا۔" مخیّر نے جواب دیا۔ "اس سے میں نے جو کام لیا ہے، وہی کام تم بھی لو یعنی کسی ضرورت مند کو دے دو۔"

انٹرویو لینے والے نے راغب صاحب سے کہا، "جو آپ سے شعر مانگتا ہے، آپ اسے شعر دے دیتے ہیں، لیکن اس سے خراب صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔ ایک منفی پہلو سامنے آتا ہے۔"

راغب صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا، "منفی پہلو تو ہے لیکن بالفرض میں یہ غلطی نہیں کروں گا تو بعض حضرات ایسے بھی ہوں گے جو یہ کرتے ہوں گے۔"

راغب صاحب نے یہاں انکسار سے کام لیا ہے۔ آج اُردو دنیا میں ان کے علاوہ کون ہے جو دوسروں کو شعر لکھ کر دے سکتا ہو۔ یہ نیکی سوائے ان کے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اگر بفرضِ محال ایسا کوئی شخص ہے بھی تو وہ راغب صاحب ہی کے خوانِ سخن کا زلہ ربا ہوگا۔ ان سے تھوک کے بھاؤ غزلیں لے کر پرچون میں تقسیم کر دیتا ہوگا۔

راغب صاحب کی یہ عظمت ہے کہ وہ نیکی کر کے دریا میں ڈال دیتے ہیں (کہ یہ نیکی ہوتی ہی اسی لائق ہے) لیکن علامہ سیماب اکبر آبادی ایسا نہیں کرتے تھے۔ وہ نیکی کر کے دوسرے کی جیب میں ڈالتے تھے اور جیب میں جو کچھ ہوتا تھا، خود رکھ لیتے تھے۔ اس وقت اتفاق سے ماہنامہ "پیمانہ" آگرہ کا دسمبر ۱۹۲۳ء کا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ اس میں پورے صفحے کا ایک اشتہار ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ سیماب نے دارالترجمہ و دارالاصلاح کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ اس کے دو شعبے تھے، ایک ترجمے کا اور دوسرا اصلاحِ سخن کا۔ دوسرے شعبہ کے متعلق اشتہار کی عبارت یہ ہے:

"اس شعبے میں اُردو فارسی اور عربی کلام پر بالمعاوضہ اصلاح (بصیغۂ راز) دی جائے گی اور ہر قسم کی فرمائشی کتابیں حسب مرضی محرک کے نام سے تصنیف و تالیف ہو سکیں گی...... اگر آپ کو کسی خدمت کی ضرورت ہو تو بلا تکلف اطلاع دیجیے اور شرائط کار طلب فرمائیے۔"

یہ ادارہ ۱۹۳۷ء تک کام کرتا رہا۔ علامہ سیماب نے دوسروں کے نام سے نہ جانے کیا کیا کچھ لکھا ہوگا۔ سنا ہے کہ اس ادارے کا سارا ریکارڈ اور غیر فروخت شدہ کلام علامہ سیماب کے پوتے، مشہور شاعر اور رسالہ "شاعر" کے مدیر افتخار امام صدیقی کے پاس تھا۔ افسوس کہ انھوں نے سارا ریکارڈ ضائع کر دیا، ورنہ دنیائے ادب میں جو بڑے بڑے نام نظر آتے ہیں، ان کے بارے میں ہماری ساری خوش فہمیاں رفع ہو جاتیں۔ افتخار امام صدیقی نے البتہ یہ اچھا کام کیا کہ دارالاصلاح کا جو غیر فروخت شدہ کلام انھیں ورثے میں ملا تھا، اسے ضائع نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کا شمار اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔

ایک کالم احمد فراز کے نام

(۱)

اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ احمد فراز آج کے دور کا مقبول ترین شاعر ہے۔ اس کی مقبولیت کے اسباب کے بارے میں البتہ دو سے زیادہ رائیں پائی جاتی ہیں اور مقبولیت کا اظہار جن طریقوں سے ہوا ہے، ان میں سے بعض پر حدود آرڈی نینس کے تحت کارروائی ہو سکتی ہے۔ مگر ان سب باتوں پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے، پہلے یہ بتا دیا جائے کہ احمد فراز پر کالم لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے۔

صوبہ سرحد میں جن لوگوں نے اُردو ادب کو مقبول بنایا ہے، ان میں فارغ بخاری، رضا ہمدانی اور خاطر غزنوی کے بعد تاج سعید کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے پہلے رسالہ ''قند'' جاری کیا اور اب ''جریدہ'' کے ذریعے ادب و زبان کی بے مثال خدمت کر رہے ہیں۔ انھوں نے ممتاز شیریں، راجندر سنگھ بیدی، مجید امجد اور دوسرے کئی ممتاز ادیبوں کے بارے میں اپنے رسالوں کے جو خصوصی شمارے شائع کیے ہیں، وہ ان ادیبوں کی تفہیم کے لیے بنیادی دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لاہور اور کراچی جیسے بڑے طباعتی و ادبی مرکزوں سے رسالے نکالنا کوئی مشکل کام نہیں ہے، لیکن پشاور جیسے شہر میں رہ کر ایک ایسے شخص کا جس کے وسائل محدود ہوں، رسالوں کے ضخیم نمبر شائع کرنا، بڑی ہمت کی بات ہے۔ حال ہی میں تاج سعید نے ''جریدہ'' کا احمد فراز نمبر شائع کیا ہے، اس کی ترتیب میں ان کی بیگم زیتون بانو بھی برابر کی شریک ہیں۔ زیتون بانو پشتو کی معروف افسانہ نگار ہیں۔

ساڑھے چھ سو صفحات کے اس ضخیم نمبر میں احمد فراز کی شخصیت اور فن کے بارے میں چالیس کے قریب مضامین ہیں، نصف درجن انٹرویو ہیں، اور آخر میں انتخاب کلام ہے جو موجودہ

دور کے ایک اور مقبول شاعر افتخار عارف کی سخن شناسی اور سخن فہمی کا آئینہ ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی روایت کے مطابق غالب کے اُردو کلام کا انتخاب مولانا فضل حق خیر آبادی نے کیا تھا، جو غالب کے دیوان کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو افتخار عارف، احمد فراز کے مولانا خیر آبادی ہیں، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ مولانا نے غالب کے بہت اچھے اشعار انتخاب میں شامل نہیں کیے تھے، افتخار عارف کی نگاہ انتخاب میں بہت سے خراب شعر بھی اعتبار حاصل کر گئے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ افتخار عارف، مولانا خیر آبادی کے مقابلے میں صاحب علم نہ سہی ان سے زیادہ وسیع النظر اور کشادہ دل ہیں۔

غالب کا ذکر آیا ہے تو یہ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں کہ بعض لوگ احمد فراز کو غالب کے پایے کا شاعر سمجھتے ہیں۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ غالب کے کلام کی طرح فراز کا کلام ارباب نشاط میں بے حد مقبول ہے۔ وزیر اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو فراز کو غالب جیسا بین الاقوامی سطح کا شاعر سمجھتی ہے۔ ''جریدہ'' میں ان کا جو پیغام شائع ہوا ہے، اس میں انھوں نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ غالب کی طرح فراز کی شاعری کے ترجمے بھی دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اگر کلام کا ترجمہ ہونا ہی کسی کے بین الاقوامی شاعر بن جانے کا سبب ہو سکتا ہے تو صرف لاہور میں ایک درجن شاعر ایسے مل جائیں گے جن کی شاعری کے تراجم غیر زبانوں میں ہو چکے ہیں، لیکن وہ بے چارے بین الاقوامی شاعر تو کیا بنتے مقامی شاعری کی سطح سے بھی بلند نہیں ہو سکے۔

غالب و فراز میں مماثلت کی جو دلیل تاج سعید نے پیش کی ہے، وہ خاصی معقول ہے۔ رسالے کے ابتدائیے میں وہ لکھتے ہیں:

''مرزا غالب دہلی کے ایک کوچے بلی ماراں میں رہتے تھے تو احمد فراز نے پشاور کے ایک کوچے چڑی ماراں میں زندگی کے ابتدائی دن گزارے۔''

بلی ماراں اور چڑی ماراں میں صوتی یکسانیت ہی نہیں معنوی مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ بلی ماراں ملاحوں کا محلّہ تھا، یہ ملاح بلیوں سے یعنی بانسوں سے کشتیاں کھینچتے تھے۔ محلّہ چڑی ماراں میں وہ لوگ رہتے تھے جو پرندوں کو پکڑنے کے لیے بانس استعمال کرتے تھے، جن پر لاسا لگا ہوتا تھا۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ ان محلوں میں بلی مار رہے نہ چڑی مار صرف بانس باقی رہ گئے۔ لہٰذا اب یہ شاعروں کے قد و قامت ناپنے کے کام آتے ہیں۔

غالب کی طرح فراز کے میر سے موازنے کی بھی ضرورت تھی۔ پروین شاکر نے نہایت خوش اسلوبی سے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں فراز کا یہ شعر

کہاں ہے دوست کہ آشوب دہر سے میں نے
ترے خیال کی آسودگی بچالی ہے

لکھ کر یہ فرمایا ہے:

"یہ آسودگی خیال ہی تک محدود نہیں، اس کی حدیں جہاں تک جاتی ہیں بلکہ وصال تک۔ فراز نے اپنے عشق میں کامیابیوں سے وہی کام لیا ہے جو میر نے ناکامیوں سے لیا۔ دونوں کا سلیقہ منفرد بنا دیتا ہے۔"

پروین شاکر نے فراز کی کامیابیوں کی جو تفصیل بتائی ہے وہ خاصی دلچسپ ہے۔ محترمہ نے پہلے تو یہ فرمایا ہے کہ جس طرح بعض لوگ Chain Smoker ہوتے ہیں، اسی طرح [illegible] Chain Lover ہیں اور پھر یہ لکھا ہے:

"مشتاق احمد یوسفی کا کہنا ہے کہ مرد پہلی بار عشق کرتا ہے، دوسری بار بدمعاشی اور تیسری بار نرم عیاشی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ فراز کو اپنی عمر کے اس سے پہلے Phase سے نکلے ہوئے زمانہ گزر گیا مگر اس کی شاعری میں نرم عیاشی تو دور کی بات ہے، بدمعاشی بھی خال خال ہی نظر آتی ہے۔ اس سنبھلے ہوئے رویے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ جواب خود فراز نے فراہم کر دیا کہ "ساری [illegible] محبت میں رکھ رکھاؤ کی ہے۔"

گویا محترمہ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ خال خال بدمعاشی والا سنبھلا ہوا رویہ محبت میں رکھ رکھاؤ [illegible] وہ سلیقہ ہے جو فراز کو میر کے برابر بٹھا دیتا ہے۔ میر صاحب زندہ ہوتے تو فراز کی ہم نشینی سے [illegible] ہوتے، ہم جیسے مداحان فراز بھی خوش ہیں کہ پروین شاکر ترقی کے مراحل نہایت تیزی سے [illegible] رہی ہیں۔ پہلے انھوں نے بے مثال شاعرہ کی حیثیت سے شہرت حاصل کی، پھر [illegible] مزاحیہ کالم لکھ کر نام پیدا کیا، اور اب انھوں نے تنقید نگاری کے ذریعے ادب کو باثروت [illegible] طرف توجہ کی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ پروین شاکر جب شعر کہتی ہیں تو قدرے [illegible] طرح خاصی رنجیدہ نظر آتی ہیں۔ لیکن جب نثر لکھتی ہیں تو مزاح سے کام لیتی ہیں [illegible] جس طرح نظیر صدیقی اپنے مزاحیہ مضامین یعنی انشائیوں میں علم سے کام لیتے ہیں [illegible]

علم کو تنقیدی مضامین میں بآسانی صرف کر سکتے تھے۔

پروین شاکر نے یہ بھی بتایا ہے کہ فراز کے مجموعے "تنہا تنہا" کا مطالعہ کرنے کے دوران ایک نظم کا سال تصنیف ۱۹۵۲ء دیکھ کر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں کیونکہ اس نظم کا اور ان کا سال ولادت ایک ہی ہے۔ ہم اس بات پر مسکرائیں گے نہ کوئی تبصرہ کریں گے۔ محترمہ سرفراز اقبال کے حوالے سے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے، وہ ہم سنائے دیتے ہیں۔ یہ محترمہ وہی ہیں جنھوں نے فیض صاحب کے بارے میں "دامن یوسف" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اور جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے عرض کیا تھا کہ کتاب کا نام اگر "دامن تار تار" ہوتا تو اچھا تھا۔ ہمارا یہ تبصرہ محترمہ کو اتنا [illegible] آیا تھا کہ انھوں نے اسے کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے عقبی سرورق پر جلی حروف میں چھاپا [illegible] ان محترمہ نے ایک دفعہ فیض صاحب سے کہا: "آپ کی کتاب نقش فریادی جس سال شائع [illegible] میں اسی سال پیدا ہوئی تھی۔" فیض صاحب نے جواب دیا، "ہاں بھئی ہمیں معلوم [illegible] اس واقعے کی یادگار کے طور پر ہم نے کتاب چھاپی تھی اور اس کا نام بھی اسی مناسبت سے رکھا [illegible]

فراز کی مقبولیت کے اسباب پر زیر نظر خاص نمبر کے کئی مضمون نگاروں نے خامہ فرسائی کی [illegible] فراز کی خدمت میں بطور نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا ہے، اس لیے بعض مضمون [illegible] راست اپنی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ بندوق دوسروں کے کندھوں پر رکھ کر چلائی [illegible] لکھتے ہیں:

"[illegible] کہتے ہیں کہ یہ (مقبولیت) اس کی شخصیت کا اعجاز ہے۔ وہ HE MAN ہے، [illegible] ہے۔ اسی پہلو کو کچھ لوگ اس انداز سے دہراتے ہیں کہ اس کی مقبولیت اس کے [illegible] کی بنا پر ہے، کچھ اسے ترقی پسند گروہ کی ملی بھگت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، زیادہ تر [illegible] کہ فراز کی مقبولیت پہلے ریڈیو اور اب ٹیلی وژن پر اس کی غزلیں گانے والوں کا [illegible]

[illegible] میں فراز کی مقبولیت کے جو اسباب بیان کیے گئے ہیں، وہ غلط فہمیوں اور غلط [illegible] ادب میں فراز سے کہیں زیادہ وجیہہ اور بذلہ سنج موجود ہیں لیکن ان [illegible] ان کے کسی کام نہیں آئی۔ یہ بھی غلط ہے کہ فراز کی مقبولیت اس کے

معاشقوں کی وجہ سے ہے، معاملہ اس کے برعکس ہے، یعنی مقبولیت کی وجہ سے فراز کو عشق و عاشقی کا سوانگ رچانے کے مواقع ملتے رہے ہیں۔ مقبولیت کو ترقی پسند گروہ کی ملی بھگت کا نتیجہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ فراز صرف ترقی پسند نہیں، ایک اچھا شاعر بھی ہے۔ کسی اچھے شاعر کو باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے آگے بڑھانا ترقی پسندوں کا شیوہ نہیں رہا، انھوں نے ہمیشہ غیر شاعروں کو شاعر ثابت کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کی ہیں۔ یہ بھی درست نہیں کہ فراز ان کی وجہ سے مقبول ہوا جنھوں نے ان کی غزلیں گائیں۔ فراز کی غزلیں گانے والوں میں کوئی بھی اختری بائی فیض آبادی کے پائے کا نہیں ہے، اختری بائی نے زندگی بھر بہزاد لکھنوی کی غزلیں گائیں، لیکن بہزاد مقبول شاعر نہ بن سکے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب بیان کردہ سارے اسباب غلط ہیں تو پھر فراز کی اس مقبولیت کا سبب کیا ہے؟ ہم نے بہت سوچا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے، بالآخر استاد لاغر مرادآبادی نے ہی اس مسئلے کو حل کیا۔ انھوں نے فرمایا: ”میں جب فراز کا کلام پڑھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں سولہ سے پچیس برس تک کی عمر والے زمانے میں پہنچ گیا ہوں۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو قارئین سولہ سے پچیس برس کی عمر کے ہیں ان پر کیا قیامت گزرتی ہوگی، یہی قیامت فراز کی مقبولیت کا سبب ہے۔“

”جریدہ“ میں فارغ بخاری نے فراز کا نہایت عمدہ شخصی خاکہ لکھا ہے۔ انھوں نے فراز کے بارے میں بہت سی نئی باتیں بتائی ہیں، مثلاً یہ کہ پہلے ان کا نام گوہر سرحدی تھا، پھر وہ شرر برقی ہو گئے، آخر میں وہ احمد فراز ہوئے اور تادم تحریر اسی نام سے مشہور ہیں۔ حیرت ہے کہ فراز نے شرر برقی جیسا خوب صورت نام کیوں ترک کیا۔ معنوی اعتبار سے یہ نام ان پر جچتا ہے۔ اس کی تصدیق فارغ بخاری کے اس بیان سے ہوتی ہے:

”بعض لوگ ذہنی طور پر مرتے دم تک بچے ہی رہتے ہیں اور کوئی بھی ان کا [illegible] سکتا۔ فراز کی ذہنی بلوغت سے انکار نہیں لیکن وہ اب بھی عمر رسیدہ بچہ ہی لگتا ہے ..... عورت اس کی کمزوری بھی ہے اور اس کی زندگی اور شاعری کا محور بھی، اس کے معاشقوں کا کوئی شمار نہیں، وہ ہر نئے شکار پھانسنے میں مشتاق ہے اور اب تو اسے تکلف کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، شکار خود اس کی تاک میں رہتے ہیں ..... لڑکیاں سگریٹ کے نئے برانڈ کی طرح اس کے بریف کیس میں ہوتی ہیں، جس برانڈ کو جی چاہا پیکٹ کھول کر سگریٹ سلگایا اور چند کش لے کر اسے پھینک دیا، دوسرے برانڈ کا سگریٹ سلگایا ...... وہ زندگی کے کسی معاملے میں سنجیدہ نہیں، آوارگی اس کا اوڑھنا بچھونا ہے، کسی ایک جگہ پر ٹک کر بیٹھنا یا کسی ایک چیز پر قناعت کرنا اس کے بس کا روگ نہیں۔ اسی میں اس کی فنی ترقی کا راز ہے۔ جس دن اس نے نیکی اور پاکبازی کا راستہ اختیار کیا، اسی دن اور کچھ نہ ہو تو کم از کم اس کے فن کی موت واقع ہو جائے گی۔“

(۲)

”جریدہ“ کے احمد فراز نمبر میں نصف درجن سے زیادہ انٹرویو شامل ہیں جن میں فراز نے اپنے اوپر عائد ہونے والے بہت سے پرانے الزامات کو رد کر دیا ہے، اور بہت سے نئے الزامات کے لیے راہ ہموار کی ہے۔ یہ انٹرویو بے حد دلچسپ ہیں اور ان سے فراز کی شخصیت کے بہت سے دل آویز گوشے بے نقاب ہوتے ہیں۔

فراز پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ فیض سے متاثر ہیں۔ اس بات کو بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ فراز پر فیض کے اثرات اتنے زیادہ ہیں کہ اگر انھیں الگ کر دیا جائے تو باقی کچھ نہیں رہ جاتا۔ لیکن یہ بات درست نہیں۔ فیض کے اثرات الگ کر دینے کے بعد بھی بہت کچھ بچ رہتا ہے۔ مثلاً بے شمار ردیفیں جو فراز کے ہاں ملتی ہیں، انھیں فیض نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ نئی ردیفیں استعمال کرنے میں فراز کا جواب نہیں۔ ان کے شعروں میں ردیف ہی سے معنویت پیدا ہوتی ہے جب کہ فیض کے شعروں میں ردیف سے پہلے ہی معانی مکمل ہو جاتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فراز نے فیض کا رنگ سخن ہی نہیں، ذخیرۂ الفاظ بھی ہتھیا لیا ہے۔ فیض کا ذخیرۂ الفاظ چونکہ بہت ہی محدود تھا، اس لیے چوری جلد ہی پکڑی گئی۔ فراز کو چاہیے تھا کہ وہ کسی بڑے شاعر کے ہاں ہاتھ کی صفائی دکھاتے تا کہ واردات پر پردہ پڑا رہتا۔ یہ الزام بھی درست نہیں۔ فیض کے ذخیرۂ الفاظ سے استفادہ کرنے کو سرقہ نہیں کہا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں شاعروں میں توارد کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ لفظی توارد کی ایک وجہ [illegible] ہو سکتی ہیں، خود اردو زبان کا ذخیرۂ الفاظ بھی بہت محدود ہے، یہ ممکن نہیں کہ ایک شاعر جو الفاظ استعمال کرے، انھیں کوئی دوسرا کام میں نہ لائے۔ ویسے بھی جہاں تک ہمیں معلوم

ہے فیض نے اپنی تصانیف کے جملہ حقوق تو محفوظ کرائے تھے، رنگِ سخن اور ذخیرۂ الفاظ کو کاپی رائٹ ایکٹ کے تحت رجسٹر نہیں کرایا تھا۔ لہٰذا فراز نے فیض کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اس سے قانونی یا اخلاقی ضابطوں کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر فیض نہ ہوتے تو فراز بھی نہ ہوتے۔ وہ زیادہ سے زیادہ گوہر سرحدی یا شرر برقی کی حیثیت سے جز وقتی شاعر ہوتے اور اپنا سارا وقت اپنے بعض دوستوں کی طرح کوہاٹ میں تمباکو کی تجارت میں صرف کرتے۔ لوگ بھی کیسی کیسی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ غالب نہ ہوتے تو اقبال نہ ہوتے۔ اقبال نہ ہوتے تو فیض نہ ہوتے، اور اب یہ کہا جانے لگا ہے کہ فیض نہ ہوتے تو فراز نہ ہوتے۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ غالب کا نام اقبال سے چلا، اقبال کا فیض سے اور اب فیض کا فراز سے چل رہا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اگر فراز نہ ہوتے تو آج فیض کو کوئی نہ پوچھتا تو بات معقولیت کی حدوں کے اندر رہتی کیونکہ جب بھی فراز کی کوئی نئی غزل شائع ہوتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے فیض نے انتقال کے بعد بھی مشقِ سخن جاری رکھی ہے۔

جو لوگ فراز کو کوہاٹ میں تمباکو کا تاجر دیکھنا پسند کرتے ہیں، ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ تجارت دوسروں کے لیے کافی مہلک ثابت ہوتی۔ تمباکو، جو پہلے ہی مضرِ صحت ہے، فراز کے ہاتھوں سے گزر کر، ان کے کلام کی طرح سریع التاثیر ہوجاتا۔

فراز پر فیض کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے سب سے زیادہ سفاکی کا مظاہرہ ساقی فاروقی نے کیا ہے۔ ساقی کی کتاب "بازگشت و بازیافت" میں فیض پر جو مضمون ہے، اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ایک روز لندن میں فراز کی موجودگی میں انھوں نے فیض سے کہا: "اب اس [illegible] فراز کو لیجیے۔ ادھر آپ نے لاہور میں ایک مرتبہ لفظ مقتل لکھا، ادھر اس نے پشاور سے [illegible] بھیجے۔ ادھر آپ نے ایک صلیب اٹھائی، ادھر یہ برادر پورا درخت کاٹ کر چل نکلا۔ نہ صرف یہ [illegible] آپ کی طرح اٹک اٹک کر مشاعروں میں شعر پڑھنے لگا ہے، آپ ہی کی طرح سگریٹ [illegible] بلکہ راکھ بھی آپ ہی کے انداز میں جھاڑتا ہے...... آپ کو تو لطف آتا ہے کہ لوگ آپ کی [illegible] رہے ہیں بلکہ آپ ان لوگوں کی پرورش بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ [illegible] بزرگ ہم عصر کی نقل کرنا اپنی موت کو دستک دینے کے مترادف ہے۔"

فیض نے ساقی کی ان باتوں کو ناقابلِ اعتنا قرار دیتے ہوئے جو کچھ کہا، بقول ساقی، اس کا خلاصہ یہ ہے: "فراز جو کچھ کر رہا ہے، اسے کرنے دو اور تم اپنے کام سے کام رکھو۔" ساقی کی گواہی اگر تسلیم کر لی جائے تو یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ فیض کو فراز کے شاعرانہ طرزِ عمل پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ جب فیض خوش ہیں تو پھر کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ فراز کو "فیض زدگی" کا طعنہ دے۔

آیئے دیکھیں کہ اس سلسلے میں خود فراز کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ فیض کی زندگی میں ان کے [illegible] ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

"فیض اتنے بڑے شخص ہیں کہ اگر میرا انداز ان سے کہیں مل جاتا ہے تو مجھے قطعی ندامت نہیں ہوتی۔ بلکہ ہم یہ سب کچھ فخر سے قبول کر لیتے ہیں۔ البتہ ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر فیض کا اور میرا انداز شاعری بالکل ایک جیسا ہوتا اور میرا ٹیلنٹ نمایاں نہ ہوتا تو پھر لوگ فیض کی کتابیں پڑھتے، لوگوں کو میری کتابیں خریدنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ کیونکہ اوریجنل کی موجودگی میں نقل کون پڑھے گا۔ فیض اگر مجھ سے محبت کرتے ہیں تو اس سبب سے کہ مجھ میں انھیں اپنا جوہر نظر آتا ہے۔ وہ سینئر ضرور ہیں اور میں جونیئر ہوں مگر میرا اپنا الگ، منفرد ٹیلنٹ تو ہے۔ میرا اپنا بھی ایک نام اور مقام ہے اور مجھے یکسر کالعدم کرنا آسان نہیں۔"

ہمارے خیال میں یہ جواب اتنا مدلل اور مسکت ہے کہ اب اس موضوع پر بحث ختم ہو جانی چاہیے۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ساقی فاروقی جیسے حریفانِ بادہ پیما خاموش نہیں ہوں گے۔ وہ اب اس مسئلے پر بحث شروع کر دیں گے کہ اوریجنل کی موجودگی میں نقل کو پڑھنا بے حد ضروری ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ نقل نویس نے اوریجنل سے کہاں کہاں انحراف کیا ہے۔

حریفانِ بادہ پیما دُردِ معقولات کے مرتکب ہو رہے ہیں، لہٰذا ہم ان کی باتوں کو نظر انداز کر کے اب خود فراز کی باتیں سنیں گے۔ وہ فرماتے ہیں:

"مجھ پر ایک الزام ہے کہ میں فیض کا تابع ہوں۔ اس میں حقیقت کچھ نہیں ہے۔ میری [illegible] ایک سوچے سمجھے اور منظم پروپیگنڈے کے طور پر ڈاکٹر وزیر آغا گروپ کی طرف [illegible] بات کی بنا پر کیا جا رہا ہے۔"

یہ بات قدرے مبہم ہے، اس لئے ہم نے وضاحت کے لئے ڈاکٹر وزیر آغا گروپ کے [illegible] ڈاکٹر انور سدید سے رابطہ کیا تو انھوں نے کہا کہ ہم نے کبھی فراز کو فیض کا تابع نہیں کہا،

کیونکہ وہ تابع نہیں، تابع مہمل ہیں۔ یہ بھی غلط ہے کہ ہم نے کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فراز کی شاعری کا غلط تجزیہ کیا ہے۔ اول تو فراز کی شاعری کے ساتھ سوچنے سمجھنے کی قید لگانا بے معنی ہے، دوسرے ہم ان کی شاعری کے خلاف یا حق میں پروپیگنڈا نہیں کرتے جس کی سطح فلمی گانوں سے بلند ہو۔

ڈاکٹر انور سدید ہم سے عمر میں چند روز بڑے ہیں، اس لیے ہم بزرگوں کی کسی بات کی تردید کو اخلاق کے منافی سمجھتے ہیں۔ تاہم انصاف کا درجہ اخلاق سے بڑا ہے، لہٰذا ہم نہایت ادب کے ساتھ عرض کریں گے کہ آپ نے فراز کے الزام کی تردید میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے فراز کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اب آپ پہلے سے زیادہ فراز کی مخالفت کر رہے ہیں۔ پہلے آپ فراز کو فیض کا تابع سمجھتے تھے، اب تابع مہمل سمجھتے ہیں۔ پہلے آپ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فراز کی شاعری کا غلط تجزیہ کرتے تھے، اب بلا سوچے سمجھے کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ فراز کی شاعری کو فلمی گانوں کی قسم کی کوئی چیز سمجھتے ہیں۔ یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ آرزو، جوش، ساحر اور مجروح فلمی گانے لکھیں تو آپ فرماتے ہیں، ادب تخلیق ہو رہا ہے، اور فراز ادب کی تخلیق کریں تو آپ طعنہ دیتے ہیں کہ وہ فلمی گانے لکھ رہے ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ فلمی گانے لکھنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑی محنت اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے نیز عشق و عاشقی کا وسیع تجربہ درکار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے گروپ کے کسی شاعر نے کبھی کوئی فلمی گانا لکھا تو کیا گایا بھی نہیں ہوگا۔

اگر کوئی شاعر صرف اپنی تعریف کرتا رہے تو اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا معاصر شعراء کی خامیوں کی نشاندہی کا ہوتا ہے۔ اس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ خام کاروں کے درمیان ایک پختہ کار بھی موجود ہے۔ احمد فراز نے اس طریق کار پر عمل کرتے ہوئے اپنے ہم عصروں کے بارے میں پہلے تو یہ مجموعی رائے دی ہے کہ ان میں بنیادی صلاحیت کا فقدان ہے اور وہ آگے بڑھنے کی طاقت نہیں رکھتے اور پھر فرداً فرداً ان کی مزاج پرسی کی ہے۔ محسن احسان کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کی ہر دوسری غزل میری غزل کا چربہ ہوتی ہے۔ فارغ بخاری کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے "وہ باقاعدہ تعلیم یافتہ نہیں ہیں، اس لیے نعرے بازی کو شاعری سمجھتے ہیں۔ خاطر غزنوی کو خود اعتمادی سے محروم بتایا ہے۔ وہ کبھی شاعری کرتے ہیں اور کبھی فوٹوگرافی۔ صحیح سمت کا تعین نہ ہونے کی

وہ خراب شاعر بن گئے۔ رضا ہمدانی محدود ماحول کے اسیر تھے، اس لیے چھوٹی چھوٹی گروہ بندیوں میں مصروف ہو کر شاعری کا حق ادا نہ کر سکے۔ امجد اسلام امجد کی تعریف میں بخل سے کام لیا ہے اور کہا ہے، بعض دفعہ اچھی نظم کہتا ہے۔ کوثر نیازی اور ضیاء جالندھری کو یہ طعنہ دیا ہے کہ ریڈیو اور ٹی وی سے ان کی غزلیں اس وقت نشر ہوتی تھیں جب وہ حکومت میں تھے۔ ساقی فاروقی کے بارے میں یہ رائے دی ہے، وہ بچھوے اور مینڈک کی تعریف میں نظمیں لکھتے ہیں، ان کی شاعری کا انسانی معاشرے سے کوئی تعلق نہیں۔

دو شاعروں کے بارے میں فراز نے ایسی رائے دی ہے کہ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں فراز بقول خود "خاکی وردی والوں" کے خلاف ایک نظم لکھنے کی پاداش میں گرفتار ہو گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی سفارش پر وہ رہا ہوئے۔ رہائی کے بعد بھٹو صاحب نے فراز سے کہا، "فراز لکھتے رہو۔" فراز نے جواب دیا، "میں جالب یا جمیل الدین عالی کی طرح کا شاعر نہیں ہوں، میں شاعری اپنے انداز کے مطابق جاری رکھوں گا۔"

بھٹو صاحب کی یہ بات اور فراز کے جواب میں کوئی معنوی ربط نظر نہیں آتا۔ ہم نے بہت غور کیا کہ بھٹو صاحب نے آخر ایسی کیا بات کہی ہوگی جس کے جواب میں فراز کو دو ہم عصر شاعروں کو بیچ میں لانے کی ضرورت پیش آئی۔ جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئی تو حسب معمول استاد لاغر مراد آبادی نے اس معمے کو حل کیا۔ انھوں نے فرمایا، "بھٹو صاحب نے یقیناً یہ کہا ہوگا کہ جالب اور عالی کی طرح ترنم سے کلام سنایا کرو۔ ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں فراز کو یہی کہنا چاہیے تھا کہ وہ جالب اور عالی کی طرح کے شاعر نہیں ہیں، اس لیے اپنے انداز میں شاعری کرتے رہیں گے۔"

فراز نے معاصرین ہی کے بارے میں سچ نہیں بولا، اپنے آپ کو بھی کھری کھری سنائی ہیں۔ فرماتے ہیں:

"میرے والد عالم فاضل ہونے کے باوجود میری تعلیم کے سلسلہ میں سرد مہری سے کام لیتے رہے ہیں۔ ہمارے استاد ذہانت کے اعتبار سے ٹھوس نہیں تھے ...... جنھوں نے ہمیں پڑھایا وہ بھی گئے گزرے تھے ...... میں علم کا کوئی شعبہ بھی باقاعدہ طور پر پڑھ نہ سکا ...... مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی خوف نہیں کہ مجھے آوارگی کے علاوہ نہایت سنجیدگی سے علم حاصل کیا تھا۔"

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ فراز نے اپنے والد محترم اور اساتذہ کرام کی شان میں گستاخی کی ہے۔ لیکن ایسا کہنا حقیقت کے منافی ہوگا۔ فراز نے تو محض اس پر اظہار افسوس کیا ہے کہ وہ ناسازگار حالات کی وجہ سے علم حاصل نہ کر سکے۔ حالانکہ اس میں افسوس کی کوئی بات نہیں۔ فراز کو معلوم ہونا چاہیے کہ شاعری کے لیے علم ضروری نہیں ہوتا۔ بلکہ مقبول عام شاعری علم کے بغیر ہی تخلیق کی جا سکتی ہے۔ عبدالعزیز خالد کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان جیسا صاحب علم شاعر اردو زبان کی تاریخ میں کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، اسی لیے ان کے شعری مجموعے، علمی مقالات کے مجموعے نظر آتے ہیں۔ اگر احمد فراز بھی علم حاصل کر لیتے تو پھر ہمارے پاس ایک کی بجائے دو عبدالعزیز خالد ہوتے جس کے نتیجے میں اردو زبان کے لیے تنگیٔ داماں کا مسئلہ پیدا ہو جاتا۔

احمد فراز نے یہ بات بڑی مزے کی کہی ہے کہ ''مجھے آوارگی کے علاوہ نہایت سنجیدگی سے علم بھی حاصل کرنا چاہیے تھا۔'' لفظ ''علاوہ'' کا ایسا استعمال تو فیض صاحب کے بس میں بھی نہیں تھا۔ گویا فراز یہ چاہتے ہیں کہ وہ آوارگی بھی کرتے رہتے اور ساتھ ساتھ سنجیدگی سے علم بھی حاصل کرتے رہتے۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص منجدھار میں ڈوب رہا ہو اور اس دوران تیراکی کا فن سیکھنے کی کوشش بھی کرتا رہے۔

لفظوں کے استعمال کے سلسلے میں فراز نے کئی جگہ اور بھی اپنی مہارت کا خوبصورت اور ناقابل تقلید اظہار کیا ہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آج کل آپ کی مقبولیت میں کچھ کمی تو نہیں آ رہی؟ فراز نے جواب دیا، ''بالکل نہیں، میں زیادہ فروخت ہونے والا شاعر ہوں۔'' بعض کم فہم ''زیادہ'' کا مطلب ''ایک سے زیادہ مرتبہ'' بھی لے سکتے ہیں۔

اس طرح ان سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ نے اب تک کتنے معاشقے کیے ہیں؟ فراز نے جواب دیا، ''ٹھیک ٹھاک عشق کیے ہیں، ایمانداری سے کیے ہیں اور پوری شدت سے کیے ہیں۔'' ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ جہاں عشق اور ہوس میں امتیاز نہ کیا جائے وہاں ایمانداری کا ذکر بے معنی ہے۔ معترضین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ لفظ ''ایمان'' کے کئی معنی ہیں۔ ایک معنی بے خوفی کے بھی ہیں۔ فراز نے یہ لفظ انھی معنی میں استعمال کیا ہے۔

تنقید یا خندۂ استہزاء

مظفر علی سید نقاد کی حیثیت سے جتنے منظم آدمی ہیں، آدمی کی حیثیت سے اتنے ہی غیر منظم ہیں۔ وہ پچھلے ۴۵ برسوں سے لکھ رہے ہیں۔ اس دوران میں انھوں نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ اگر وہ چاہتے تو اپنی منتشر تحریروں کو مرتب کر کے آٹھ دس کتابیں شائع کر سکتے تھے۔ لیکن انھیں صاحب کتاب بننے کا خیال کبھی نہیں آیا۔ ایک ایسے زمانے میں جب ادیبوں کی پیدائش اور ان کے صاحب کتاب ہونے کی مدت برائے نام رہ گئی ہے، سید صاحب کی بے نیازی ایک سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ یہ بے نیازی ان کے لئے خاصی نقصان دہ ثابت ہوئی ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ اردو ادب کے اہم نقاد ہیں، لیکن ان کی تحریروں کی عدم دستیابی کی وجہ سے ان کی ادبی خدمات کا مناسب اعتراف نہیں کیا گیا۔

سید صاحب کے ہم جیسے نیاز مندوں نے جب بھی ان سے مضامین کے مجموعے شائع کرنے کے لیے کہا، انھوں نے یہ عذر پیش کیا کہ ان کے پاس مضامین کی نقلیں ہیں نہ وہ رسالے ہیں جن میں یہ مضامین شائع ہوئے تھے۔ ہم نے ایک مرتبہ سید صاحب کو چھیڑنے کی خاطر اپنے کالم میں لکھا تھا کہ موصوف اپنے وزیٹنگ کارڈ کو ہی اپنی تصنیف سمجھتے ہیں۔ یہ تصنیف اتنی مقبول ہوئی کہ ہر سال اس کا نیا ایڈیشن چھپتا ہے۔ سید صاحب نے اس چھیڑ خانی کا کوئی اثر نہ لیا اور ایک خندۂ استہزاء کے ساتھ فرمایا، ''جو لوگ وزیٹنگ کارڈ کو بھی تلفظ کی غلطیوں کے بغیر نہیں پڑھ سکتے، انھیں تصنیف و تالیف کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔''

خدا بھلا کرے سید صاحب کے واحد دوست انتظار حسین کا، کہ انھوں نے پاکستان کی واحد بااخلاق خاتون شیما مجید کو سید صاحب کے مضامین جمع کرنے کے کام پر لگا دیا۔ انتظار حسین کو ہم نے

واحد دوست اس لیے کہا ہے کہ سید صاحب اتنے سخت گیر نقاد ہیں کہ ان کے دل میں دوستوں کے لیے بھی کوئی نرم گوشہ نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ کسی دوست کے ادبی کاموں میں رائے ظاہر کرتے ہیں تو وہ دوست ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ اس حکمت عملی کے نتیجے میں سب دوست ایک ایک کر کے جدا ہو چکے ہیں۔ بس ایک انتظار حسین رہ گئے ہیں جو کچے دھاگے کے ساتھ بندھے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کے لیے اختلاف رائے کی آزادی قبول کر رکھی ہے۔ اس آزادی کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ سید صاحب اپنے معاصرین کے بارے میں جو کچھ لکھتے ہیں، اسے انتظار حسین پڑھتے ہی نہیں۔

شیما مجید کو ہم نے پاکستان کی واحد محقق خاتون اس لیے کہا ہے کہ ادب سے دلچسپی لینے والی خاتون کے غول بیابانی میں وہی ایک ایسی ہیں، جنھیں دید و دریافت اور تلاش و تحقیق سے دلچسپی ہے، باقی سب شاعری اور افسانہ نگاری کا شوق رکھتی ہیں۔ شاعری اور افسانہ نگاری کے موضوعات تو راستے میں پڑے ہوئے مل جاتے ہیں، اس لیے تلاش و تحقیق کی ضرورت نہیں پڑتی۔ شیما مجید کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ اہم ادیبوں کی ان تحریروں کا سراغ لگاتی ہیں جو رسالوں میں دفن ہیں اور جو کبھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئیں۔ پچھلے آٹھ دس برسوں میں انھوں نے پطرس، فیض، میرا جی، محمد حسن عسکری، مختار صدیقی اور دوسرے کئی ادیبوں کی گمشدہ تحریروں کو تلاش کر کے مرتب کیا ہے۔ کئی مجموعے وہ شائع کر چکی ہیں اور کئی زیر طبع ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی کار شناس اور کارگزار خاتون کے لیے مظفر علی سید کے مضامین تلاش کرنا کچھ مشکل کام نہیں تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں انھوں نے سید صاحب کے بے شمار مضامین تلاش کر کے ان کے سامنے رکھ دیے کہ وہ انھیں کتابی صورت میں مرتب کر دیں۔

اب سید صاحب کے لیے کوئی راہ فرار نہ رہی اور مجبوراً انھیں کام کرنا پڑا جس کے نہ کرنے کے لیے وہ طرح طرح کے عذر ہائے لنگ ایجاد کرتے رہتے تھے۔ خوشی کی بات ہے کہ سید صاحب نے اپنے مضامین کو موضوع وار مرتب کرنا شروع کر دیا ہے۔ پہلی جلد "تنقید کی آزادی" کے نام شائع ہو گئی ہے۔ اس میں وہ مضامین شامل ہیں جو تنقید کے منصب اور بعض اہم نقادوں کے بارے میں ہیں۔ یہی مجموعہ ہمارے سامنے ہے۔ اس میں دو درجن کے قریب مضامین ہیں جو ۱۹۵۵ء سے ۱۹۹۴ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل جو مضامین ۳۰، ۴۰ برس

پہلے کے ہیں، آج بھی اتنے ہی تازہ ہیں جتنے اس وقت تھے جب یہ لکھے گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مضامین میں ان ادبی مسائل سے بحث کی گئی ہے جو ہمارے ادب میں مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ ایک نہایت سنجیدہ علمی کتاب ہے جس میں ایک طرف فراق، اختر حسین رائے پوری اور محمد حسن عسکری جیسے اہم نقادوں کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور دوسری طرف فن تنقید کے بنیادی مسائل پر فکر انگیز گفتگو کی گئی ہے۔ تنقید کا منصب کیا ہے؟ تنقید کی آزادی کسے کہتے ہیں؟ تنقید ہماری کس ضرورت کو پورا کرتی ہے؟ تحقیق و تنقید اور تخلیق و تنقید کا باہمی تعلق کیا ہے؟ ایسے بہت سے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے مظفر علی سید نے جہاں سنجیدگی سے دعوت فکر دی ہے، وہیں گل افشانی گفتار کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ مضحکہ خیز تصویریں بھی پیش کی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے ادیب اور شاعر نقاد سے "یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہر وقت اور ہر لحظہ انھیں کی تعریف و توصیف قلم بند کرتا رہے جبھی وہ تعمیری تنقید کا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ گویا ہمارے زمانے میں نقاد کا یہ کام رہ گیا ہے کہ وہ ادیبوں کی پبلسٹی کرتا پھرے۔ جس طرح ہر بڑی سیاسی شخصیت کے ساتھ ایک عدد پبلک ریلیشنز آفیسر لگا ہوتا ہے، اسی طرح ہر ادیب و شاعر کے ساتھ ایک نقاد بھی ہونا چاہیے جو محل بے محل ان کا بگل بجاتا پھرے۔ شاید ہمارے زمانے کے نقاد یہ فرض انجام دے لیتے اور چند ایک نے اس کی کوشش بھی کی، مگر وقت یہ آن پڑی کہ مملکت خداداد کا ہر تیسرا شخص خود کو (اور فقط خود کو) ادیب و شاعر سمجھتا ہے اور اپنے ساتھ غالب و اقبال سے کمتر درجے کے آدمی کا نام دیکھ سن نہیں سکتا، اس لیے نقاد بے چارہ کہاں تک تعمیری تنقید کرے۔"

اس مضمون کا یہ اقتباس ہے جو آج سے تیس برس پہلے لکھا گیا تھا۔ حیرت ہے کہ تیس برس پہلے جو صورت حال تھی، وہی من و عن آج بھی موجود ہے۔ بس اتنا فرق ہوا ہے کہ آج کل کے ادیب و شاعر، غالب و اقبال کو بھی اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں اور اپنی تعریف کے معاملے میں اس حد تک خود کفیل ہو گئے ہیں کہ اگر نقاد دستیاب نہ ہو تو یہ فریضہ بھی خود ہی انجام دے لیتے ہیں۔

تعمیری تنقید کی یہ حالت دیکھ کر ہی مظفر علی سید نے اپنے لیے جو راستہ اختیار کیا، اسے بعض لوگ تخریبی تنقید کا نام دیتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں اس تنقید کے نمونے بکثرت ملتے ہیں۔ مثلاً جہاں کہیں کسی ادبی گروہ، تحریک یا مصنفین کا ذکر آیا ہے، مظفر علی سید تیغ بے نیام بن جاتے ہیں۔ کہیں وہ

یہ لکھتے ہیں کہ ترقی پسندوں نے ادب کو عوام تک پہنچانے کا مصمم ارادہ کیا لیکن جو ادب تخلیق کیا، اس کا عوام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کہیں یہ بتاتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کے بعض داعیان ہر پرانے اور بڑے ادیب کو کھینچ تان کر ان معنوں میں ترقی پسند ثابت کرتے ہیں جن معنوں میں وہ خود کو ترقی پسند سمجھتے ہیں، حد تو یہ ہے کہ سید صاحب نے ترقی پسندوں کے اس خیال پر بھی ناراضی کا اظہار کیا ہے کہ اگر علامہ اقبال کچھ روز اور زندہ رہ جاتے تو کمیونسٹ ہو جاتے۔ ہماری رائے میں اس میں ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں۔ علامہ اقبال کا کمیونسٹ ہونا ان کے کچھ دن اور زندہ رہ جانے کے ساتھ مشروط ہے۔ جب ترقی پسند تحریک اپنے مقررہ وقت سے ایک دن زیادہ زندہ نہیں رہ سکی تو علامہ اقبال اپنے مقررہ وقت سے چند روز زیادہ کیسے زندہ رہ سکتے تھے۔ وہ بہر حال ایک فانی انسان تھے۔

سید صاحب نے بعض معاصرین کے بارے میں رائے دیتے ہوئے بھی تخریبی تنقید کے نمونے پیش کیے ہیں۔ مثلاً انیس ناگی کے متعلق لکھا ہے کہ "بسیار نویسی کے باوجود انھیں زبان پر دسترس نہیں ہے۔" یہ کون نہیں جانتا کہ بسیار نویسی اور زبان پر دسترس ایک دوسرے کی ضد ہے۔ گویا سید صاحب انیس ناگی کی تحریروں میں اجماع ضدین دیکھنے کے آرزو مند ہیں۔ یہ آرزو مندی تنقید کو تخریبی عمل بنا دیتی ہے۔

عبداللہ حسین کی تحریروں میں پنجابی الفاظ کی جو آمیزش ملتی ہے، اس کا حوالہ دیتے ہوئے سید صاحب فرماتے ہیں، "ان کی پنجابی کی آمیزش کہیں کہیں ان کے ہم وطن استاد امام دین کے قریب پہنچ جاتی ہے۔" یہ صحیح ہے کہ عبداللہ حسین اور استاد امام دین گجراتی ہم وطن ہیں مگر محض اس تعلق کی بنا پر دونوں کو ہم مرتبہ قرار دینا بڑی زیادتی ہے۔ استاد امام دین بہر حال استاد ہیں۔ ان کے کلام میں اردو اور پنجابی الفاظ شیر وشکر کی طرح گھل مل کر معنوی حسن پیدا کرتے ہیں جبکہ عبداللہ حسین کے ہاں پنجابی اور اردو الفاظ ایک دوسرے کے تابع مہمل بن جاتے ہیں۔

سید صاحب نقاد ہیں، اس لیے انھوں نے نقاد کے بارے میں خاصے حسن ظن سے کام لیا ہے۔ مثلاً ان کا خیال ہے کہ نقاد دیانت دار ہوتا ہے، وہ ایک ایسا قاری ہوتا ہے جو ادب کی مختلف انواع اور عمدہ معیار کے فن پاروں سے خود بھی لطف اندوز ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی اس میں شریک کرتا ہے۔ اس میں اپنی غلطیوں سے عبرت پکڑنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ نقاد کے

ادب کا قاری ہونے پر شک وشبہ کا اظہار کرنے کی ہم میں ہمت نہیں ہے۔ لیکن اتنا ضرور عرض کریں گے کہ اپنی غلطیوں سے عبرت پکڑنے والی بات عجیب سی لگتی ہے۔ اس پر ہمیں قاضی ہمدان یاد آگئے جن کا ذکر شیخ سعدی نے "گلستان" کے پانچویں باب میں کیا ہے۔ قاضی صاحب کسی جرم میں ماخوذ ہوئے، ان کا مقدمہ حاکم وقت کے سامنے پیش کیا گیا۔ جرم ثابت ہونے پر حاکم صاحب نے قاضی صاحب کو قلعے کی فصیل سے نیچے گرا دینے کی سزا دی تا کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ قاضی صاحب نے حاکم سے کہا، "جرم میں نے کیا ہے، اس لئے عبرت بھی مجھ ہی کو ہونی چاہیے، لہٰذا یہ سزا کسی اور کو دے دیجئے تا کہ میں عبرت حاصل کروں۔" نقاد بھی شاید اسی طرح اپنی غلطیوں سے عبرت پکڑتا ہوگا!

اور اب آخر میں دو غیر متعلق باتیں۔

سراج منیر مرحوم کی زندگی میں ان کے مضامین کا جو مجموعہ شائع ہوا تھا، اس کے دیباچے میں ایک درجن افراد کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے عرض کیا تھا کہ اتنے بہت سے لوگوں کا شکریہ ادا کر کے اتنی مختصری کتاب لکھنا تعجب خیز ہے۔ حالانکہ اس سے کہیں کم لوگوں کا شکریہ ادا کر کے اس سے کئی گنا ضخیم کتاب لکھی جا سکتی تھی۔ یہ بات ہمیں اس لیے یاد آئی کہ زیر نظر کتاب کے بھی دیباچے میں دو درجن افراد کا شکریہ ادا کیا ہے۔ یہ تعداد بہت کم ہے۔ ایسی ضخیم کتاب کے دیباچے میں مزید دو درجن افراد کا شکریہ با آسانی ادا کیا جا سکتا تھا۔

زیر نظر کتاب کے سرورق کا ڈیزائن جاذب توجہ نہیں ہے حالانکہ یہ حنیف رامے نے بنایا ہے۔ حنیف رامے کسی زمانے میں بہت اچھے مصور تھے مگر جب سے انھوں نے سیاست کو اوڑھنا بچھونا بنایا ہے ان کی مصوری اوڑھنے کی رہی ہے نہ بچھانے کی۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ ٹائٹل مصور حنیف رامے نے نہیں، سیاست دان حنیف رامے نے بنایا ہے، اسی لیے بنانے اور بگاڑنے کا فرق واضح نہیں

شاعر یا آلۂ مکبر الصوت

مرزا مغل سبقت گزشتہ صدی کے شروع میں لکھنؤ کے مشہور شاعر تھے، جراُت کے شاگ تھے، بعد میں خود استادی کے منصب پر فائز ہوئے اور لکھنؤ کے کئی نامور شاعروں نے ان کے آگے زانوائے تلمذ تہ کیا۔ ان کے بارے میں تذکرہ خوش معرکہ زیبا میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ جب میر لکھنؤ میں وارد ہوئے تو سبقت ان سے ملنے کے لیے گئے۔ رسمی باتوں کے بعد انھوں نے صاحب سے درخواست کی اپنے کلام سے مستفید فرمائیے، میر صاحب نے سبقت کو تیز سے دیکھا اور فرمایا، "تمہارے بشرے سے سخن فہمی معلوم نہیں ہوتی، سخن کو ضائع کرنے حاصل؟"

اگر میر صاحب آج زندہ ہوتے تو ہمارے عہد کے ننانوے فیصد شعراء سے مل کر اسی کا اظہار کرتے، اور اگر ان شعراء کا کلام سننے کا موقع مل جاتا تو فرماتے، ان کی شاعری ہونے کا ثبوت نہیں ملتا۔ جن ایک فیصد شاعروں کے بارے میں میر صاحب اچھی رائے کرتے، ان میں محسن بھوپالی ضرور شامل ہوتے، ان کے شعر سن کر میر صاحب فرماتے، " رہو، کیا عمدہ نثر لکھتے ہو۔"

اس بات سے خود میر صاحب کا سخن فہم ہونا مشکوک نظر آتا ہے، ایک طرح دار شاعر سمجھ لینا حد درجے کی سخن ناشناسی ہے، لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس میں میر صاحب کا نہیں، ان کے زمانے میں جس قسم کی مقفیٰ و مسجع نثر لکھی جاتی تھی، وہ آج کل کی شاعری شاعرانہ ہوتی تھی، اس لیے پرانے زمانے کے کسی شاعر کا آج کل کے کسی شاعر کو تعجب کی بات نہیں، تعجب کی بات تو یہ ہے کہ آج کل کے ناشاعر اپنے آپ کو شاعر کہتے ہیں

ناشاعر ہمارا موضوع نہیں ہو سکتے، کیونکہ ان پر لکھنا پیشہ ور نقادوں کا کام ہے، لہٰذا ہم اپنے کلام کو محسن بھوپالی تک محدود رکھیں گے، جو ہمارے نزدیک موجودہ دور کے شاعروں میں بہترین ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہم جیسے کم ترین کا کسی کو بہترین شاعر تسلیم کرنا اس کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتا کہ ہمارے مزید کم ترین ہونے کی راہ ہموار ہو جائے۔ لیکن ہم یہی بات ضرور کہیں گے، لوگ تختۂ مشق پر بھی سچی بات کہنے سے باز نہیں رہتے تو ہمارے لیے تختۂ کاغذ پر سچ لکھنے میں کیا امر مانع ہو سکتا ہے۔

محسن بھوپالی کے حوالے سے سچ لکھنے کی مجبوری اس لیے پیش آئی کہ ان کے تازہ مجموعہ کلام "موضوعاتی نظمیں" کے مطالعے سے ہم ابھی کچھ دیر پہلے فارغ ہوئے ہیں۔ یہ مجموعہ تازہ ان معنوں میں ہے کہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ورنہ اس میں جو کلام شامل ہے وہ خاصہ کہنہ ہے۔ لفظ "کہنہ" ہم نے فرسودہ کے معنوں میں نہیں لکھا بلکہ ان معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں کوئی شاعر کہنہ مشق کہلاتا ہے۔ محسن بھوپالی بلاشبہ کہنہ مشق شاعر ہیں اور اس مجموعے میں ان کی مشق کے سوا اور جو کچھ بھی ہے وہ کہنہ ہے۔ مثلاً اس میں ۱۹۴۹ء کے آس پاس کا کلام بھی ہے جب محسن کی عمر اتنی تھی جتنی مجنوں کی اس وقت تھی جب وہ دیوار دبستان پر لام الف لکھا کرتا تھا۔ محسن بھوپالی اپنی کتاب کا نام "دیوار دبستان" بھی رکھ سکتے تھے۔

محسن نے دو سال پہلے اپنی کلیات "مجموعۂ سخن" کے نام سے شائع کی تھی، کلیات میں شاعر کا کلام بھی کیا جاتا ہے، مگر محسن نے اپنا سارا اندوختہ کلیات میں نہ جھونکا، کچھ کلام بچا بھی لیا۔ اسی طرح جس طرح محتاط لوگ اپنی آمدنی کا کچھ حصہ برے وقت کے لیے سنبھال کر رکھ لیتے ہیں۔ اس انداز کیا ہوا کلام اب "موضوعاتی نظمیں" کے نام سے شائع ہوا ہے، جسے پڑھ کر ہوتا ہے کہ یہ کلام واقعی اس لائق تھا کہ برے وقت کے لیے بچا کر رکھا جاتا۔ برا وقت کسی پر ہے، سو اس کتاب کے قاری پر آ ہی گیا۔

نظر کلام سے نہ صرف کلیات کو محروم و محفوظ رکھا گیا ہے، بلکہ کلیات سے پہلے کے نصف مجموعوں میں بھی اسے شمولیت کے لائق نہیں سمجھا گیا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ جس طرح اور اقبال نے اپنا بہت سا کلام رد کر دیا تھا، اسی طرح محسن نے ایک بڑے شاعر کی حیثیت کلام کے کچھ حصے کو مردود قرار دے دیا۔ اب یہی مردود کلام مجموعے کی صورت میں شائع

کرکے محسن نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاعر کو اپنا کلام خود رد نہیں کرنا چاہیے، یہ کام دوسروں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے کہ وہی اس کام کو بہتر طور پر کشادہ دلی سے انجام دے سکتے ہیں۔

دیباچے میں محسن نے اس مجموعے کی اشاعت کا جواز ان لفظوں میں پیش کیا ہے: "یہ نظمیں اس سے پہلے میرے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں...... ان کی اشاعت ہر بار اس خیال سے موخر ہوتی رہی کہ ان میں سے بیشتر کا تاثر میرے نزدیک لمحاتی یا واقعاتی تھا، لیکن جب پچھلے دنوں میں نے ان پر دوبارہ نظر ڈالی تو عجیب طرح کی سرخوشی محسوس کی...... چنانچہ میں نے طے کیا کہ ان نظموں کو کتاب کی شکل میں آنا چاہیے۔"

یہ بڑی اچھی بات ہے کہ جناب محسن جب اپنے کلام پر دوبارہ نظر ڈالتے ہیں تو ان پر کلام کے اوصاف ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ان سے گذارش ہے کہ وہ اپنی کلیات پر دوبارہ نظر نہ ڈالیں تاکہ یہ آئندہ بھی شائع ہوتی رہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، اصل بات جو کہنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اپنی رد کردہ نظموں پر دوبارہ نظر ڈالنے سے جو سرخوشی انھیں حاصل ہوئی، اس میں ہم بھی برابر کے شریک ہیں، بلکہ ہم تو سرخوشی کی بعد کی منزل بے ہوشی سے بھی دوچار ہوئے۔ کلام ایسا اثر آفریں ہے کہ دل اور دماغ دونوں قابو میں نہیں رہتے۔ ان دونوں کے قابو میں نہ رہنے کی وجہ ہی سے کلام کی خوبیاں پوری طرح ظاہر ہوتی ہیں۔

یہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے، جن میں سے چار حصے قومی، شخصی، مزاحیہ اور متفرق نظموں کے ہیں۔ پانچواں حصہ بچوں کی نظموں پر مشتمل ہے۔ ہماری رائے میں کتاب کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ کسی بھی حصے کی نظمیں بلا تکلف کسی بھی دوسرے حصے میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ مزاحیہ حصے کے ساتھ بڑی ناانصافی کی گئی ہے کہ اس میں صرف پانچ نظمیں ہیں۔ پوری کتاب میں بھی وہ پانچ نظمیں ہیں جنھیں پڑھ کر ہنسی نہیں آتی۔ جن نظموں کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے اور خوشی ہوتی ہے وہ کتاب کے دوسرے حصوں کی زینت ہیں، مثلاً متفرق نظموں میں ایک نظم شامل ہے، جس کا عنوان ہے "ایک ایسی ویسی نظم"۔ جس کا عنوان ہی قہقہہ بلب ہو، اس نظم کے مزاحیہ ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے، اس نظم کے چند مصرعے یہ ہیں:

جو محسن تھا اسے بھی وہ سیہ باطن نظر آیا
وہ جس نے فلیپ لکھا

اُسی کا اسے طعنہ ملا
اور جس نے اپنی برتری کی بات کی
اس کو ہزیمت!

شاعروں کو اپنے نام یا تخلص کو عام لفظوں کی حیثیت سے کبھی استعمال نہیں کرنا چاہیے کیونکہ [illegible] لوگ ایسے استعمالات سے اپنی خواہش کے مطابق مفہوم برآمد کر سکتے ہیں۔

محسن نے چند نظمیں سیاست اور سیاستدانوں کے بارے میں بھی لکھی ہیں، جنھیں پڑھنے کے بجائے آلۂ مکبر الصوت کے ذریعے سننے کو جی چاہتا ہے۔ ان نظموں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محسن کو سیاست سے بھی اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی ادب سے ہے۔ بھٹو مرحوم سے انھیں بے حد عقیدت ہے، اس لیے ان کے بارے میں دو نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم اس وقت لکھی تھی جب صدر ایوب نے بھٹو کو برطرف کر کے لاڑکانہ میں نظر بند کر دیا تھا۔ بھٹو کی تعریف میں اچھے اچھے بلکہ [illegible] قسم کے شعر نکالے ہیں۔ مثلاً:

[illegible] کو جس نے سگ خونخوار کہا
[illegible] برسر دربار کہا

شعر کیا ہے، پیش گوئی ہے۔ محسن کو برسوں پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ بات دار و رسن تک جا پہنچے گی۔

دوسری نظم میں بے نظیر کے برسر اقتدار آنے پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں بھٹو کا ذکر کرتے ہوئے شاعر یہ کہنا چاہتا تھا کہ ضیاء الحق نے اپنے محسن کو پھانسی پر چڑھا دیا، لیکن وفور [illegible] بات کچھ سے کچھ ہو گئی اور شعر اس صورت میں "نازل" ہوا۔

[illegible] محسن قتل میں جسے مارا گیا
[illegible] محسن کی خواہش پر جسے وارا گیا

دوسرے مصرعے میں بھٹو کو نہیں ضیاء الحق کو محسن قرار دیا گیا ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے، اس [illegible] چاہیے ورنہ پیپلز پارٹی والوں کو شکایت ہوگی کہ شاعر نے ممنون احسان کو محسن بنا دیا، [illegible] پارٹی کو ہماری اس رائے سے اتفاق نہیں ہے، ان کا کہنا ہے کہ دوسرے مصرعے میں [illegible] لغوی معنوں میں نہیں بلکہ بطور تخلص استعمال کیا گیا ہے۔

محسن بھوپالی کے قادر الکلام ہونے میں کوئی شبہ نہیں، وہ مشکل سے مشکل مضمون کو بھی نہایت آسانی کے ساتھ منظوم کر دیتے ہیں اور اگر قادر الکلامی کے زور میں کوئی مصرع خارج از بحر ہو جائے تو وہ اس کی پروا نہیں کرتے۔ کرنی بھی نہیں چاہیے کیونکہ خارج از بحر مصرعوں کا بھی اپنا ایک حسن ہوتا ہے۔ ذیل کے دو شعر اسی حسن کے آئینہ دار ہیں۔

ایسی بھی پالیسی دیکھی
نظرِ عنایت بدلی دیکھی
جذبۂ حریتِ فکر نے انگڑائی لی
نئی امکان، نئی جہت، نئی منزل ہے

معترضین یہ کہیں گے کہ ان اشعار میں "نظر" اور "جہت" کا وہ تلفظ نہیں ہے جو ہونا چاہیے۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ محسن بھوپالی کا شاعرانہ مرتبہ اتنا بلند ہے کہ وہ جس لفظ کا جو تلفظ کریں، وہ ہمارے لیے قابلِ قبول ہونا چاہیے۔ تلفظ ہی نہیں لفظوں کے املا اور معانی میں بھی کرنے کا انھیں پورا پورا حق حاصل ہے۔ مثلاً ان کا ایک شعر ہے۔

اے نازشِ متاعِ چمن، جانِ گل عزار
اے ملتِ عظیم کے نوخیز جاں نثار

معترضین یہ کہیں گے کہ صحیح لفظ "گل عذار" ہے نہ کہ "گل عزار"۔ نیز "جانِ گل عذار" کی ترکیب بے معنی ہے کیونکہ "گل عذار" کے معنی ہیں پھولوں جیسے گالوں والا یعنی سرخ چہرے والا۔ ملتِ عظیم کے نوخیز جاں نثار کو "نازشِ متاعِ چمن" تو کہا جا سکتا ہے، لیکن پھولوں جیسے رخسار رکھنے والے کی جان کہنا بے معنی بات ہے۔

ہمارے نزدیک دونوں اعتراض غلط ہیں، جب "گزارش" اور "گذارش" دونوں طرح لکھنے کا رواج ہے تو "گل عذار" کو "گل عزار" لکھنے میں کونسا آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جناب محسن پہلے مصرعے میں نازشِ متاعِ چمن کی مناسبت سے "گلزار" لکھنا چاہتے تھے، چونکہ لفظ "گلزار" وزن میں نہیں آتا تھا، اس لیے "گل عذار" کہہ دیا۔ انھوں نے "عذار" کو "گلزار" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہ ان کا لسانی اجتہاد ہے اور ہر مجتہد کو حق حاصل ہے کہ لفظوں کو پرانے معنوں سے رہائی دلائے اور نئے معنوں سے

کرے۔

عقبی سرورق پر محسن کے حالات زندگی ہیں۔ اس ضمن میں تین درجن کے قریب ان بین الاقوامی مشاعروں اور نشستوں کی سن وار فہرست بھی دی گئی ہے، جن میں محسن نے ۱۹۵۵ء سے ۱۹۹۰ء تک شرکت کی اور اپنا کلام سنایا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ان سینکڑوں مقامی مشاعروں اور نشستوں کی فہرست بھی شائع کر دی جاتی جن میں موصوف نے شرکت کی۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا کہ ہمارے بڑے شاعر شعر کہنے سے زیادہ شعر سنانے میں خرچ ہو جاتے ہیں۔

نقاد یا پیشہ ور گواہ

حضرت لاغر مراد آبادی بڑے وضع دار بزرگ ہیں۔ ہفتے میں ایک مرتبہ ہمارے غریب خانے پر ضرور تشریف لاتے ہیں اور ادبی حالات حاضرہ کے بارے میں اپنی گفتگو سے مستفیض فرماتے ہیں۔ ہم نے کئی بار ان سے عرض کیا کہ آپ ہمارے بزرگ ہیں، آپ کو زحمت نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں موقع دیجیے کہ ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کریں۔ پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے، کنواں پیاسے کے پاس نہیں آتا۔ مگر انھوں نے ہماری درخواست کو شرف قبولیت نہیں بخشا۔ لیکن پچھلے چند ہفتوں سے وہ خلاف معمول تشریف نہیں لائے تو ہمیں تشویش ہوئی کہ خدانخواستہ کہیں طبیعت ناساز نہ ہوگئی ہو۔ کراچی میں گھر گھر تلاشیاں جو ہو رہی ہیں، اس سلسلے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آگیا ہو۔ یعنی ان کے کلام آتش بار کو غیر قانونی اسلحہ سمجھ کر کوئی کارروائی نہ کر ڈالی گئی ہو۔ پریشانی کے عالم میں ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ کتابوں کے ڈھیر کے سامنے بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور فکر سخن میں محو ہیں۔

استاد محترم کے تین ہی شوق ہیں، شعر کہنا، حقہ پینا اور کتابیں پڑھنا۔ کتابوں سے ان کا لگاؤ ہے کہ اگر کسی کتاب کو کسی مجبوری کی وجہ سے خود نہیں پڑھ سکتے تو اپنے حقے کی چلم کو پڑھوا دیتے ہیں۔ نئے شاعروں خصوصاً شاعرات کے کلام سے استفادہ عموماً اسی طرح کرتے ہیں۔ اس ملاقات استاد گرامی سے جو گفتگو ہوئی، اس لائق ہے کہ اس سے دوسرے مستفید ہوں، لہٰذا ذیل میں درج کی جاتی ہے:

ہم: بہت دنوں سے آپ تشریف نہیں لائے۔ اس گوشہ نشینی کا سبب کیا ہے؟

وہ: اب تو کچھ عرصہ گوشہ نشینی میں ہی زندگی گزرے گی۔ جب سے اکادمی ادبیات

کا چیئرمین بنا دیا گیا ہے یعنی اکادمی کو پارٹی میں ڈال کر ضم کر دیا گیا ہے، میں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا ہے کہ کہیں مجھے بھی مزاحمتی ادب کا نمائندہ سمجھ کر کسی علمی، ادبی یا ثقافتی ادارے کا سربراہ نہ بنا دیا جائے۔

ہم: آپ کا یہ خوف بے بنیاد ہے۔ کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، احمد فراز اور محمد علی صدیقی کو اس لیے مختلف اداروں کی سربراہی عطا کی گئی ہے کہ یہ سب مزاحمتی ادب لکھتے رہے ہیں یا مزاحمتی ادب لکھنے والوں کے گن گاتے رہے ہیں۔ آپ تو کلاسیکی غزل کے شاعر ہیں، آپ کا مزاحمتی ادب سے کیا تعلق؟

وہ: کلاسیکی غزل کہنے والے سے بڑھ کر کون مزاحمتی ادب تخلیق کر سکتا ہے۔ ہم غزل گو شعراء، لب، روسیاہ سے لے کر واعظ اور محتسب تک، سب کے خلاف لکھتے رہتے ہیں۔ یہ مزاحمتی ادب نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ میں نے اپنے خسر محترم تک کے خلاف مزاحمتی غزلیں لکھی ہیں۔ شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی۔ شادی سے پہلے اس لیے کہ وہ شادی پر راضی نہیں ہو رہے تھے۔ شادی کے بعد اس لیے کہ وہ شادی پر راضی کیوں ہو گئے۔ مجھ سے بڑا مزاحمتی شاعر کون ہوگا؟

ہم: گویا آپ کا خیال ہے کہ مزاحمتی ادب تخلیق کرنے کی وجہ سے آپ کو کسی ادارے کا سربراہ بنا دیا جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو بہت اچھا ہوگا۔ کم از کم ایک ادارہ تو ڈھنگ سے کام کرے گا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مقتدرہ قومی زبان کی سربراہی سے فارغ ہو چکے ہیں۔ اس سے پہلے کہ تلفظ اور املا کی غلطیوں کا کوئی جیالا اس ادارے پر قابض ہو جائے، آپ کو اس کی سربراہی قبول کر لینی چاہیے۔ اگر وہاں آپ کا تقرر ہو جائے تو اردو کی قسمت سنور جائے۔

وہ: اردو کی قسمت تو ضرور سنور جائے گی لیکن میرا انجام عبرت ناک ہو جائے گا۔

ہم: وہ کس طرح؟

وہ: آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلی مرتبہ پیپلز پارٹی چند مہینوں کے لیے اقتدار میں آئی تھی تو سارے ثقافتی اداروں میں جیالوں کو بٹھا دیا گیا تھا۔ جونہی پارٹی کی حکومت ختم ہوئی تو یہ جیالے دم دبا کر بھاگے۔ اس ضعیف العمری میں مجھ میں رسیاں تڑانے اور بھاگنے کی سکت نہیں ہے۔

ہم: تو آپ کب تک گوشہ نشینی کی زندگی بسر کریں گے؟

وہ: بڑے مزے کی زندگی ہے، شعر کہتا ہوں، حقہ پیتا ہوں اور کتابیں پڑھتا ہوں۔

ہم: کوئی خاص کتاب پڑھنے میں آئی؟

وہ: ہاں ادھر ہندوستان سے بہت سی اچھی اچھی کتابیں اور رسالے آئے ہیں۔ طاعون کی وبا سے دو مہینوں سے ڈاک بند تھی۔ اب جو کھلی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی خزانے کا منہ کھل گیا ہو۔ بنگلور کے رسالے "سوغات" کا تازہ شمارہ آیا ہے۔ اس میں بہت سی کام کی چیزیں ہیں۔ اختر الایمان کی آپ بیتی کی نئی قسط سابقہ قسطوں کی طرح اپنے دامن میں ایک دنیا کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس میں انھوں نے بہت سے دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ انھوں نے اپنے ہم زلف کو بہت مارا اور پھر ایک مہینے تک جیل کی سیر کرتے رہے۔ مگر انھوں نے ایک واقعہ ایسا لکھا ہے کہ وہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ یہ واقعہ انھی کے الفاظ میں سناتا ہوں......

"۴ر مئی ۱۹۴۷ء کو ہمارا نکاح ہوا تھا۔ جمیل الدین عالی نے شرارت کی کہ نکاح میں شہدے لے آیا۔ جنھوں نے نکاح کی رسم ختم ہوتے ہی اپنے فن کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ اس نکاح میں میرے والد اور چچا بھی شریک تھے۔ شہدوں کی حرکت سے وہ بہت مکدر ہوئے۔"

ہم: آپ کو یہ واقعہ درست کیوں نہیں معلوم ہوتا؟

وہ: اس لیے کہ ۱۹۴۷ء میں رائٹرز گلڈ تو بنا نہیں تھا جو عالی صاحب کو شرارت کے لیے مل جاتے۔

ہم: عالی صاحب انجمن ساز آدمی ہیں، ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ۱۹۴۷ء میں رائٹرز گلڈ کی طرح کا کوئی ادارہ بنایا ہو۔

وہ: ہاں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ اس پر تحقیق کی ضرورت ہے۔

ہم: جی ہاں، اب تحقیق ایسے ہی موضوعات پر ہوتی ہے۔

وہ: ہندوستان سے ایک عجیب و غریب کتاب آئی ہے، اس کا نام بھی وہی ہے جو مصنف کا ہے، یعنی گیان سنگھ شاطر مصنف گیان سنگھ شاطر۔

ہم: یہ تو کوئی شاطرانہ چال معلوم ہوتی ہے کہ کوئی مصنف خود اپنے آپ کو تصنیف کرے۔

وہ: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کتاب کے فلیپ پر یہ رائے دی ہے کہ اُردو زبان میں ابھی تک ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ بلکہ انھوں نے یہ تک لکھ دیا ہے کہ اُردو کو مژدہ کہ اس میں ایک یاد رہنے والی کتاب کا اضافہ ہو رہا ہے اور یہ میری خوش بختی ہے کہ میں اس کے ادبی

اسے دے رہا ہوں۔

ہم: یہ ویسی گواہی ہوگی جیسی عدالتوں میں پیشہ ور گواہ دیتے ہیں۔

وہ: یہ خالص ادبی گواہی ہے۔ نارنگ نے ساقی فاروقی کی شاعری پر مضمون لکھ کر جھوٹی گواہی ضرور دی تھی، مگر اب وہ یہ کام نہیں کرتے۔

ہم: آخر اس کتاب میں ہے کیا؟

وہ: یہ ایک خود نوشت سوانح عمری ہے جس میں مصنف نے اپنے تجربات و مشاہدات کو بقول ناول کی طرح لکھا ہے۔ لیکن یہ ناول نہیں سچی داستان ہے، جس میں انسانی زندگی کے ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جن تک عام نظریں نہیں پہنچ سکتیں اور اگر پہنچ بھی جائیں تو بیان نہیں کر سکتیں۔ شاطر نے جو کچھ دیکھا ہے اسے نہایت خوش اُسلوبی سے بیان کیا ہے۔ وہ پور کا رہنے والا سکھ ہے۔ اُردو اس کی مادری زبان نہیں ہے۔ لیکن اُردو پر اسے ماہرانہ عبور حاصل ہے۔

ہم: آپ بھی گوپی چند نارنگ کے رنگ میں رنگے گئے۔ ایسی تعریفیں تو وہ لوگ کرتے ہیں جو کے عادی ہوں۔

وہ: ایسی بات نہیں ہے۔ یہ کتاب واقعی اس لائق ہے کہ پڑھی جائے۔

ہم: اگر آپ کی یہی رائے ہے تو پھر اسے پڑھنا ہی پڑے گا۔

وہ: دلی سے زبیر رضوی کے رسالے "ذہن جدید" کا تازہ شمارہ بھی آیا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں صرف اُردو ادب ہی نہیں ہوتا، اور بہت کچھ بھی ہوتا ہے۔ رقص، موسیقی، فوٹوگرافی کے علاوہ ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں کے ادب پر بھی مفید تحریریں شامل ہوتی ہیں۔ تازہ شمارہ میں بھی بڑا تنوع ہے۔ حد تو یہ ہے کہ آپ کا بھی ایک کالم شامل ہے وہ کالم جو آپ نے جگن ناتھ آزاد کے بارے میں ڈاکٹر خلیق انجم کی مرتبہ کتاب پر لکھا تھا۔ ایک ادارتی نوٹ بھی ہے جس میں آپ کی حق گوئی کی تعریف کی گئی ہے۔ حالانکہ آپ ہیں، وہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔

ہم: اس کالم نے تو ہمیں سخت مشکل میں ڈال دیا ہے، بمبئی کے روزنامہ "انقلاب" میں بھی ہوا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر اور مشہور نقاد فضیل جعفری نے کالم کے ساتھ ایک حاشیہ

بھی ناٹکا ہے جو جگن ناتھ آزاد اور خلیق انجم کے خلاف جاتا ہے۔ یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ دہلی کے ایک کرم فرما نے اس کالم کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بڑی تعداد میں تقسیم کی ہیں۔ ان سب باتوں سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ہمارا کالم جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر خلیق انجم کے خلاف ہے حالانکہ ہم اس قسم کی نازیبا حرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان دونوں کی ہمارے دل میں عزت بھی ہے اور محبت بھی۔

وہ: محبت کے اظہار کے لیے آپ ایسے کالم کیوں لکھتے ہیں جن سے آپ کے ممدوحین کی عزت خطرے میں پڑ جائے۔

ہم: ہم جو کچھ لکھتے ہیں نیک نیتی سے لکھتے ہیں۔

وہ: حضرت واثق جونپوری نے آپ کی نیک نیتی کا بھانڈا عین چوراہے میں پھوڑ دیا ہے۔ انھوں نے رسالہ ''کتاب نما'' دہلی کے نومبر ۹۳ء کے شمارے میں آپ کے خلاف ایک طویل مراسلہ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا کہ آپ نے ان کی خودنوشت ''گفتنی ناگفتنی'' پر جو کالم لکھا تھا، اس میں صداقت کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہم: حضرت واثق جونپوری ہر اعتبار سے ہمارے لیے واجب الاحترام ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے ان کی کتاب کے حوالے سے صداقت کو مجروح و مضروب کیا۔ لیکن یہ تو معلوم ہو کہ انھوں نے یہ بات کیوں کہی۔

وہ: یہی نہیں، انھوں نے اور بھی بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن سب سے اہم بات جو انھوں نے کہی ہے، یہ ہے کہ آپ بزدل ہیں۔

ہم: ہمارا یہ راز ان کو کیسے معلوم ہو گیا۔

وہ: آپ نے اپنے کالم میں صہبا لکھنوی اور واثق جونپوری کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے یہ نہیں بتایا کہ بوقت ملاقات قرۃ العین حیدر بھی موجود تھیں۔ اس سلسلے میں حضرت واثق نے جو کچھ لکھا ہے، وہ میں پڑھ کر سنائے دیتا ہوں۔ لکھتے ہیں ......

''بزدل اتنے کہ از ابتدا تا انتہا سہواً بھی عینی کا نام حضرت خامہ بگوش کی زبان قلم پر نہ آ پایا کہ مبادا محترمہ ان سے ناراض نہ ہو جائیں۔ میں خوش ہوں کہ ایک ہستی ہے تو جس سے خامہ بگوش خوف زدہ رہتے ہیں۔''

ہم: جناب واثق نے صحیح فرمایا ہے کہ ہم بزدل ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے بڑی معقول دلیل دی ہے۔ اس دلیل کو مزید معقول بنانے کے لیے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ واثق صاحب سے بھی خوف زدہ رہا کریں گے کیونکہ انھیں ہماری غیر سنجیدہ باتیں خاصی سنجیدہ نظر آتی ہیں۔

وہ: غیر سنجیدگی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ واثق صاحب نے اگر اپنے جشن الماسی کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے حاضرین کو پیش کی جانے والی بریانی کی تعریف کی تھی تو اس پر آپ کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ دیکھیے واثق صاحب نے آپ کی فضول باتوں کا کیسا مسکت جواب دیا ہے...... ''اس جشن الماسی کا ذکر اگر میں نے قدرے تفصیل سے کیا ہے تو کونسا ادبی یا اخلاقی جرم کیا ہے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ یہ دن کتنوں کو نصیب ہوتا ہے اور جن کو ہوتا بھی ہے تو ان میں کون اور کتنے لوگ اس کو اتنے بڑے پیمانے پر منانے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ میرے کتنے احباب اور پرستاروں نے اس جشن پر (میری مرضی کے خلاف) ہزاروں روپے خرچ کر دیے۔ یہاں میں نے اگر دستر خوان پر کسی پکوان کی تعریف کی دی تو کون سا جرم کیا۔ ڈاکٹر جانسن، انگریزی زبان کا عالم اپنے پرستاروں کے درمیان اشیائے خورد و نوش پر گھنٹوں گفتگو کیا کرتا تھا، بالخصوص آلو پر۔''

ہم: جناب واثق سے معذرت خواہ ہیں۔ انھوں نے کسی ادبی یا اخلاقی جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ اس قسم کے بھی جرم ہمیں سے سرزد ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر جانسن بڑا بدذوق تھا کہ آلو پر گھنٹوں گفتگو کیا کرتا تھا۔ واثق صاحب بریانی کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے خوش ذوق ہونے کی دلیل

ادب میں قدوقامت کا مسئلہ

جب سے ادب کتابوں اور رسالوں سے نکل کر اخباروں میں آیا ہے، ہمارے اکثر ادیب اخباری اور اشتہاری ہو کر رہ گئے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ کتابیں بھی وہ اس لیے نہیں لکھتے کہ انھیں پڑھا جائے۔ بلکہ ان کی اشاعت کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ اخباروں میں ان کا تذکرہ آ جائے اور ان کی رونمائی کی خبریں چھپ جائیں۔ گویا کتاب کی خبر کا چھپنا خود کتاب کے چھپنے سے زیادہ اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب ادب کے حوالے سے نہیں، خبر کے حوالے سے زندہ رہتے ہیں۔

اخباروں میں فلمی صفحات بھی ہوتے ہیں لیکن ہم نے آج تک ان صفحات پر کسی ایسے شخص کے بارے میں کوئی خبر نہیں دیکھی جس کا فلمی دنیا سے کوئی جائز تعلق نہ ہو۔ لیکن ادبی صفحات پر ایسے لوگ کثرت سے دکھائی دیتے ہیں جن کا ادب سے جائز تو کیا ناجائز تعلق بھی نہیں ہوتا۔ گویا اخباری صفحات نہ ہوئے اکادمی ادبیات کی اہل قلم کانفرنس ہو گئی کہ جسے چاہا شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ دے دی۔

اخباروں کے ادبی صفحات میں جو کچھ چھپتا ہے، اسے وہی لوگ پڑھتے ہیں جن کے بارے میں یہ سب کچھ چھپتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی حسن اتفاق سے ایسی چیزیں بھی چھپ جاتی ہیں جن کے پڑھنے سے اگر کوئی فائدہ نہیں ہوتا تو نقصان بھی نہیں ہوتا۔ ایسی ہی ایک گفتگو پچھلے دنوں اخبار "جنگ" کراچی میں شائع ہوئی ہے جس کا موضوع ادب میں گروہ بندی ہے اور جس میں قمر جمیل، سرشار صدیقی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، شاہدہ حسن اور خواجہ حمید الدین شاہد نے حصہ لیا۔ یہ پانچوں ادیب، پانچوں انگلیوں کی طرح قد و قامت کی طرح ایک جیسے نہیں لیکن ایک بات ان میں مشترک ہے کہ ان پانچوں نے کبھی گروہ بندی میں حصہ نہیں لیا اور ہمیشہ اپنے اپنے گوشۂ تنہائی

میں بیٹھ کر ادب کی خدمت کی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ بعض ادیبوں کا گوشۂ تنہائی میں بیٹھے رہنا بھی ادب کی خدمت میں شمار ہوتا ہے۔

گفتگو کا آغاز قمر جمیل نے کیا۔ انھوں نے فرمایا، ادب میں ہمیشہ گروہ بندیاں رہی ہیں۔ یہ کوئی غیر صحت مند رویہ نہیں ہے۔ ماضی میں ایک گروہ دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے منفی حربے استعمال کرتا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی ہے:

"موجودہ تہذیبی زوال کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ادب بے معنی چیز بن گیا ہے۔ میرا بیٹا مجھ سے [illegible] اور گاڑی کا سوال کرتا ہے لیکن میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر اسے حیرانی ہوتی ہے۔ اس کے خیال میں کتاب ان اشیاء کے مقابل پر غیر اہم ہے جن کا وہ مطالبہ کر رہا ہے۔"

کسی ادیب کے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر اس کے بیٹے ہی کو نہیں، ہمیں بھی حیرانی ہوتی ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ادب بے معنی چیز بن چکا ہے تو ایسی صورت میں آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ماضی میں جب ادب بامعنی تھا، ادبی گروہ بندیاں کرنے والے منفی حربے استعمال کرتے تھے اور آج کے گروہ بند مثبت قدم اٹھاتے ہیں۔ کسی بے معنی چیز کے لیے کتنا ہی مثبت قدم اٹھایا جائے، وہ چیز بہر حال بے معنی ہی رہے گی۔

ماضی میں جب شاعر گروہ بندیاں کرتے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف منفی حربے استعمال کرتے تھے، تو ان کا مثبت نتیجہ ہجویات کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ یہ ہجویات ہمارے [illegible] ادب کا وقیع حصہ ہیں اور آج بھی ادب سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس آج کے ادیب جب ایک دوسرے کے خلاف کچھ لکھتے ہیں یعنی مثبت قدم اٹھاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ادب جیسی بے معنی چیز کو مزید بے معنی بنا رہے ہیں۔ اب اس کا فیصلہ ہم قمر جمیل پر چھوڑتے ہیں کہ وہ منفی حربے بہتر ہیں جن کے نتائج مثبت ہوں یا وہ مثبت اقدامات بہتر ہیں جن کے نتائج منفی ہوں۔ ہمیں یقین ہے کہ قمر جمیل کا فیصلہ اول الذکر کے حق میں ہوگا، کیونکہ خود ان کی اپنی تنقیدی تحریروں میں منفی حربوں کے ذریعے مثبت نتائج حاصل کیے جاتے ہیں۔ مثلاً وہ نو آموز شاعر کو کسی بڑے شاعر سے تشبیہ دیتے ہیں تو بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ وہ بڑے شاعر [illegible] رہے ہیں، لیکن در اصل ان کا مقصد نو آموز شاعر کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ میاں تمھیں جو کچھ بننا تھا بن چکے، اب شاعری چھوڑو کوئی شریفانہ کام کرو۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کے کئی ابھرتے ہوئے

شاعر قمر جمیل کی تنقیدی بصارت کی وجہ سے آج شریفانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

شاہدہ حسن کا خیال ہے کہ جس طرح عام زندگی میں لوگ منفی رویوں کا شکار ہیں، اسی طرح ادب میں بھی منفی رویے نظر آتے ہیں۔ اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں، ''جب معاشرہ تباہی کی طرف بڑھتا ہے تو لوگ اہل ادب کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ اہل ادب ہی ہمیں راستہ دکھائیں گے۔'' ہمیں معلوم نہیں وہ لوگ کون ہیں جو اہل ادب سے اتنی خوش گمانی رکھتے ہیں۔ ادب عام لوگوں کا مسئلہ نہیں رہا۔ ہمارے ملک میں ستر فیصد نا نہاد پڑھے لکھوں میں ایک فیصد بھی ایسے نہیں ہیں جنھیں ادب سے دلچسپی ہو۔ اہل ادب سے رہنمائی حاصل کرنے کی بات، لطیفے کے طور پر ہی کہی اور سنی جا سکتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ شاہدہ حسن شاعری ہی میں نہیں لطیفہ گوئی میں بھی ایک خاص اسلوب رکھتی ہیں۔

شاہدہ حسن نے ادبی گروہ بندی کے حوالے سے یہ بھی کہا ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کم قامت لوگوں کو قد آور ادیب بنا رہا ہے۔ افسوس کہ محترمہ کی اس رائے سے بھی متفق ہونے کی ہم جرأت نہیں کر سکتے، کیونکہ پاکستان میں کم قامت ادیب پائے ہی نہیں جاتے۔ اس لنکا میں جو ہے باون گز کا ہے۔ بفرض محال اگر یہ مان بھی لیا جائے الیکٹرانک میڈیا کم قامت کو قد آور بنا رہا ہے اس میں کچھ قصور محترمہ کا بھی ہے۔ وہ گاہ گاہ ٹی وی کے مشاعروں کی نظامت فرماتی رہتی ہیں اور ہر شاعر کے لیے ناقابل یقین توصیفی سابقے اور لاحقے استعمال کرتی رہی ہیں۔ ابھی چند روز پہلے ٹی وی سال نو کے سلسلے میں جو مشاعرہ ہوا تھا اس میں انھوں نے دوران نظامت بلا تخصیص ہر شاعر کے لیے ایسے ایسے توصیفی کلمات کہہ ڈالے کہ آئندہ بھی محترمہ کو میر و غالب کی تعریف کرنے کی ضرورت پیش آئی تو کوئی نیا لفظ نہیں ملے گا۔ ایسی ہی کسی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ استاد اغر مراد آبادی نے فرمایا تھا کہ الفاظ نازک آبگینوں کی طرح ہوتے ہیں جو ذرا سی بے احتیاطی سے ٹوٹ جاتے ہیں یعنی اپنے معنوں سے جدا ہو جاتے ہیں۔

سرشار صدیقی نرم و نازک لہجے کے شاعر ہیں لیکن گفتگو میں وہ تیغ محرف کی طرح ہوتے ہیں۔ ہم نے سرشار صاحب جیسے راست قامت کو تیغ محرف یعنی خم دار تلوار اس لیے کہا ہے کہ اس تلوار کا لگایا ہوا زخم دوسری تلواروں کے زخموں سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ انھوں نے نہایت بے باکی بلکہ بے مروتی سے موجودہ ادبی حالات کا جائزہ لیا ہے اور گروہ بندی کی مذمت کرتے ہوئے

کہا ہے کہ ادب کے ''ٹھیکے داروں نے اپنے ساتھ پست قدم اور چھوٹے ذہن رکھنے والے لوگوں کا ایک ہجوم جمع کر رکھا ہے جو صرف انھی کی دف پر انھی کے مدح گاتے ہیں۔ یہ اپنے مخالف کا ذکر نہیں کرتے جو چاہے کتنا بھی بڑا آدمی ہو۔ اس کے رد عمل میں کھل کر گالیاں دی جاتی ہیں اس کی وجہ سے چھوٹے لوگ بلا وجہ سامنے آ رہے ہیں۔ انھیں بڑے لوگ آگے بڑھا رہے ہیں۔''

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ادب کا اصل مسئلہ قد و قامت کا ہے۔ شاہدہ حسن نے بھی اسی حوالے سے بات کی اور سرشار صاحب بھی اسی طرح میں غزل کہہ رہے ہیں۔ بلکہ انھوں نے قامت بیانی کو کچھ زیادہ ہی اہمیت دی ہے اور ''بڑے لوگ'' اور ''چھوٹے لوگ'' کی اصطلاحیں بھی وضع کی ڈالی ہیں جو معنوی اعتبار سے نہایت بلیغ ہیں اور اس لائق ہیں کہ انھیں مقتدرہ قومی زبان کی شائع کردہ ادبی اصطلاحات کی ڈکشنری میں شامل کر لیا جائے۔

سرشار صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ ادب کی ساری رونق چھوٹے لوگوں ہی سے ہے۔ بڑے لوگ تو کبھی کبھار پیدا ہوتے ہیں اور یہ چھوٹے لوگوں کے درمیان رہ کر ہی بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر چھوٹے لوگ نہ ہوں تو بڑوں کی بڑائی بھی نظر نہ آئے۔ لہٰذا درخواست ہے کہ چھوٹے لوگ سامنے آ رہے ہیں، ان کی حوصلہ شکنی نہ کیجیے۔ انھیں بڑوں کی دف پر گانے دیجیے کہ اسی سے ان کے زندہ رہنے کا ثبوت ملتا ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ادب میں ابھی کچھ بڑے لوگ موجود ہیں جنھیں سرشار صاحب نے ''ٹھیکے دار'' کہا ہے۔ گانے والوں کی آواز کے ساتھ ''ٹھیکے دار'' کا لفظ استعمال کرنا ندرت خیال کا عمدہ نمونہ ہے۔ ''ٹھیکا'' موسیقی کی اصطلاح ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ طبلہ یا ڈھولک اس طرح بجایا جائے کہ گانے والے کی آواز کو چھپا لے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرشار صاحب کے ذہن میں ادب کے چھوٹے بڑوں کا تصور کیا ہے۔

جناب سرشار کی آتش بیانی کی ایک اور نمونہ یہ ہے:

''اگر آپ پچھلے دس بارہ برس کے دوران ہونے والے ٹیلی ویژن کے مذاکروں اور مشاعروں کی فہرست دیکھیں تو انھیں آٹھ دس ناموں تک ہی محدود پائیں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان دس برسوں کے دوران لاہور، کراچی، اسلام آباد اور دوسرے شہروں میں ان آٹھ دس کے علاوہ قد و قامت کے لوگ نہیں تھے جنھیں سامنے لایا جاتا۔''

سرشار صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے ہمیں اس سے صد فیصد اتفاق ہے۔ پاکستان کے ہزاروں ادیبوں میں سے صرف آٹھ دس سے ترجیحی سلوک کرنا نہایت نامعقول بات ہے۔ ممکن ہے ٹی وی کے ارباب اختیار یہ عذر پیش کریں کہ ٹی وی مشاعرے اور مذاکرے کبھی کبھار ہوتے ہیں، اس لیے ان کا کام آٹھ دس ادیبوں اور شاعروں سے چل جاتا ہے، مزید کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ عذر ٹی وی والوں کے رویے سے بھی زیادہ نامعقول ہے۔ آخر ٹی وی سے ڈرامے اور مزاحیہ پروگرام بھی تو ہوتے ہیں۔ کیا ان میں ادیبوں شاعروں کے لیے گنجائش نہیں نکل سکتی؟

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے گروہ بندی کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے کچھ ادھر ادھر کی باتیں بھی کی ہیں۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں:

> "آج اہم ملکی معاملات میں ادیبوں کو نہ تو شامل کیا جاتا ہے اور نہ ان کی بات سنی جاتی ہے۔ اس میں ادیبوں کا بھی کچھ قصور ہوگا لیکن زیادہ قصوروار ارباب اقتدار ہیں کیونکہ ان کا ادب اور علم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا ادیبوں اور دانشوروں کی توقیر ان کے بس کی بات بھی نہیں۔"

اب تک کی گفتگو کا یہ حاصل تھا کہ ادیب ایک دوسرے کی توقیر نہیں کرتے۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت خوش اسلوبی سے بحث کا رخ بدل دیا اور ادیبوں کی بے توقیری کو حکومت کے کھاتے میں ڈال دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بجا فرمایا کہ ارباب اقتدار کا علم اور ادب سے کوئی تعلق نہیں، لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں چیزوں کا خود ادیبوں سے کوئی تعلق ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، اصل توجہ طلب مسئلہ یہ ہے کہ ادیبوں کو حکومت کے معاملات میں شامل کیوں نہیں کیا جاتا۔ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے، اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ حکومت کو اس کا احساس ہے کہ اس کے معاملات پہلے ہی خاصے دگرگوں ہیں، اگر ادیب بھی ان میں دخیل ہو گئے تو جو کل ہونا ہے وہ آج ہو جائے گا۔ سچے ادیب کی پہچان یہ ہے کہ وہ نہ صرف آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتا بلکہ آنے والے کل کا کام بھی آج ہی کر لیتا ہے۔

بزرگ ادیب خواجہ حمید الدین شاہد نے ادبی گروہ بندی کے مسئلے کو ایک مدیر کے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ اگر ادبی رسالے گروہ بندی میں حصہ نہ لیں تو دنیائے ادب میں خوش گوار فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ادبی تحریروں کے معیار کا تعین کرنا مدیر کا فرض ہے اور اسے اس فرض کی انجام دہی سے کوئی نہیں روک سکتا۔

خواجہ صاحب کی بزرگی کی وجہ سے ہم ان سے اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتے، البتہ اس سلسلے میں سرشار صدیقی نے جو کچھ کہا ہے، اسے نقل کفر کفر نباشد کے مصداق نقل کیے دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں، "ادبی رسالوں میں اداریے مہمان مدیر لکھتا ہے اور مدیر اشتہارات جمع کرتا ہے۔" اگر یہ درست ہے تو پھر مدیر کا فرض یہ ہونا چاہیے کہ وہ اشتہاروں کے معیار اور اجرت کا تعین کرتا رہے، اور ادبی تحریروں کے معیار کا معاملہ ان پر چھوڑ دیا جائے جو مہمان مدیر کی حیثیت سے اداریے لکھتے ہیں۔ رہا اداریوں کے معیار کا مسئلہ، تو یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے جس پر گفتگو کر کے ہم اپنے کالم کی طوالت میں اضافہ کریں۔

ترقی پسندی کی لوحِ مزار

یاد ش بخیر، پچاس پچپن برس پہلے جب انجمن ترقی پسند مصنفین کے عروج کا زمانہ تھا تو انجمن سے وابستگی کی بنا پر غیر ادیبوں کو بھی شہرت مل جایا کرتی تھی۔ ادب کے بعض [illegible] ان میں سے [illegible] آج بھی اس زمانے کی شہرت کے سہارے زندہ ہیں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے [illegible] گر قلم سے نہ سہی، لوح سے اپنے تعلق کو بڑی وضع داری کے ساتھ نبھائے چلے آرہے [illegible] حمید اختر کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ انھوں نے ایک تحریکی کارکن کی حیثیت سے عملی خدمات [illegible] انجام نہیں دیں بلکہ ان دنوں کے مروجہ اور اب متروک ترقی پسندانہ معیار کے افسانے بھی لکھے مگر اس کا صلہ انھیں یہ ملا کہ کسی ترقی پسند نقاد نے ان کی افسانہ نگاری کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ [illegible] ادب کے کسی جائزے میں تو کیا، اس کے کسی حاشیے میں بھی حمید اختر کا نام نہیں ملتا اور [illegible] حمید اختر کے سوا کسی کو یہ یاد نہیں ہے کہ وہ کبھی افسانے بھی لکھتے تھے۔ اس سے پہلے کہ [illegible] لوگ پوچھتے حمید اختر کون ہے، موصوف نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی راکھ کرید کر ایک کتاب لکھ دی ہے، جس کے حوالے سے ان کا نام زندہ رہے گا۔

اس کتاب کا نام ہے "آشنائیاں کیا کیا"۔ بظاہر یہ شخصی خاکوں کا مجموعہ [illegible] حقیقت یہ مصنف کی یادوں کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے مختلف شخصیات کے تعلق [illegible] ماضی کی سیر کی ہے۔ اس کتاب میں نو شخصیات کو موضوع بنایا گیا ہے جو یہ ہیں: سید سجاد ظہیر [illegible] احمد فیض، سید سبطِ حسن، ساحر لدھیانوی، کرشن چندر، ابن انشا، ابراہیم جلیس، اخلاق احمد [illegible] اور خود مصنف۔ سات سال قبل مصنف کی جو کتاب "احوالِ دوستاں" کے نام سے شائع [illegible] یہ اسی کی توسیع شدہ صورت ہے۔ سجاد ظہیر، ابراہیم جلیس اور اخلاق احمد دہلوی کے خاکے [illegible]

دوستاں" میں شامل نہیں تھے۔ یہ پچھلے سات برسوں میں لکھے گئے ہیں۔ آخر الذکر کے سوا باقی تمام شخصیات کا تعلق انجمن ترقی پسند مصنفین سے ہے، اس اعتبار سے یہ کتاب بڑی حد تک انجمن کے ایک خاص دور کی تاریخ بھی بن گئی ہے۔

اس مجموعے کا سب سے اچھا مضمون وہ ہے جو حمید اختر نے اپنے بارے میں لکھا ہے۔ اس کا عنوان "بے وقوف" ہے، لیکن انھوں نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بے وقوف تو وہ ہوں گے جو اس عنوان سے دھوکا کھا جائیں گے۔ حمید اختر بقول خود خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کے گھر کا ماحول مذہبی تھا، دس برس کی عمر میں انھوں نے قرآن حفظ کرلیا، جوانی کی حدود میں داخل ہوئے تو غالب کی طرح انھیں احساس ہوا کہ بندگی میں ان کا بھلا نہیں ہو رہا، لہٰذا وہ مشرف بہ اشتراکیت ہوگئے اور بقول خود "انسانیت کی خدمت کو اپنا شعار بنایا اور غریبوں اور مظلوموں کی حمایت کا بیڑا اٹھالیا۔"

۱۸ برس کی عمر میں وہ اپنے بچپن کے دوست ساحر لدھیانوی کے ساتھ بمبئی چلے گئے۔ وہاں ایک فلم میں کام کیا اور انجمن ترقی پسند مصنفین شاخ بمبئی کے جنرل سیکرٹری کے فرائض انجام دیے۔ اداکارانہ صلاحیتیں دونوں جگہ کام آئیں، فلم بھی کامیاب رہی اور انجمن کے اجلاس بھی [illegible] اور باقاعدگی سے ہوتے رہے۔ پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو انسانیت کی خدمت کے لیے یہاں آگئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ لاہور کو بر سرِ زمین منظم کیا اور زیرِ زمین [illegible] سجاد ظہیر کی قیادت میں جاری رکھیں۔ سجاد ظہیر کو پاکستان کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری جنرل [illegible] بنا کر بھیجا گیا تھا اور وہ زیرِ زمین رہ کر گلشن کا کاروبار چلانے میں مصروف تھے۔ حمید اختر چار [illegible] سال [illegible] کا کام کرتے رہے، اس کام کے عوض پارٹی کی طرف سے انھیں باقاعدہ تنخواہ ملتی [illegible] کی خدمت کا یہ معاوضہ نہایت قلیل تھا، اس لیے حکومت کو ان کی خستہ حالی پر رحم [illegible] ان کی کفالت کی ذمہ داری خود حکومت نے سنبھال لی۔ حمید اختر سال بھر جیل میں [illegible] رہائی کے بعد میاں افتخار الدین کے سایۂ عاطفت میں [illegible] اور روزنامہ [illegible] میں ملازم ہوگئے۔ ۲۵ برس تک صحافت سے تعلق رکھنے اور ملازمت سے ریٹائر ہونے [illegible] معلوم ہوا کہ اخبار نویس ان کو ادیب اور ادیب ان کو اخبار نویس سمجھتے ہیں۔ اردو کا [illegible] ایسے ہی موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہے۔

حمید اختر فرماتے ہیں کہ انھوں نے ''عمر بھر سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی، انسانی سماج اور معاشرے کی اصلاح کے لیے اپنی زندگی کو فراموش کیے رکھا۔'' اگر حمید اختر دوسروں کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے اپنے راستے کا تعین خود کرتے تو شاید انسانی معاشرے کی حالت خراب سے خراب تر نہ ہوتی اور انھیں اپنی زندگی فراموش کرنے کی ضرورت بھی پیش نہ آتی۔ بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو گیا، اب صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے، یہی غنیمت ہے کہ اپنی فراموش شدہ زندگی پر ایک نظر ڈال کر حمید اختر نے ایک ایسی کتاب لکھ دی ہے جسے اُردو ادب کبھی فراموش نہیں کرے گا۔

اس کتاب کا پہلا مضمون سید سجاد ظہیر کے بارے میں ہے۔ سجاد ظہیر کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن راولپنڈی سازش کیس میں گرفتاری (۱۹۵۱ء) سے پہلے کے تین برس جو انھوں نے پاکستان میں گزارے، ان کے متعلق کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ حمید اختر نے پہلی مرتبہ تفصیل سے بتایا ہے کہ ان کی زیر زمین سرگرمیاں کیا تھیں، لاہور اور کراچی میں ان کی خفیہ قیام گاہیں کہاں کہاں تھیں اور انھوں نے کس کس طرح ''اس ملک کی بہتری، ترقی اور خوشحالی کے لیے روز و شب کام کیا''...... ہم نے اب تک تو یہی سنا تھا کہ کسی ملک کی بہتری، ترقی اور خوشحالی کے لیے ڈنکے کی چوٹ پر کام کیا جاتا ہے، یہ اب معلوم ہوا کہ زیر زمین رہ کر یہ کام بہتر طور پر انجام دیا جا سکتا ہے۔

حمید اختر نے سجاد ظہیر کے بارے میں کئی دلچسپ واقعات لکھے ہیں۔ ان میں ایک واقعہ یہ ہے کہ حمید اختر پر ایک نوجوان خاتون مہربان تھی اور ان کے گھر آیا کرتی تھی۔ ایک روز یہ خاتون کمیونسٹ پارٹی کے ایک اور رکن عبداللہ ملک کی موجودگی میں آ گئی تو انھوں نے حمید اختر کو ڈانٹ کر دھمکایا کہ تم کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہو کر ایسا غلط کام کر رہے ہو، مجھے تمہاری رپورٹ کرنی پڑے گی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ سیکرٹری جنرل سجاد ظہیر سے شکایت کی جائے گی۔ حمید اختر پریشان ہو کر فوراً ہی سجاد ظہیر کے پاس پہنچ گئے اور اعتراف جرم کر لیا تا کہ انھیں معافی مل جائے اور پارٹی سے نکالا نہ جائے۔ سجاد ظہیر نے داستان عشق سن کر کہا...... ''کمیونسٹ پارٹی عشق کرنے پر کوئی پابندی نہیں لگاتی، عشق کے بغیر انسان ادھورا اور نامکمل ہے، البتہ تم سیاسی کارکن ہو، احتیاط سے کام لو، پکڑے نہ جاؤ۔''

حمید اختر نے اس نصیحت پر عمل کیا لیکن ادھورا، عشق میں محتاط رہے، سیاست میں

احتیاطی سے کام لیا جس کے نتیجے میں پکڑے گئے۔

حمید اختر نے ایک حیرت انگیز راز کا انکشاف کیا ہے۔ راولپنڈی سازش کیس کے بعد جب اشتراکیوں کو پکڑا گیا اور قلعہ لاہور میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا تو حسن عابدی نے سجاد ظہیر کی خفیہ قیام گاہ کا پتہ بتا دیا اور سجاد ظہیر گرفتار ہو گئے۔ یقین نہیں آتا کہ حسن عابدی جیسا طرح دار شاعر سجاد ظہیر کی مخبری بھی کر سکتا ہے۔ یہ حسن عابدی وہی ہیں جنھوں نے قید کے دوران یہ بے مثال شعر کہا تھا

کچھ عجیب بوئے نفس آتی ہے دیواروں سے
ہائے زنداں میں بھی کیا لوگ تھے ہم سے پہلے

حمید اختر نے فیض کے بارے میں بعض دلچسپ باتیں بتائی ہیں۔ مثلاً کوئی ناکام عاشق ان سے مشورہ کرتا تو فوراً مدد کے لیے تیار ہو جاتے اور لڑکی والوں کے گھر پیغام لے جانے کو بھی تیار ہو جاتے۔ ''یہی نہیں عشق و عاشقی کے معاملات میں فیض صاحب بلا طلب بھی اپنی خدمات پیش کر دیتے۔ خود حمید اختر کا واقعہ ہے کہ انھیں حسب معمول کسی سے عشق ہوا اور میر تقی میر کی طرح جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ فیض صاحب کو مشترکہ دوستوں سے اس سانحے کا علم ہوا تو وہ حمید اختر کے [illegible] اور کہا، ''کون ہے وہ؟ شادی کیوں نہیں ہو سکتی، چلو ہمیں اس کے گھر لے چلو۔'' فیض [illegible] معلوم تھا کہ عشق کے بغیر شادی ہی نہیں، شاعری بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے وہ شادی تو دوسروں کی کرا دیتے تھے اور خود شاعری کرتے رہتے تھے۔ دوسروں کے عشق سے شاعرانہ قوت حاصل کرنا فیض صاحب کا ایسا کمال ہے جس کی دنیائے شاعری میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

حمید اختر نے یہ مزے دار واقعہ بھی سنایا ہے کہ ایک مرتبہ روس کی مشہور اُردو داں اسکالر مریم [illegible] لاہور میں آئیں تو حمید اختر اور فیض صاحب انھیں ''اس بازار'' میں لے گئے۔ یہ تینوں ایک جگہ گانا سننے کے لیے داخل ہوئے تو وہاں پہلے سے کچھ تماشائی بیٹھے تھے۔ انھیں دیکھ کر [illegible] خوش ہوئے اور تماشائیوں کے چہرے بھی خوشی سے روشن ہو گئے۔ کسی نے فیض صاحب کا ہاتھ چوما، کوئی پاؤں پر گرا، کسی نے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس دو طرفہ خوشی کا سبب [illegible] اور مالکان محفل فیض صاحب کے ایم اے او کالج امرتسر کے پرانے شاگرد تھے۔ [illegible] یہ واقعہ یہ بتانے کے لیے بیان کیا ہے کہ پرانے زمانے کے استاد کتنے وضع دار

تھے کہ شاگردوں کی ترقی درجات سے خوش ہوتے تھے اور شاگرد کتنے باادب تھے کہ ''اس'' بازار میں بھی استاد کا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔

اس کتاب میں صرف انھیں ادیبوں کا ذکر نہیں ہے، جن پر مضامین لکھے گئے ہیں، بلکہ ضمنی طور پر دوسرے ادیبوں کے بھی بہت سے دلچسپ واقعات بیان کیے گئے ہیں جن میں سے بعض لطائف و ظرائف کا درجہ رکھتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ حمید اختر، سردار جعفری، مجاز لکھنوی، ساحرلدھیانوی اور خواجہ احمد عباس چہل قدمی کر رہے تھے کہ راستے میں ایک شرابی ملا جو خواجہ احمد عباس سے واقف تھا اور یہ جانتا تھا کہ وہ مولانا حالی کے نواسے ہیں۔ وہ خواجہ صاحب سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگا، جب رونے کا سبب پوچھا گیا تو وہ پہلے سے زیادہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ بڑی مشکل سے اس نے رونے کا سبب یہ بتایا: ''خواجہ حالی کا نواسا اور اتنا گنجا'' یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگا۔

''آشنائیاں کیا کیا'' بلاشبہ ایک لائق مطالعہ کتاب ہے۔ اس میں جن ادیبوں کو موضوع بنایا گیا ہے، ان سب کی شخصیات کے بعض مخفی گوشوں پر حمید اختر نے نہایت عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب ہمارے عہد کے چند اہم ادیبوں کے بارے میں معلومات کا گنجینہ ہے اور حمید اختر کے خوبصورت انداز بیاں کی وجہ سے ایک عمدہ ادبی تخلیق کا درجہ رکھتی ہے۔

چند نئے خامہ خراب

اکثر نئے لکھنے والوں کو شکایت ہے کہ ہم ان کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے، یعنی اپنے کالموں کو ان کے ذکر سے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ ایک نوخیز لکھنے والے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ خامہ بگوش کی دور کی نظر کمزور ہے، اس لیے وہ مستقبل کے بڑے ادیبوں کو پہچاننے سے معذور ہے۔ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری دور ہی کی نہیں، نزدیک کی نظر بھی خاصی کمزور ہے، اس لیے زمانہ حال کے اکثر ادیبوں کو پہچاننے میں کوتاہی ہو جاتی ہے اور اگر حسن اتفاق سے انھیں پہچان لیتے ہیں تو نظر کی کوتاہی کہیں اور ظاہر ہو جاتی ہے، یعنی ان کے کمالات تک رسائی نہیں ہو پاتی۔

یہ سچ ہے کہ ہم نئے ادیبوں کو نہیں پڑھتے، اس کا سبب یہ ہے کہ پرانے ادیبوں نے ہمیں اتنا پریشان اور مایوس کیا ہے کہ اب ہم میں اتنی ہمت نہیں رہی کہ نئے لکھنے والوں کو اپنی پریشانیوں اور مایوسیوں میں اضافے کا موقع دیں۔ لیکن دو نئے لکھنے والے بڑے موقع شناس نکلے، انھوں نے ایسے زمانے میں اپنی کتابیں بھیجیں جب ہمارے پاس پڑھنے کے لیے کوئی کتاب نہیں تھی۔ اچھی بات یہ ہے کہ ان کتابوں کو پڑھ کر ہمارا وقت ضائع نہیں ہوا۔ اگر یہ کتابیں لکھ کر خود مصنفین کا وقت ضائع ہوا ہو تو اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ ہر انسان اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔

پہلی کتاب محمد یعقوب غزنوی کی ہے اور اس کا نام ہے ''گستاخیاں''۔ سرورق پر ایک الو کی تصویر ہے اور پچھلے سرورق پر خود مصنف کی۔ مغرب میں الو کو عقل و دانش کی علامت سمجھا جاتا ہے، پچھلے سرورق کی تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرق میں بھی چہرے سے عقل و دانش کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ کی ظاہری حالت اس کے باطن پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، یعنی عقل و دانش کے مرحلے

طنز و مزاح کے پیرائے میں طے کیے گئے ہیں۔ کتاب میں جو مضامین شامل ہیں، ان کے موضوعات سامنے کے ہیں، لیکن ان موضوعات کے حوالے سے جو لکھا گیا ہے، وہ سراسر نیا ہے۔ کم عمری کے باوجود مصنف کے تجربات و مشاہدات کا دامن خاصا وسیع ہے، زبان بھی صاف ستھری اور بے داغ ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ نوجوان ہونے کے باوجود مصنف نے شرفا کی صحبت اٹھائی ہے۔ اس کتاب میں جن موضوعات پر مضامین ملتے ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں: شجر کاری، چچی، کبوتر بازی، ملاوٹ، ٹھرکیاں، زبان ناک، تکیۂ کلام، بلی کے خواب اور علی ہذا القیاس۔

جملۂ معترضہ ''علی ہذا القیاس'' کسی مضمون کا عنوان نہیں ہے، یہ ترکیب ہم نے یہ بتانے کے لیے استعمال کی ہے کہ کتاب کے باقی مضامین کے عنوانات بھی اسی طرح کے ہیں بیان کیے گئے۔ یہ وضاحت اس لیے کی گئی ہے کہ ہمارا کالم مزاحمتی ادب والے بھی پڑھتے ہیں ہم نہیں چاہتے کہ ہمارا استعمال کردہ کوئی لفظ یا مجموعۂ الفاظ کسی غلط فہمی کا باعث ہو۔

اس کتاب میں مزاح سے زیادہ طنز ملتا ہے۔ طنز ذرا مشکل کام ہے کیونکہ اس کے واثبات کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ منفی بات کہہ کے مثبت نتیجہ برآمد کیا جاتا ہے یا اس کا عکس عمل کیا جاتا ہے۔ یعقوب غزنوی جب توڑ پھوڑ کے بارے میں کچھ لکھتا ہے تو صرف پر اکتفا نہیں کرتا کہ لوگ گاڑیوں پر پتھراؤ کرتے ہیں یا کھمبوں پر لگے ہوئے بلب توڑتے ہیں بلکہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ہم جہاز توڑنے سے لے کر اسمبلیاں توڑنے تک ہر معاملے میں چکے ہیں۔ اسی طرح اس کے نزدیک آزاد مملکت کا آزاد شہری وہ ہے جو کرفیو پاس لے کر گھوم سکے۔

ہمارا خیال ہے کہ اتنی تعریف کافی ہے، اگر ہم نے اس سے زیادہ تعریف کی تو ہم پر نگار ہونے کا الزام لگ جائے گا اور یہ کہا جائے گا کہ ہم مثبت بات کہہ کر منفی نتیجے کے طالب ہیں۔ بہر حال جو لوگ مصنف کی مبالغہ آمیز تعریف پڑھنا چاہتے ہیں تو وہ کتاب کے دیباچے اور فلیپ کی چار عدد رائیں پڑھ لیں۔ مصنف نے انکسار سے کام لیا ہے، ورنہ وہ اس سے زیادہ دیباچے اور رائیں لکھوا سکتے تھے، کیونکہ آج کل کسی کتاب کے بارے میں اس کتاب کے لکھنے ہی کی طرح آسان کام ہے۔

دوسری کتاب ''گفتنی شگفتنی'' ہے جو وحید الرحمٰن خاں کی تصنیف ہے۔ یعقوب غزنوی نے اپنی تصویر کے نیچے اپنا سال پیدائش لکھ دیا تھا، مگر اس عزیز نے اسے صیغۂ راز میں رکھا ہے تاہم تصویر نے راز کو راز نہیں رہنے دیا کیونکہ اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ مصنف اور کتاب کے منصۂ شہود پر آنے کے درمیان کچھ زیادہ وقفہ نہیں ہے۔ اس کی تصدیق عطاء الحق قاسمی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے، ''وحید الرحمٰن خاں اس وقت عمر کے جس حصے سے گزر رہا ہے، وہ ڈکیتی اور رہزنی کے لیے موزوں ہے، ان مشاغل کا استحقاق اسے یوں بھی حاصل ہے کہ وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور یونیورسٹی کا طالب علم بھی ہے۔''

عزیز موصوف نے اپنا مشغلہ تو وہی رکھا ہے جس کی طرف عطاء الحق قاسمی نے اشارہ کیا ہے لیکن حصول مقصد کے لیے کلاشنکوف کی بجائے قلم سے کام لیا ہے۔ کلاشنکوف اور قلم دونوں چلانے کے لیے کسی خاص استعداد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اناڑی سے اناڑی آدمی ان دونوں کو آسانی چلا سکتا ہے۔ اور اگر چلانے والا باصلاحیت ہو تو بہتر نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔ وحید الرحمٰن نے قلم چلانے میں خاصی مہارت کا ثبوت دیا ہے، اس لئے اس پر ''اے طفل خود معاملہ قد سے عصا بلند'' کی پھبتی نہیں کسی جا سکتی۔ اس کے ہاں طنز کے مقابلے پر مزاح کا پلہ بھاری ہے۔ وہ ماشاءاللہ شاعر بھی ہے۔ اس نے کتاب کے شروع میں ''عذر مزاح'' کے عنوان سے اس طرح معذرت پیش کی ہے یا اپنی معذوری کا اظہار کیا ہے:

ان دنوں مجھ پہ ظرافت کا جنوں طاری ہے
خواہش نامی و شہرت کا جنوں طاری ہے
یاروں سے شرارت کا جنوں طاری ہے
یاروں سے رقابت کا جنوں طاری ہے

چوتھا مصرعہ تو بھرتی کا ہے، لیکن پہلے تین مصرعے حسب حال ہیں اور اس کی تصدیق کتاب کے مطالب سے ہوتی ہے۔ ظرافت کا جنوں طاری نہ ہوتا تو کتاب کے چھپنے کی نوبت نہ آتی، اور یاروں سے شرارت عمر کی تقاضا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی تقاضے کو نبھانے ہی میں مصنف نے اب تک کی عمر بسر کی ہے۔ کتاب کا پہلا مضمون ہی عشق و عاشقی سے متعلق ہے۔ ایک مضمون ''ظرافت نامے'' میں بھی ''سرکار حسن وشبات'' سے مراسلت ملتی ہے لیکن کتاب میں یہی

کچھ نہیں اور بہت کچھ بھی ہے۔ مثلاً روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے انھوں نے دل کش مزاح پارے تخلیق کیے ہیں، جیسے دروازے کی گھنٹی جو اکثر فقیروں اور ناخواندہ مہمانوں کے استعمال میں رہتی ہے یا ریل کا سفر جس میں منزل مقصود منزل آخر بھی نظر آتی ہے۔

وحیدالرحمٰن خاں بنیادی طور پر قصہ گو ہے، وہ کسی بھی موضوع پر لکھے، کوئی نہ کوئی قصہ اس کے ذہن میں ضرور ہوتا ہے۔ اس قصے کے کردار اپنی حرکات اور گفتگو سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ یہ مزاح عموماً لفظوں کے "توڑ جوڑ" سے پیدا ہوتا ہے۔ اس توڑ جوڑ کی بہترین مثال "خامہ خرابی" کی ترکیب ہے جو اس نے اپنے لیے استعمال کی ہے۔ مگر یہ ترکیب کتاب میں نہیں ہے، اس نے ہمارے نام کے خط میں لکھی ہے، جو کتاب کے ساتھ موصول ہوا ہے۔ یہ ترکیب ہمیں اتنی اچھی لگی کہ اسے اپنے کالم کا عنوان بنالیا۔ ہماری دعا ہے کہ وحیدالرحمٰن خاں کی خامہ خرابی شہرت کے افق تک محدود نہ رہے اور وہ بلوغت کی عمر کو پہنچنے کے بعد بلاغت کے رازوں تک بھی پہنچے۔

دو نوجوانوں کے تذکرے کے بعد اچھا نہیں لگتا کہ ایک بزرگ کا ذکر خیر کیا جائے۔ لیکن یہ بزرگ اس اعتبار سے "نئے" ہیں کہ انھیں زندگی میں پہلی بار صاحب کتاب بننے کا اتفاق ہوا [illegible] لکھتے تو وہ ایک عرصے سے رہے ہیں، لیکن شہرت کو رسوائی سمجھ کر انھوں نے ہمیشہ اپنے نام اور کام کو چھپائے رکھا اور اگر کبھی اپنے مضامین چھپوائے بھی تو ایسے رسالوں میں جو نقش و نگار طاق نسیاں بن چکے ہیں۔ ان بزرگوار کا نام نامی شاہ محی الحق فاروقی ہے۔ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں جس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک زمانے میں وہ وفاقی حکومت کے ادارے اسلامی نظریاتی کونسل کے سیکرٹری تھے (مگر اب تو اس ادارے کا صدر ہونے کے لیے بھی پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں ہے)۔ ان کی زندگی محنت اور جدوجہد کی عمدہ مثال ہے، انھوں نے ایک کلرک کی حیثیت سے سرکاری ملازمت کا آغاز کیا اور جائنٹ سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ آج کل وہ آپ بیتی لکھ رہے ہیں۔ چونکہ ان کی ملازمت کا سارا زمانہ SIR کہنے یا سننے میں گزرا ہے، اس لیے آپ بیتی کا نام "SIR گزشت" رکھا ہے۔

فاروقی صاحب کو طنز و مزاح سے خاص مناسبت ہے۔ کسی زمانے میں مجید لاہوری کے "نمکدان" اور بعض دوسرے رسالوں میں ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ درمیان میں انھوں نے مضامین چھپوائے نہیں، لکھتے باقاعدگی سے رہے، لیکن دو چار قریبی دوستوں کو

پڑھوا کر یہ سمجھتے رہے کہ ان مضامین کے لکھنے کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔ اب انھیں قریبی دوستوں کے اصرار پر ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ "کھٹے میٹھے انار" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ کتاب کا نام ایسا ہے جیسے یہ محکمہ زراعت کی طرف سے شائع کی گئی ہو۔ لیکن نام میں کیا رکھا ہے، خود مصنف کا نام بھی تو ایسا ہے کہ اگر طنز و مزاح کی بجائے مسائل تصوف کی کسی کتاب پر چھپے تو زیادہ اچھا لگے۔

اس کتاب میں جو مضامین شامل ہیں، انھیں پڑھ کر پہلا خیال ذہن میں یہ آتا ہے کہ مصنف کا ادبیات کا مطالعہ خاصا وسیع ہے اور ادبی مذاق نہایت مہذب ہے۔ ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے اکثر جگہ یہ گمان گزرتا ہے جیسے ہم رشید احمد صدیقی کو پڑھ رہے ہیں۔ وہی شائستہ انداز بیان، وہی شستہ مزاح، وہی دل نشین طنز...... لیکن جہاں تک "موضوعات سخن" کا تعلق ہے، وہ رشید احمد صدیقی سے بالکل مختلف ہیں۔ فاروقی صاحب کی زندگی کچھ اس طرح گزری ہے کہ انھیں معاشرے کے بہت سے طبقوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور اس وجہ سے ان کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کا اندازہ ان درجنوں متنوع کرداروں سے کیا جاسکتا ہے جو اس کتاب میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً پہلا مضمون ہی ان سیاسی کارکنوں کے بارے میں ہے جو جلسوں کا انتظام کرنے سے لے کر نعرے لگانے تک کے سارے کام کرتے ہیں اور لیڈروں کو لیڈر بناتے ہیں مگر خود وہی کے وہی رہتے ہیں جو پہلے دن سے تھے اور بالآخر گمنامی کی موت مرجاتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے ہمارے ملک میں مروج نظام سیاست اور سیاستدانوں کے بارے میں اپنے طنزیہ انداز بیان میں جو حقائق پیش کیے ہیں وہ بظاہر تو خاصے خندہ آور ہیں، لیکن دراصل ایک ایسے المیے کی نشاندہی کرتے ہیں جس نے ہماری سیاست کو خود غرضی کا کاروبار بنا رکھا ہے۔

ایک مضمون اعلیٰ سرکاری افسروں کے بارے میں بھی ہے۔ مضمون نہیں، اسے ڈراما کہنا چاہیے۔ ایک بہت اہم سرکاری میٹنگ ہوتی ہے، ایجنڈے پر گفتگو کی نوبت ہی نہیں آتی اور سارا وقت [illegible] افسروں کے انتظار میں گزر جاتا ہے۔ عالم انتظار میں شرکا آپس میں جو گفتگو کرتے ہیں اسے پڑھ کر ہنسی آتی ہے، لیکن ساتھ ہی یہ خوف بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ جس ملک کو چلانے والے ایسے ہوں اس ملک کا انجام کیا ہوگا۔

یہ کتاب ہر اس شخص کو پڑھنی چاہیے جو ہنسنے کے ساتھ رونے کے لیے بھی آمادہ ہو۔

ادب کا شہنشاہِ جذبات

سیّد ضمیر جعفری کو خدا سلامت رکھے اور نظرِ بد سے بچائے، کیا باغ و بہار طبیعت پائی ہے کہ خود بھی خوش رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے ہیں۔ نثر ہو یا نظم، مزاح ہو یا غیر مزاح، کسی میدان میں بند نہیں ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کے بعد ہماری مزاحیہ شاعری مسخرگی کی سطح سے اوپر نہ اٹھ سکی تھی، سیّد صاحب نے اسے دوبارہ وقار اور معیار سے آشنا کیا اور ایسا رنگِ سخن نکالا جس کے وہ آپ ہی موجد آپ ہی خاتم ہیں۔ نثر میں بھی ان کی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ شخصی خاکوں، سفرناموں اور روزنامچوں کی صورت میں انھوں نے اپنی یادوں اور تجربوں کو ادبی حسن کے ساتھ محفوظ کر دیا ہے۔ سیّد صاحب عمر کی اس منزل میں ہیں جو کام سے زیادہ آرام کی عمر ہے، لیکن کام ہی ان کا آرام ہے، اس لیے اگر انھیں اُردو کا "پیرِ جواں سال" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

سیّد صاحب عملی آدمی بھی ہیں، مشاعروں، ادبی جلسوں، ٹی وی پروگراموں اور سیر و سیاحت کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ کچھ عرصے سے وہ ایک ادبی رسالہ "چہارسو" بھی نکال رہے ہیں جس کے اب تک دو درجن سے زیادہ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اس رسالے میں وہ سب کچھ ہوتا ہے، جو کسی اچھے اور معیاری ادبی رسالے میں ہونا چاہیے، لیکن اس کا ایک وصف ایسا ہے جو اسے اُردو کے عام رسالوں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس کے ہر شمارے میں "قرطاس اعزاز" کے عنوان کے تحت رسالے کے تقریباً نصف حصے میں کسی ادیب کی شخصیت اور ادبی کارناموں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمارے بیشتر ادیب اس لائق ہیں کہ ان کے بارے میں "قرطاس ابیض" شائع کیا جائے، کیونکہ انھوں نے ادب کو غیر ادبی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا رکھا ہے، لیکن سیّد صاحب بڑے معاملہ شناس ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ آج کل کے ادیبوں کی اپنی تحریریں ان

کے حق میں قرطاس ابیض کا درجہ رکھتی ہیں، لہٰذا وہ قرطاس اعزاز پیش کر کے انھیں اس غلط فہمی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں کہ مستقبل کا ادبی مورخ انھیں کبھی نظرانداز نہیں کر سکتا۔

مستقبل کا ادبی مورخ ضمیر جعفری کی طرح فراخ دل ہوگا یا نہیں، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم تو سیّد صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے یہ کالم لکھ رہے ہیں کہ انھوں نے قرطاس اعزاز شائع کر کے اپنے کئی پسندیدہ ادیبوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع دیا جائے۔

"چہارسو" کا تازہ شمارہ ڈاکٹر انور سدید کے ذکرِ خیر کے لیے وقف ہے۔ اس میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید قریشی، جوگندر پال اور دوسرے کئی اہم ادیبوں نے اک رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھا ہے۔ کسی نے ان کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے اور کسی نے ان کی متنوع علمی و ادبی فتوحات کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے بھی کئی مضامین نظم و نثر شائع کیے گئے ہیں۔ مختلف اصنافِ سخن میں ان کی طبع کی روانی اور جولانی دیکھنے کے لائق ہے۔ شروع میں ان کا بائیو ڈیٹا ہے اس میں نادر معلومات ملتی ہیں مثلاً پہلے تو یہ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے لی۔ پھر یہ اطلاع دی گئی ہے کہ پرائمری کی تعلیم انھوں نے اسلامیہ اسکول سرگودھا سے حاصل کی۔ بظاہر یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد پرائمری کی تعلیم حاصل کی جائے، لیکن ہمارے نزدیک اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اگر علم کی لگن ہو تو انسان پی ایچ ڈی کے بعد بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکتا ہے۔

رسالے میں ڈاکٹر صاحب کا ایک انٹرویو بھی شامل ہے۔ اس سے بھی بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، مثلاً سرگودھا کے قصبے میانی سے تعلق کی بنا پر پہلے ان کا نام انور میانوی تھا اور وہ اس نام سے فلمی رسالوں میں افسانے لکھا کرتے تھے۔ ان کا پہلا افسانہ رسالہ "گرو گھنٹال" میں شائع ہوا تھا، اس کے ساتھ ایڈیٹر نے یہ عبارت جلی حرفوں میں لکھی تھی: "ممتاز افسانہ نگار حضرت انور میانوی کا جذباتی شاہکار"۔ مدت ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب افسانہ نگاری ترک کر چکے ہیں مگر جذباتی شاہکاروں کی تخلیق کا کام اب بھی جاری ہے۔ اپنے ادبی حریفوں کے بارے میں انھوں نے بے شمار جذباتی شاہکار تخلیق کیے ہیں۔ اگر ان کے حوالے سے انھیں فلمی زبان میں "شہنشاہِ جذبات" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کا فلموں سے نہ سہی رسالوں سے تو پرانا تعلق

ادبی حریفوں کا ذکر آیا ہے تو یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ ان سے نبرد آزمائی میں گزرا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب جھگڑوں میں وقت ضائع نہ کرتے تو ان کی ادبی تصانیف کی تعداد، موجودہ تعداد سے کہیں زیادہ ہوتی۔ ہمیں اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جھگڑوں کے ساتھ ساتھ جو یہ سنجیدہ ادبی کام کیا ہے وہ مقدار اور معیار کے اعتبار سے خاصا اطمینان بخش ہے۔ بلکہ مقدار کے اعتبار سے تو تشویشناک بھی ہے۔ ان کی اب تک کی مطبوعہ تصانیف کی تعداد پچاس کے قریب ہے۔ اگر ان کے غیر مدون مضامین اور کالموں کو کتابی صورت میں جمع کیا جائے تو اتنی ہی کتابیں اور بھی شائع ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اس کی داد دینی چاہیے کہ ہر وقت معرکہ آرائیوں میں مصروف رہنے کے باوجود سنجیدہ کاموں کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے انھیں ایک خط میں لکھا تھا کہ "آپ کھاتے، پیتے اور سوتے کس وقت ہیں، کیونکہ جس رفتار سے آپ کی معلومات افزا اور نادر کتابیں شائع ہوتی ہیں، ان کو دیکھ کر گمان گزرتا ہے کہ آپ کے نظام الاوقات میں کھانے پینے اور سونے کے لیے وقت بچتا نظر نہیں آتا۔" سننے میں آیا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید نے اس کے جواب میں لکھا تھا: "میں تو کھانے پینے اور سونے کے دوران ہی معلومات افزا اور نادر کتابیں لکھتا ہوں، کیونکہ باقی سارا وقت تو حریفوں کی تواضع میں صرف ہو جاتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب پر ادبی گروہ بندی کا الزام لگایا جاتا ہے، وہ ایک عرصے سے چند ادیبوں کے خلاف لکھ رہے ہیں۔ کوئی بھی مسئلہ ہو، کوئی بھی موضوع ہو، وہ جب بھی کچھ لکھتے ہیں ان ممدوحین کی ہجو کے لیے گنجائش نکال لیتے ہیں۔ اپنے اس عمل پر وہ شرمندہ نہیں بلکہ فخر کرتے ہیں۔ انٹرویو لینے والے کے ایک سوال کے جواب میں وہ فرماتے ہیں: "مجھے اعتراف ہے کہ میں نے بعض ادیبوں کے قول و فعل کے تضاد کو نمایاں کیا ہے۔ ان کی شخصیت کی کجی کو نشان زد [illegible] یا ہے کہ اشتہاری شرافت اور اخباری شہرت زیادہ دیر قائم نہیں رہتی۔ یہ کاٹھ کی ہنڈیا چوراہے میں پھوٹ جاتی ہے۔"

ممکن ہے بعض غیر جانبدار لوگ یہ کہیں کہ اگر کچھ ادیبوں کے قول و فعل میں تضاد پایا جاتا ہے یا ان کی شخصیت میں کجی ہے تو اس سے آپ کو کیا مطلب۔ اشتہاری شرافت اور اخباری شہرت اگر دیرپا نہیں ہوتی تو یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ نہ محتسب نہ قاضی نہ شحنۂ شہر، یہ [illegible]

کیا فائدہ؟

غیر جانبدار لوگوں کی خدمت میں عرض ہے کہ اشتہاری اور اخباری ادیبوں کے خلاف لکھنے کے بڑے فائدے ہیں۔ ایک تو یہ ثواب کا کام ہے، دوسرے اظہار کے نئے نئے پیرائے وجود میں آتے ہیں جن کی وجہ سے زبان کا دامن وسیع ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر صاحب کے انٹرویو کا جو اقتباس اوپر پیش کیا گیا ہے، اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ کاٹھ کی ہنڈیا چوراہے میں پھوٹ جاتی ہے۔ اب تک تو یہی سنا تھا کہ چوراہے میں پھوٹنے والی ہنڈیا کی نہیں، ساجھے کی ہوتی ہے اور جو ہنڈیا چولھے پر بار بار نہیں چڑھتی وہ کاٹھ کی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں ہنڈیاؤں سے متعلق الگ الگ ضرب الامثال کو ملا کر ایک نئی ضرب المثل وضع کر لی جس میں دونوں ضرب الامثال کے معنی یک جا ہو گئے۔ اسی قسم کے لسانی اجتہادات ہی سے زبان ترقی کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر انور سدید اخباری اور اشتہاری ادیبوں کے خلاف جو مہم چلا رہے ہیں، اس کا اصل مقصد اردو زبان کی توسیع و ترقی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا سے ڈاکٹر انور سدید کی دوستی مثالی ہے مگر "دوستی" کا لفظ تعلقات کی گہرائی اور نوعیت کا پوری طرح احاطہ نہیں کرتا، معاملہ دوستی سے کچھ آگے معلوم ہوتا ہے۔ موصوف سے سوال کیا گیا کہ اگر آپ کی ملاقات ڈاکٹر وزیر آغا سے نہ ہوتی تو آپ کی زندگی میں کس چیز کی کمی رہ جاتی۔ انھوں نے جواب دیا: "میری زندگی ادھوری رہتی، میں اردو ادب سے بھاگا ہوا فرد بھی شمار ہوتا۔ محکمہ آبپاشی کے ایک گمنام کارکن کی حیثیت سے ملازمت سے ریٹائرڈ ہو جاتا...... جس دن وزیر آغا سے ملاقات نہیں ہوتی، میں اسے اپنی زندگی میں شمار نہیں کرتا۔"

خوشی کی بات ہے کہ محکمہ آبپاشی کا ایک گمنام کارکن آج محکمہ نمک پاشی میں ملک گیر شہرت رکھتا ہے۔ اس سے زیادہ خوشی ہمیں اس بات کی ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کو ڈاکٹر وزیر آغا سے بے پناہ عقیدت ہے۔ یہ عقیدت ایسی ہے جیسی انعام اللہ خاں یقین کو حضرت مرزا مظہر جان جاناں سے تھی اور اس کا اظہار یقین نے اس شعر میں کیا ہے:

سایہ بے شخص نہیں رہتا ہے، کہتا ہے یقین
آپ سے مجھ کو جدا حضرت مظہر نہ کرو

لیکن اس ساری عقیدت کے باوجود ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک سوال کے

جواب میں ڈاکٹر انور سدید بتاتے ہیں کہ جب انھوں نے ادب کی گاڑی کھینچنی شروع کی تو ڈاکٹر وزیر آغا کی اس گاڑی کو ہر سمت دوڑانے سے نتیجہ یہ نکلا کہ کئی معصوم لوگ گاڑی کے نیچے آ کر جاں بحق ہوگئے۔ جو بات سمجھ میں نہیں آئی وہ یہ ہے کہ ہلاک ہونے والے معصوم لوگ کون تھے اور ان کی ہلاکت کی ذمہ داری کس پر ہے، گاڑی کھینچنے والے پر یا گاڑی چلانے والے پر؟ اس کا جواب کچھ بھی ہو، ہم ڈاکٹر وزیر آغا سے گزارش کریں گے کہ جس گاڑی کو ڈاکٹر انور سدید کھینچ رہے ہیں، اسے نہایت احتیاط سے چلانے کی ضرورت ہے۔

ممتاز مفتی نے ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت پر ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

"شہاب نامے کا جائزہ لیتے ہوئے خامہ بگوش نے اپنے کالم میں یہ عنوان لگایا تھا کہ قدرت اللہ شہاب بڑی خوبیوں کے مالک تھے، عیب صرف دو تھے، اشفاق احمد اور ممتاز مفتی۔ اگر خامہ بگوش کا انداز اپنایا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ انور سدید خوبیوں کے مالک ہیں۔ کمزوری صرف ایک ہے...... ڈاکٹر وزیر آغا۔"

ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی کمزوری ڈاکٹر وزیر آغا نہیں، احمد ندیم قاسمی ہیں۔ کیونکہ انھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کے حق میں اتنا نہیں لکھا، جتنا قاسمی صاحب کی ہجو کے سلسلے میں لکھا ہے۔ زیر نظر انٹرویو میں بھی انھوں نے قاسمی صاحب اور ان کے نیاز مندوں کے بارے میں علامتی انداز سے اور کھلم کھلا جو لفظ بھی استعمال کیا ہے، وہ گنجینۂ معنی کا طلسم ہے۔ [illegible] ہے کہ انھوں نے "چہار سو" میں ایک خط بھی چھپوایا ہے، جو بیک وقت ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے نام ہے اور جس میں ان دونوں سے اپیل کی گئی ہے کہ آپ اپنے ذاتی تنازعے [illegible] دیجیے اور ایک دوسرے کی طرف دست محبت بڑھا کر ادبی دنیا کو حیرت زدہ کر دیجیے۔

خیال بہت عمدہ ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان دونوں ادیبوں میں صلح ہوگئی تو ڈاکٹر انور سدید کیا کریں گے۔ ان کے پاس تو مضامین نو کے انبار لگانے کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں رہے گا۔

مزاحمتی ادب اور طلسم ہوشربا

ہمارے نام جو خطوط آتے ہیں، وہ عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ان میں ہماری تعریف ہوتی ہے یا پھر مذمت۔ تعریفی خط پڑھ کر ظاہر ہے خوشی ہوتی ہے کہ اللہ کے بعض نیک بندے ایسے مردم شناس ہمارے متعلق وہی رائے رکھتے ہیں، جو از راہ خود شناسی ہم خود اپنے بارے میں رکھتے ہیں۔ ہم منکسر المزاج ہیں، اس لیے اپنی رائے ظاہر نہیں کرتے۔ دوسرے مختلف مزاج رکھتے ہیں، اس لیے وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکتے، جو دل میں ہوتا ہے، اسے زبان قلم پر لے آتے ہیں۔ جی تو چاہتا ہے کہ ان خطوط کو شائع کر دیا جائے تا کہ ہمارے پڑھنے والے ان خطوط کے جذبات تہنیت میں برابر کے شریک ہو سکیں، لیکن ہمارے ایڈیٹر صاحب ایسے خطوں کی اشاعت کو پسند نہیں کرتے جن میں کسی دوسرے کی تعریف کی گئی ہو، کسی دوسرے کی تعریف کو وہ ادارے کی پالیسی کے منافی سمجھتے ہیں۔

مذمتی و ملامتی خطوط کو شائع نہ کرنے کا فیصلہ ہم خود ہی کر لیتے ہیں، کیونکہ رسالے کی طرح ہمارے کالم کی بھی ایک پالیسی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم کسی ایسی تحریر کی اشاعت پسند نہیں کرتے جس میں کسی کی دل آزاری کی گئی ہو۔ ظاہر ہے اس "کسی" میں ہم خود بھی شامل ہیں کیونکہ ہمارے پاس بھی ایک عدد دل ہے جو ہرگز آزار طلب نہیں ہے۔

ایڈیٹر اور کالم نگار کی الگ الگ پالیسیوں کی وجہ سے تعریفی اور مذمتی دونوں طرح کے خطوط کی اشاعت ممنوع قرار پانے کا نقصان یہ ہوا کہ ہم ایک کثیر الاشاعت اخبار کے کالم نگاروں کی طرح کالم کا پیٹ خطوں سے نہیں بھر سکتے۔ وہ یہ کرتے ہیں کہ جب کالم لکھنے کو جی نہ چاہا، قارئین کے خط چھاپ دیے۔ اخبار مذکور کے بعض کالم نگار تو بڑی حد تک قارئین کے قلمی تعاون

سے کالم لکھتے ہیں۔

اب کے ہم اپنی روایت سے انحراف کرتے ہوئے ایک خط شائع کر رہے ہیں جس میں بعض اہم مسائل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ خط نگار پروفیسر سیّد سعید احمد صاحب ہیں جو بہاولپور کے ایک کالج کے استاد ہیں۔ مطالب کے اعتبار سے یہ خط اس لائق ہے کہ ہمارے قارئین بھی اس سے استفادہ کریں۔ ہم نے اس کے جواب میں جو کچھ عرض کیا ہے اسے خط کے بعد ملاحظہ فرمایئے۔

میں آپ کا کالم باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ کا کالم پسند نہ ہوتا تو میں کیوں پڑھتا۔ لیکن پسند کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ میں آپ کی تمام آراء سے اتفاق بھی کرتا ہوں۔ خاص طور پر انجمن ترقی پسند مصنفین اور اس انجمن سے وابستہ ادیبوں کے بارے میں آپ کے خیالات ناقابلِ قبول ہیں، کیونکہ ان میں عدم توازن پایا جاتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اُردو کی سب سے بڑی ادبی تحریک میں کوئی خوبی نہ ہو اور اس تحریک نے کوئی بڑا شاعر یا ادیب پیدا ہی نہ کیا ہو۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، اصل بات مجھے جو کہنی ہے وہ یہ ہے کہ آپ [illegible] ادیبوں یا ان کی کتابوں کو موضوعِ بحث بناتے ہیں، مسائل پر بالکل نہیں لکھتے آخر کیوں؟ کیا ہمارے دور میں کبھی ایسے ادبی مسائل نہیں رہے جن پر غور و فکر کیا جائے۔ میرے نزدیک ادبی مسائل پر لکھنا، افراد اور کتابوں پر لکھنے سے کہیں زیادہ مفید ہوگا۔ میں چند مسائل کی نشاندہی کر رہا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ آپ ان پر اظہارِ خیال کریں گے۔

(۱) مزاحمتی ادب کا آج کل بڑا چرچا ہے اور یہ کہا جا رہا ہے کہ وہی ادب، ادب کہلانے کا مستحق ہے جو مزاحمتی ہو، باقی جو کچھ ہے، وہ ادب کے نام پر عیاشی ہے۔ اس ضمن میں آپ کی کیا رائے ہے؟

(۲) ادب کے فروغ میں ادبی رسائل بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ مگر آج کل کے رسائل اس فریضے کو فراموش کر چکے ہیں اور اس حد تک غیر مؤثر ہیں کہ انھیں کوئی پڑھتا ہی نہیں۔ میں نے بہاولپور، کراچی، ملتان، پشاور اور کئی دوسرے شہروں کے کسی بک اسٹال پر اور کسی [illegible] کوئی ادبی رسالہ نہیں دیکھا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے عالم گیر، نیرنگِ خیال، ساقی اور [illegible] رسالے ہزاروں کی تعداد میں چھپتے تھے اور برصغیر کے تمام ادبی حلقوں میں پڑھے جاتے [illegible] اس کے برعکس آج کسی رسالے کو ذوق و شوق سے نہیں پڑھا جاتا، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

(۳) آج کا ادیب زبان سے جو بے اعتنائی برت رہا ہے، وہ نہ صرف اس کے لیے بلکہ خود زبان کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔ ہمارے چھوٹے ادیب ہی نہیں، بعض بڑے ادیب بھی معمولی معمولی لفظوں کے معنی نہیں جانتے، اور ستم یہ ہے کہ اس کے باوجود انھیں لفظوں کے بار بار استعمال میں لاتے ہیں۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے دو مثالیں دوں گا۔ ہمارے ایک بڑے ادیب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ میں فلاں صاحب سے ملنے کے لیے ان کے کمرے میں داخل ہوا تو انھوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر میری مشایعت کی۔ یہاں انھوں نے لفظ "مشایعت" استقبال کے معنی میں استعمال کیا ہے، جب کہ اس کے معنی ہیں، "کسی کو رخصت کرنے کے لیے چند قدم اس کے ساتھ جانا"۔ اسی طرح ایک اور ادیب نے ایک کتاب کے فلیپ پر لکھا ہے، "ہر وہ جملہ جو طبعِ نازک پر گراں گزرے، جملۂ معترضہ شمار ہوتا ہے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ادیبِ شہیر کو یہی معلوم نہیں کہ جملۂ معترضہ اس جملے کو کہتے ہیں جو کسی تحریر یا بیان کے درمیان آتا ہے اور اس کا اصل تحریر یا بیان سے معنوی ربط نہیں ہوتا۔ گویا ایسا جملہ جو کسی بیان کے تسلسل میں مانع ہو، لفظ "اعتراض" کے لغوی معنی "مانع ہونا" ہیں۔ اب آپ ہی بتایئے ہر وہ جملہ جو طبعِ نازک پر گراں گزرے، جملۂ معترضہ کیسے ہو گیا؟

خوشی کی بات ہے کہ پروفیسر سیّد سعید احمد صاحب ہمارے کالم باقاعدگی سے پڑھتے ہیں، اس سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ ہم سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ہمارا حال تو اس شاعر کا سا ہے جو ہر قیمت پر مشاعرے میں کلام سناتا ہے، اس کی پروا نہیں ہوتی کہ سننے والے داد دے رہے ہیں یا ہوٹنگ کر رہے ہیں۔ تاہم پروفیسر صاحب نے اختلاف کی جو مثال پیش کی ہے، اس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ ہم نے کبھی اس سے انکار نہیں کیا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین ہماری سب سے بڑی ادبی تحریک ہے، لیکن اس کے کچھ غیر ادبی معاملات ایسے ہیں جن سے مفاہمت نہیں کی جا سکتی۔ ہم ادب کو نعرے بازی سے مختلف چیز سمجھتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی کہ اب جو لوگ اس انجمن سے وابستہ ہیں، ان کے نزدیک انجمن سے وابستگی کے لیے ادیب ہونا ضروری نہیں ہے۔ چند سال قبل انجمن کی گولڈن جوبلی (جسے بعض لوگ گولڈن بری کہتے ہیں) منائی گئی تھی تو اس میں [illegible] "ادیبوں" کی تھی جنھوں نے دیواروں پر حکیموں اور نجومیوں کے اشتہار لکھنے کے سوا

کبھی کوئی دوسرا تحریری کام نہیں کیا تھا۔ انجمن کا یہی عدم توازن ہماری تحریروں میں بھی عدم توازن کا سبب بن جاتا ہے۔

پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ ہم ادیبوں اور کتابوں پر لکھتے ہیں، مسائل پر نہیں لکھتے۔ گزارش ہے کہ ہمارے نزدیک ادب ہی سب سے بڑا مسئلہ ہیں اور اسی مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے ہمیں کتابوں پر لکھنا پڑتا ہے۔ باقی سب مسائل ضمنی ہیں، وہ مسائل بھی جن پر پروفیسر صاحب نے ہمیں اظہار خیال کی دعوت دی ہے۔

مزاحمتی ادب کے بارے میں بقول پروفیسر صاحب یہ کہا جا رہا ہے کہ اصل ادب یہی ہے باقی جو کچھ ہے وہ عیاشی ہے۔ جملہ اچھا ہے اور عیاشی بھی اچھی چیز ہے بشرطیکہ وہ اکادمی ادبیات کے وسیلے سے ہو۔ اکادمی کے ذکر کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس کی طرف سے پاکستانی مزاحمتی ادب بارہ جلدوں میں چھاپا جا رہا ہے۔ طلسم ہوشربا کی تو آٹھ جلدیں تھیں، مزاحمتی ادب اس سے بھی بڑھ گیا۔ گویا مزاحمتی ادب، طلسم ہوش ربا سے آگے کی چیز ہے یعنی اس کی تو [illegible] یہ بارہ جلدیں چھپ جائیں تو ہم بتا سکیں گے کہ مزاحمتی ادب کیا ہوتا ہے فی الحال تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ مزاحمتی ادب اس ادب کو کہتے ہیں جس کے لکھنے میں تو کچھ خرچ نہیں ہوتا، لیکن جس کے چھاپنے میں اکادمی ادبیات جیسا ادارہ پورے کا پورا خرچ ہو سکتا ہے۔

رسالوں کے بارے میں پروفیسر صاحب نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس سے ہمیں پوری طرح اتفاق نہیں ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ نیرنگ خیال اور ساقی جیسے رسالے ہزاروں کی تعداد میں چھپتے تھے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ آج کل کے ادبی رسالوں کو کوئی نہیں پڑھتا۔ یہ رسالے لائبریریوں میں اور بک اسٹالوں پر اس لیے نظر نہیں آتے کہ ان کے پڑھنے والے ملک سے باہر دستیاب ہیں۔ امریکہ، برطانیہ اور خلیج کی ریاستوں میں ان رسالوں کی بڑی مانگ ہے۔ وہاں کے اردو ادیب ان میں لکھتے ہیں اور وہی انھیں پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب رسالوں پر ان کی قیمتیں اور سالانہ چندے ڈالر، پونڈ، درہم اور ریال میں درج ہوتے ہیں۔ رسالوں میں جو کچھ چھپتا ہے، اس کا انتخاب ادبی معیار کی وجہ سے نہیں، لکھنے والوں کی معاشی اور مالی [illegible] جاتا ہے۔ ایک ایڈیٹر صاحب کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ وہ صرف انھی غزلوں کو رسالے میں چھاپتے ہیں جو چیک یا ڈرافٹ کی پشت پر لکھی ہوتی ہیں۔

پہلے زمانے میں کسی ادبی رسالے کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ اس کا ایک ایڈیٹر بھی ہوتا تھا جو دوسروں سے ہی نہیں لکھواتا تھا، خود بھی صاحب قلم ہوتا تھا، اور کچھ نہیں تو کم از کم اداریہ تو لکھ ہی لیتا تھا۔ وہ اپنے رسالے میں جو کچھ چھاپتا تھا، اس میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی دیکھتا تھا کہ زبان و بیان کی غلطیاں نہ ہوں۔ لیکن اب جو صاحبان ایڈیٹری کے منصب پر فائز ہوتے ہیں، وہ صرف اشتہارات جمع کرنے پر توجہ دیتے ہیں، انھیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ ان کے رسالے میں جو کچھ چھپ رہا ہے، وہ ادب اور زبان و بیان کے لحاظ سے کس معیار کا ہے۔ وہ اپنے رسالے کے مندرجات چھپنے سے پہلے تو کیا، چھپنے کے بعد بھی نہیں پڑھتے۔ اسی وجہ سے ہم نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ ہمارے دور میں ادبی رسالے کا ایڈیٹر پوسٹ مین کا فریضہ انجام دیتا ہے، وہ مصنف کا لفافہ قاری تک پہنچاتا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ لفافے کے اندر کیا ہے۔

پروفیسر صاحب نے اپنے خط میں تیسرا مسئلہ جو اٹھایا ہے، وہ یہ ہے کہ ہمارے ادیب زبان سے اس حد تک غافل اور بے پرواہ ہیں کہ وہ روز مرہ کے استعمال کے الفاظ کے معنی بھی نہیں جانتے۔ ہمیں اس خیال سے بھی اتفاق نہیں ہے۔ الفاظ کا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے، اس سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ لفظوں کے معنی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے جو مثالیں "قرابت" اور "جملہ معترضہ" کی دی ہیں، ممکن ہے اب ان کے معنی وہ نہ رہے ہوں جو پہلے کبھی تھے۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ایک لفظ "جمعدار" مغلوں کے زمانے میں یہ ایک اہم عہدہ تھا جس پر امراء کو فائز کیا جاتا تھا۔ انگریزوں کا دور آیا تو ہیڈ کانسٹیبل کے لیے یہ لفظ استعمال ہونے لگا اور اب ہمارے زمانے میں خاکروب کو جمعدار کہتے ہیں۔ اس طرح پرانے زمانے میں "مہتر" کا لفظ "سردار" کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے سابق ریاست چترال کے حکمران کو "مہتر چترال" کہا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے کراچی کے ناظم کو "مہتر کراچی" کہا جا سکتا ہے، لیکن وہ برا مان جائیں گے کیونکہ اب یہ لفظ خاکروب کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظوں کے معنوں میں زوال یا تبدیلی کی تازہ مثال "دانشور" میں ملتی ہے۔ ایک زمانہ میں یہ لفظ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے استعمال ہوتا تھا، اب اس شخص کو دانشور کہا جاتا ہے جسے اکادمی ادبیات اپنے خرچ پر اسلام آباد بلائے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس شخص کا دانش سے کوئی تعلق بھی ہو۔

مزاحمتی ادب یا جعلسازی بنامِ ادب

۳۵ برس سے ہم ظفر اقبال کی شاعری کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ واحد شاعر ہے جس کا دریائے سخن سال بھر طغیانی پر رہتا ہے۔ طغیانی کا نتیجہ تعمیر و تخریب، دونوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ تعمیر یہ کہ اطراف دریا کی پیاسی زمینیں دور دور تک سیراب ہو جاتی ہیں اور تخریب یہ کہ دریا کی زد میں آنے والی بستیاں اگر تباہ نہیں ہوتیں تو شکست و ریخت کے عمل سے ضرور دوچار ہوتی ہیں۔ ظفر اقبال کے دریائے سخن نے جہاں نئے نئے پھول کھلائے ہیں، وہیں پرانے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے۔

ظفر اقبال بنیادی طور پر کلاسیکی روایت کا غزل گو ہے۔ اس نے اسی روایت کے سائے میں اپنے شعری سفر کا آغاز کیا اور بہت جلد اپنے لیے ایک الگ لہجہ دریافت کر لیا۔ لیکن وہ اس پر قانع نہیں ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ نئے خیال کے لیے نئی زبان کی بھی ضرورت ہے۔ اس خیال سے اس نے زبان کے مروجہ اسالیب سے اپنا راستہ الگ کر لیا اور زبان و قواعد کے ساتھ اس نے بے تکلفی کا آغاز کیا جس نے اس کی شاعری کو شاعری سے زیادہ لسانی تجربہ گاہ بنا دیا۔ اس تجربہ گاہ میں لفظوں کو مسخ کیا گیا، قواعد کے اعتبار سے ان کے استعمال کی صورتیں تبدیل کی گئیں اور اس تبدل کے عمل کے دوران لفظ و معنی کے باہمی ربط کو بھی مجروح کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ظفر اقبال شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں اسی شان سے داخل ہوا جس شان سے محمد حسین آزاد نے غالب کو داخل ہوتے دکھایا ہے۔ یعنی...... "بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا، مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔"

واہ واہ کرنے والوں میں دو طرح کے لوگ شامل تھے۔ ایک تو وہ جنھوں نے طنزاً صدائے تحسین بلند کی اور دوسرے وہ جو ظفر اقبال کے لسانی اجتہادات پر صدق دل سے ایمان لے آئے۔ ان میں وہ شاعر بھی تھے جنھوں نے ظفر اقبال کی پیروی میں لسانی توڑا مروڑی کو اپنا شعار بنایا اور ان کا وہی حشر ہوا جو جھوٹے نبیوں پر ایمان لانے والوں کا ہوتا ہے۔ ظفر اقبال خود تو فائدے میں رہا کہ لسانی اجتہاد والی شاعری کے ساتھ ساتھ کلاسیکی انداز میں بھی شعر کہتا رہا لیکن اس کے مقلد نہ ادھر کے رہے اور نہ ادھر کے۔ ظفر اقبال آج اُردو غزل کا ایک اہم نام ہے اور اس کے مقلد گمراہان جادۂ سخن کی حیثیت سے نقش و نگار طاق نسیاں بن چکے ہیں۔ اب اگر خود ظفر اقبال بھی چراغ رخ زیبا لے کر انھیں تلاش کرنے نکلے تو ناکام رہے گا۔

ظفر اقبال نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام "آب رواں" میں دوسروں سے الگ جو لہجہ دریافت کیا تھا، وہ اس کے پچھلے اور تازہ ترین مجموعۂ کلام "عیب و ہنر" میں بے مثال لہجہ بن گیا ہے۔ اس مجموعے میں لسانی اجتہاد کا "ہوکا" پہلے جیسی شدت کے ساتھ موجود نہیں ہے لیکن کلاسیکی روایت سے تعلق اس روایت کی توسیع کی صورت میں اس طرح ظاہر ہوا ہے کہ اُردو غزل اپنی وسعتوں کے نئے مدار میں داخل ہوتی نظر آتی ہے۔

اتنا کچھ لکھنے کے بعد ضروری تھا کہ ظفر اقبال کے کچھ شعر بھی نمونۂ پیش کیے جاتے لیکن [illegible] کہ بعض اوقات سچے دعوے غلط دلیلوں کی وجہ سے رد کر دیے جاتے ہیں، ہم اس [illegible] یہیں ختم کرتے ہیں اور ظفر اقبال کی نثر نگاری پر بحث شروع کرتے ہیں۔

وہ جو مثل مشہور ہے کہ سو سنار کی ایک لوہار کی، تو یہ پوری کی پوری مثل ظفر اقبال پر صادق آتی ہے۔ وہ شاعری میں سنار اور نثر میں لوہار ہے۔ شاعری میں وہ نقش گری کرتے ہیں اور نثر میں [illegible] ہو یا پرانا، اپنی ضرب قلم سے ملیامیٹ کر دیتے ہیں۔ وہ منفرد طنز و مزاح نگار ہیں۔ طنز ایسا کہ جو اس کی زد میں آئے تڑپنے لگے، اور مزاح ایسا صحت مند کہ طنز کے وار سے تڑپنے والے بھی ہنسنے لگے۔ ان کے اخباری کالم، اخباری اداریوں سے بھی زیادہ خندہ آور ہوتے ہیں۔ [illegible] یہ ہوا کہ وہ نثر میں لسانی مجتہد کا کردار ادا نہیں کرتے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ لسانی خوش فعلیاں شاعری ہی میں چل سکتی ہیں، نثر میں ان کا مظاہرہ کیا جائے تو لکھنے والا دو قدم نہیں چل

ظفر اقبال کا تازہ ترین نثری کارنامہ مزاحمتی ادب کے بارے میں ان کا ایک مقالہ ہے اور یہی مقالہ ہمارے آج کے کالم کا اصل موضوع ہے۔ یہ مقالہ ظفر اقبال کی شاعری اور طنزیہ و مزاحیہ نثر سے بالکل مختلف ہے اور اس میں مزاحمتی ادب کے نام پر غیر ادبی سرگرمیوں کا نہایت گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہے۔

ہمارے ملک میں جب بھی پیپلز پارٹی چند مہینوں کے لیے اقتدار میں آتی ہے تو سب سے پہلے مزاحمتی ادب کی چیونٹیوں کے پر نکل آتے ہیں اور ادب چیونٹیوں بھرا کباب بن جاتا ہے۔ سرکاری ودرباری ادیبوں کا ایک طائفہ یہ باور کرانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے کہ ان کے لکھے ہوئے مزاحمتی ادب ہی کی وجہ سے "جمہوریت" بحال ہوئی ہے۔ حکومت بھی اس گروہ کی سرپرستی کرتی ہے کیونکہ اسے اپنے سیاسی مقصد کے حصول کے لیے ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو معمولی مراعات کے عوض غیر معمولی خدمات انجام دینے کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔

ظفر اقبال مزاحمتی ادب کو ادب نہیں مانتے، سیاسی نعرے بازی کا نام دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"مزاحمتی ادب، ادب کی ترویج کے راستے کی ایک رکاوٹ بن کر ہی سامنے آتا ہے کہ اس کا تانا بانا سطحی، یک پرتی اور اتھلا ہونے کی وجہ سے ذوقِ ادب کی توسیع میں کوئی کردار ادا کرتا اور ادب کی مختلف تہوں اور پرتوں سے مختلف سطحوں پر لطف اندوز ہونے کے روایت کو اس نے زبردست نقصان پہنچایا ہے۔"

ظفر اقبال نے مدلل طریقے سے ثابت کیا ہے کہ مزاحمتی ادب عوام کے خلاف ایک سازش ہے۔ اس بحث کو انھوں نے ان الفاظ میں سمیٹا ہے:

"دراصل یہی وہ سب سے بڑی سازش ہے جو محروم و مجبور طبقوں کے خلاف روا رکھی رہی ہے کہ ان کے حقوق کے لئے جس طبقے کے خلاف تگ و دو کرنے کی ضرورت ہوتی اسی طبقے سے بعض افراد اٹھ کر ان کی جعلی ہمدردی کا بہروپ بھر کر ان کے حق میں آواز اٹھا جاتے ہیں تاکہ ایک خانہ پری مکمل ہو جائے اور اس محروم طبقے میں سے خود کوئی آواز بلند کر پیدا نہ ہو کہ ان کے حق میں آواز تو پہلے ہی اٹھائی جا رہی ہے۔ چنانچہ جعلی آواز اٹھانے کرنے والے بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس کے نتیجے میں کوئی تبدیلی آتی

ہوتی ہے اور اس طرح مزاحمتی ادب کے یہ بے بہا نسخے خود اس مراعات یافتہ طبقے کے ڈرائنگ روموں اور لائبریریوں ہی میں سجے نظر آتے ہیں اور بظاہر جس طبقے کے غصب شدہ حقوق کی بازیابی کے لیے مزاحمتی شاعری تخلیق کی گئی ہوتی ہے اسے اس کی ہوا تک نہیں لگ پاتی۔"

ظفر اقبال مزاحمتی شاعری اور اس کے قاری، دونوں کو جعل ساز سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ:

"آدمی شاعر یا تو ہوتا ہے یا نہیں۔ جب کہ مزاحمتی شاعر، شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی شاعر ہو سکتا ہے۔ اس کی روشن اور زندہ مثالیں ہمارے سامنے جابجا چلتی پھرتی نظر آتی ہیں کیونکہ عام شاعر کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ مفلوک الحال ہو یا فارغ البال، جب کہ مزاحمتی شاعر کے لیے خاص طور پر خوش حال ہونا ضروری ہے، جو قیمت ادا کر کے ہر چیز خریدنے کی استطاعت رکھتا ہے اور چونکہ جس کے پاس بیچنے کو کچھ نہیں ہوتا، اس لیے وہ خریداری کرتا ہے، مداحوں کی اور اپنے قارئین کی، اور پوری چالاکی کے ساتھ اپنے قاری کو بھی اس جھوٹ میں شامل کر لیتا ہے جس کا علم اور وہ خود ہوتا ہے۔ عام شاعر ایک سچے جذبے کے ساتھ بات کرتا ہے اور اس کے روبرو ایک سچا قاری ہوتا ہے، جب کہ مزاحمتی شاعر اور اس کا قاری دونوں جعل سازی کر رہے ہوتے ہیں اور دونوں مل کر اس استحصال زدہ طبقے کے خواہ مخواہ کے ترجمان بن کر اسے سراسر دھوکا دے رہے ہوتے ہیں اور اسی کی راہ میں مستقل طور پر روڑے اٹکانے کی فکر میں غلطاں رہتے ہیں کیونکہ دونوں کا طبقاتی طور پر استحصال زدوں کے ساتھ کوئی تعلق یا رشتہ نہیں ہوتا اور جن کے مفادات کے وہ سراسر خلاف کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کا تخلیق و تحسین کردہ مزاحمتی ادب ایک طے شدہ مخصوص دائرے ہی میں گردش کرتا ہے جو استحصال زدہ طبقے کے لیے قطعی طور پر اجنبی ہوتا ہے۔"

ظفر اقبال نے اپنے ایک دوست اور مشہور مزاحمتی شاعر کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

"ہمارے ایک دوست، جو چوٹی کے مزاحمتی شاعروں میں شمار ہوتے ہیں، مراعات یافتہ کے علاوہ شراب و شباب کے بغیر ایک دن نہیں نکال سکتے۔ دنیا کی ہر چیز سے بڑی نعمت میسر ہے، جنھیں ان میں سے ایک بھی نعمت نصیب نہیں ہے، ان کے غم میں دبلا ہونے کا شوق رکھتے ہیں۔ چونکہ محض فیشن کے طور پر مزاحمتی شاعر ہیں، اس لیے ان کے مداحین بھی اس

فیشن ایبل اور فیشن زدہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو خود بھی کھاتے پیتے فارغ البال اور خوش حال لوگ ہیں، اور جو اس شاعر کو اس فیشن کے تحت پسند کرتے ہیں جس کے فیشن کے تحت صاحب موصوف یہ شاعری فرماتے ہیں۔ چنانچہ یہی طبقہ فیشن کے تحت ان کی کتابیں خریدتا بھی ہے اور اس طبقے کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی جس کی حمایت میں یہ شاعری کی گئی ہوتی ہے۔"

اپنے مضمون کے آخر میں ظفر اقبال نے ایک نہایت دلچسپ سوال اٹھایا ہے:

"سوال یہ ہے کہ اگر موجودہ حکومت معیاری اور مثالی جمہوری حکومت نہیں ہے اور اس کی چیرہ دستیوں کا ریکارڈ بھی کچھ ایسا قابلِ رشک نہیں ہے اور خلقِ خدا کا ایک قابلِ ذکر حصہ اس سے بھی تنگ ہے تو کیا اس کے ردِ عمل میں تخلیق کیے جانے والے ادب کو بھی مزاحمتی ادب کہا جا سکتا ہے یا جو ادب موجودہ حکومت کی مزاحمت میں تخلیق کیا جا رہا ہے، کیا اسے بھی مزاحمتی ادب کا نام دیا جا سکتا ہے؟ اور اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ ہماری جمہوری حکومتیں جو اکثریت کی رائے میں [illegible] نمائندہ ہیں اور جو ادیب ان سے اتفاق نہیں کرتے اور باقاعدہ اختلاف کرتے ہیں ان [illegible] تخلیق کردہ ادب کو بھی مزاحمتی کہلائے جانے کا پورا پورا حق حاصل ہونا چاہیے۔ کیونکہ مزاحمتی ادب اگر جبر کے خلاف آواز بلند کرنے اور عوام الناس کے حقوق واگذار کرانے ہی کا نام ہے تو ایک نام نہاد جمہوری حکومت کے خلاف تخلیق شدہ ادب کیوں مزاحمتی ادب نہیں کہلا سکتا۔ بصورت دیگر کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ ایک جمہوری حکومت، خواہ کتنی ہی بڑی "جابر" بدعنوان اور بدنام ہی کیوں نہ ہو وہ مزاحمت کیے جانے یا اپنے خلاف مزاحمتی تخلیق کیے جانے سے سراسر ماورا ہے؟"

ہم نے ظفر اقبال کے خیالات بلا تبصرہ پیش کر دیے ہیں۔ ان پر کسی تبصرے کی اس لیے ضرورت نہیں ہے کہ موصوف گھر کے بھیدی ہیں، اور مزاحمتی ادیبوں سے گہرے ذاتی مراسم رکھتے ہیں۔ متذکرہ مضمون کی اشاعت کے بعد مزاحمتی ادب کے سرکاری کارندوں نے پہلا کام یہ کیا کہ ظفر اقبال کو ایک سرکاری ادارے اردو سائنس بورڈ کا سربراہ مقرر کر دیا تاکہ یہ شاعر [illegible] ممنونِ احسان ہو کر مزاحمتی ادب کے خلاف مزید کچھ نہ لکھے۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ظفر اقبال اپنے راستے پر چلتا رہے گا۔ اردو سائنس بورڈ کی سربراہی پر قناعت کر لینا اس کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اس قسم کے عہدے تو مزاحمتی ادب لکھنے والوں کو ملتے ہیں۔ مزاحمتی ادب کے خلاف لکھنے والا اس سے بڑے عہدے کا مستحق ہے۔

ناصر کاظمی کی ڈائری

انکشافات اور اعتراضات

دنیا میں دلچسپی کی بے مثال چیزیں ہیں، مگر انسان کو اپنی ذات سے جو دلچسپی ہوتی ہے، اس کے سامنے دنیا کی ہر چیز ہیچ ہے۔ بعض لوگ تو پوری زندگی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر گزار دیتے ہیں، اور آئینہ بھی جھوٹ بول بول کر یقین دلاتا رہتا ہے کہ دیکھنے والے کے سامنے اس کا عکس نہیں ہے بلکہ بقول قمر جمیل، آئینے میں پھول کھلا ہے۔ یہی غلط فہمی انسان کو زندہ رکھتی ہے۔

اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

آئینے میں اپنے عکسِ جمیل کا مشاہدہ کرنے کے یوں تو بے شمار ذریعے ہیں لیکن جنھیں لکھنے پڑھنے سے دلچسپی ہوتی ہے، وہ آپ بیتیاں تحریر کرتے ہیں اور روزنامچے لکھتے ہیں۔ اردو میں [illegible] ہوئے کم آپ بیتیاں لکھی گئی ہوں گی جو بیشتر ایسے لوگوں نے لکھی ہیں جن پر کچھ بیتی ہی نہیں تھی۔ روزنامچے لکھنے کا رواج البتہ کم رہا ہے اور ایسے روزنامچے، جو لائق تذکرہ ہوں، ایک ہاتھ کی انگلیوں پر بھی بمشکل گنے جا سکتے ہیں۔

اردو کا پہلا قابلِ ذکر روزنامچہ تو وہ ہے جو مظہر علی سندیلوی نے ۱۸۶۷ء سے لکھنا شروع کیا اور اپنی وفات (۱۹۱۱ء) تک باقاعدگی سے لکھتے رہے۔ اس کا انتخاب مولوی صاحب کے پوتے، ادیب اور بزرگ محقق ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے مرتب کیا تھا جو کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ یہ روزنامچہ ایک اہم ثقافتی دستاویز ہے جس سے اودھ کی زندگی کے بہت سے ایسے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے جو [illegible] قصہ بن چکے ہیں۔

سب سے اہم اور دلچسپ روزنامچہ خواجہ حسن نظامی کا ہے جو انھوں نے تقریباً نصف صدی تک مسلسل لکھا اور موجودہ صدی کے دوسرے عشرے سے اسے چھپوانا شروع کیا، یہاں تک

کہ ''روز نامچہ'' کے نام سے ایک ہفتہ وار جریدہ بھی نکالا جس میں صرف روزنامچہ چھپا کرتا تھا۔ خواجہ صاحب اپنے ذاتی کوائف ہی نہیں لکھتے تھے بلکہ اپنے گردوپیش کے حالات بھی قلم بند کرتے رہتے تھے۔ اس طرح ان کے روزنامچے میں ان کے زمانے کی پوری تاریخ سما گئی ہے۔ نیز برصغیر کی بے شمار اہم شخصیات کے بارے میں نادر معلومات محفوظ ہو گئی ہیں۔ کاش کوئی اللہ کا بندہ ان روزنامچوں کو مرتب کر دے تو اردو میں ایک انتہائی دلچسپ کتاب کا اضافہ ہو جائے گا۔

ایک قابلِ ذکر روزنامچہ پروفیسر اختر انصاری دہلوی کا بھی ہے۔ وہی اختر انصاری جن کا شعر ضرب المثل بن چکا ہے:

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ان کا روزنامچہ ''ایک ادبی ڈائری'' کے نام سے ۱۹۴۴ء میں چھپا تھا۔ اس میں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک کے چار برسوں کے ادب کا تذکرہ ہے۔ ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس میں صرف ادب اور ادیبوں کے معاملات و مسائل کے تعلق سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ یہ روزنامچہ ان چار برسوں کے ادب کے بارے میں معلومات کا خزینہ ہے۔

اور اب ایک ایسا روزنامچہ منظرِ عام پر آیا ہے جو اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ ہمارے عہد کے ایک بڑے تخلیقی فن کار کی زندگی کا آئینہ ہے۔ یہ ''ناصر کاظمی کی ڈائری'' کے نام سے گزشتہ دنوں شائع ہوا ہے۔ ان میں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۲ء تک کے اندراجات ہیں۔ آخری اندراج ناصر کی وفات سے ایک دن پہلے (یکم مارچ ۱۹۷۲ء) کا ہے۔

ناصر کاظمی کو ۱۹۴۰ء، ۲۰ برس کی عمر ہی سے ڈائری لکھنے کی عادت تھی۔ ہر سال وہ نئی ڈائری میں اپنے معمولات درج کرتا تھا۔ یہ ساری ڈائریاں محفوظ نہیں رہیں۔ جو محفوظ رہ گئیں انھیں ناصر کے بیٹے سلطان کاظمی نے شائع کر دیا ہے۔ ناصر ہر روز ڈائری نہیں لکھتا تھا، اسی روز لکھتا تھا جب کوئی بات لکھنے کے لائق ہوتی تھی۔ چونکہ ڈائری چھپوانے کے خیال سے نہیں لکھی جاتی تھی، اس لیے اس میں بہت سی ایسی باتیں آ گئی ہیں جنھیں عموماً چھپایا جاتا ہے۔ انھیں باتوں کی وجہ سے یہ ڈائری ناصر کاظمی کے سوانح نگار کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

ناصر ایک حسن دوست اور جمال پرست انسان تھے۔ اسے جہاں کہیں بھی حسن دکھائی دیتا

ہے، اپنی ڈائری میں اس کا ذکر ضرور کرتا ہے۔ یہ حسن اسے کبھی بادلوں میں نظر آتا ہے اور کبھی بارشوں میں۔ کہیں وہ رنگ برنگے پھولوں کا ذکر کرتا ہے اور کہیں خوبصورت پرندوں کا۔ یہ سب اس کی تنہائیوں کے رفیق ہیں اور وہ ان کی موجودگی سے خوش ہوتا ہے۔ پھولوں اور پرندوں کے ساتھ ساتھ انسانی حسن بھی اسے بے حد متاثر کرتا ہے۔ ڈائری کے ابتدائی چند برسوں کے اندراجات میں ایک ایسے شخص کا بار بار ذکر آتا ہے جس کا اصلی نام ناصر نے اپنے آپ سے بھی چھپانا چاہا ہے۔ وہ اسے ''آنکھ کا تارا'' کے فرضی نام سے یاد کرتا ہے۔ اس کے حوالے سے ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔

''غزل لکھنے کی سوچ رہا ہوں۔ کچھ تصویریں آنکھوں کے سامنے ناچ رہی ہیں۔ پتے جھڑنے کا موسم ہے۔ آرزوئیں جوان ہو رہی ہیں۔ ایک ایک پتا دل شب چراغ ہے۔ آنکھ کا تارا...... میرے درد کا درماں ہے لیکن اس کے درد کا درماں کوئی اور ہے۔ یہ خواب بھی عجیب ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کا کوئی کسی کا...... جس قدر احسان اس نے مجھ پر کیے ہیں، جتنا پیار اس نے مجھ سے کیا ہے، اس کا بدلہ چکانے کے لیے دوسری زندگی چاہیے۔ سو وہ تو ناممکن ہے۔ کاش کوئی غائبانہ طاقت اسے نیک صلہ دے۔ وہ مختار ہے، وہ خوش رہے۔

اس ڈائری میں زندگی کے حسن سے لگاؤ کے ساتھ ساتھ اس کی تلخیوں کا بھی خاصا ذکر ہے۔ ناصر نے ڈائری کے شروع میں اپنے ابتدائی حالات لکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق انبالے کے ایک خوشحال گھرانے سے تھا لیکن قیامِ پاکستان کے بعد یہ خوش حالی، بدحالی میں تبدیل ہو گئی اور اسے نہایت صبر آزما حالات سے گزرنا پڑا۔ ڈائری کے متعدد اندراجات سے اس کے حالات کی تلخی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً اپنی اٹھائیسویں سالگرہ کے دن اس نے لکھا: ''میرا جنم دن۔ غریب الوطنی، بے زری، دربدری۔'' ان چار لفظوں میں اس کی پوری زندگی سمٹ کر آ گئی ہے۔

ناصر کی زندگی کس طرح گزری، اس کا اندازہ اس قسم کے اندراجات سے ہوتا ہے۔

''دھوبی نے ادھار کپڑے دینے سے انکار کر دیا۔ میلے کپڑے پہن کر دفتر امروز گیا......

[illegible] غزل کا معاوضہ دل پر پتھر رکھ کر وصول کیا۔''

''آج صرف ٹھنڈے پانی سے ناشتا کیا۔''

''پیر صاحب نے ایک دفعہ مجھے تیس روپے بطور قرض دیے جو ابھی تک ادا نہیں کر سکا۔ [illegible] لوٹا دوں گا۔ یہ فکر ہر وقت دامن گیر ہے۔ آج کل میں بہت سے احباب، ہوٹل والوں

اور پان والوں کا مقروض ہوں۔"

ناصر کاظمی کو بجا طور پر احساس تھا کہ اس کی قدر نہیں ہوئی۔ لیکن اس سے اس کے اندر کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ اس نے اس صورتِ حال کو اپنی قسمت سمجھ کر قبول کر لیا۔ لکھتا ہے۔

"میں پچھلی رات کا ایک جادو ہوں، چڑھتے سورج کی دنیا کو اپنے لفظوں سے مسحور کر ہوں۔ مفلسی میری قسمت ہے..... اب بارش ہو رہی ہے۔ پتے جھڑ رہے ہیں، تانگوں کے چلنے کا شور اور بارش کی بوندوں کا ناچ میرے کمرے کے سکوت کو توڑ رہا ہے۔ موسم کی تین شمعیں روشن ہیں جن کی روشنی میں یہ الفاظ تحریر کر رہا ہوں۔ مر جاؤں گا تو دنیا روئے گی۔ بیسویں صدی کا شاعر، مخلص منفرد شاعر، ناصر کاظمی رہتی دنیا تک حساس دلوں کو گرمائے گا۔ میں چاند میں سو ہوں گا..... ہرن جو پانی میں چاند کے عکس کے ساتھ دوڑتا دوڑتا چل بسا۔ شاعر ایک زخمی ہرن چشمے کی تلاش میں ایک عرصے سے سرگرداں ہے۔"

ناصر کاظمی کی یہ پیش گوئی حرف بحرف سچی ثابت ہوئی۔ وہ خود موجود نہیں ہے مگر اس کی شاعری حساس دلوں کو گرما رہی ہے۔

مفلسی اور دربدری کے باوجود ناصر کاظمی نے ایک بھرپور زندگی بسر کی۔ اس نے کبھی حالات کی وجہ سے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس نہیں کیا۔ وہ زندگی کی تلخیوں کو زندگی کا لازمی حصہ سمجھ کر قبول کرتا رہا۔ اپنی ڈائری میں وہ ایک زندہ دل اور باحوصلہ انسان کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ اسے پڑھے لکھے اور مخلص دوستوں کی رفاقت حاصل تھی۔ ان کے ساتھ وہ زیادہ سے زیادہ وقت گزارتا، ہوٹل میں بیٹھ کر ادبی گفتگو کرتا، اچھی اچھی فلمیں دیکھتا، مشاعروں اور ادبی محفلوں میں شرکت کرتا، لاہور کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا اور باغوں میں حسنِ فطرت سے محوِ کلام کرتا۔

ناصر کی زندہ دلی کے نمونے ڈائری میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ اس نے ظہیر کاشمیری کے ساتھ سفر کیا۔ وقت گزارنے کے لیے اس نے ایک نظم لکھی اور ظہیر کاشمیری کو سنا دی۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

دیوانے ظہیر کاشمیری
پروانے ظہیر کاشمیری

یا اک سپاہی بن کر
ل تھانے ظہیر کاشمیری
لام کی آ رہی آواز
آٹھ آنے ظہیر کاشمیری

ناصر پان کا بہت شوقین تھا۔ لاہور میں اچھا پان نایاب تھا۔ وہ گزرے ہوئے زمانے کے حوالے سے پان کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

"پان تھا یا چراغ۔ شاہانِ مغلیہ کی آنکھ کا تارا۔ نواب واجد علی شاہ کا جگر گوشہ۔ ہیرا جیسی الائچی۔ چاندنی جیسا کتھا، ستاروں جیسی چھالیہ۔ پان کیا جیسے برگ پر تتلی بیٹھی ہو۔ منہ میں جاتے ہی بتاشے کی طرح گھل جائے۔ چونے کا مزہ، چمن رس یعنی چاند کا رس۔ سلیقے سے تراشی ہوئی ڈلیاں جیسے اوشا (صبح کی دیوی) کے دانت، موتیوں کی کلیوں جیسے۔ گرمی کی دوپہر میں کھاؤ تو ٹھنڈا ہو جائے۔ اندھیری رات میں سینہ روشن ہو جائے۔ جاڑے میں پسینہ آنے لگے۔"

ناصر نے ڈائری اپنے لیے لکھی ہے، اس لیے وہ خود کلامی کا سا انداز رکھتی ہے۔ اس میں اعلیٰ درجے کی ادبی تخلیق کا فن ملتا ہے، اور بعض جگہ تو ناصر کی نثر نظم کی حدوں تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ اپنے دوسرے بیٹے کی پیدائش کا ذکر کرتا ہے:

"...... دیکھا کہ بانو کی گود میں چاند اترا ہے اور گھر کے آنگن میں چاندنی بکھری ہوئی ہے۔"

ڈائری میں بے شمار ادیبوں کا ذکر ہے اور ان کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً سعادت حسن منٹو کی خواہش تھی کہ ناصر کاظمی اس پر ایک نظم لکھ دے۔ جعفر طاہر کے بارے میں ناصر نے یہ دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے:

"صبح آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں کہ جعفر طاہر میرے سرہانے کی کرسی پر بیٹھا رو رہا ہے۔ میں نے رونے کا سبب پوچھا تو کہنے لگا تمہارے ایک شعر پر رونا آ گیا تھا۔ بقول انتظار حسین معلوم ہوا کہ حضرت باری باری سب کے شعروں پر رو چکے ہیں۔"

یہ ڈائری ہر اس شخص کو پڑھنی چاہیے جو ناصر کاظمی کی شخصیت اور اس کی شاعری کے پس منظر سے واقف ہونا چاہتا ہے اور موجودہ عہد کے ایک بڑے شاعر کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنا چاہتا ہو۔

خاکہ نگاری یا کتبہ نگاری

کراچی میں سیاسی، سماجی اور اخلاقی سطح پر کتنے ہی غلط کام کیوں نہ ہوں، زبان و بیان کی حد تک یہ شہر بڑی حد تک محفوظ و مامون ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں جناب تابش دہلوی، ڈاکٹر شان الحق حقی اور ڈاکٹر اسلم فرخی جیسے لسانی نفوسِ قدسیہ موجود ہیں جو غلط کام کرنے والوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں، لیکن غلط زبان بولنے والوں کو سیدھا راستہ دکھائے بغیر نہیں رہتے۔ یہاں جو فصیح اُردو اور ٹکسالی محاورے اور روزمرہ کا ڈنکا بجتا ہے، اس کا سہرا انھی بزرگوں کے سر بندھتا ہے۔ کیا مجال ہے کہ ان بزرگوں کی موجودگی میں کوئی غلط اُردو بول سکے یا شین قاف کے معاملے میں بے اصولی برت سکے۔ اگر کوئی دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے غلط العام فصیح کی بیساکھی کا سہارا لینے کی کوشش کرے تو یہ بزرگ اس عذرِ لنگ کو تسلیم کرنے سے انکار کردیتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ جب اخلاقی جرائم کے سلسلے میں ضابطۂ فوجداری، غلط العام فصیح کو نہیں مانتا تو ہم لسانی معاملات میں عوامی چلن کو کیوں تسلیم کریں۔ یہ بزرگ نہایت شفقت و محبت سے اصلاحِ زبان کا فریضہ انجام دیتے ہیں، جوش صاحب کی طرح جھنجھولی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ جوش صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ وہ زبان کی غلطی برداشت نہیں کرسکتے تھے اور نہایت درشتی اور تحقیر کے ساتھ غلطی کرنے والے کو ٹوک دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ غلطی کرنے والے کی زبان [illegible] مزاج درست ہوجاتا تھا اور وہ اپنی تذلیل کا بدلہ لینے کے لیے اپنی غلطی ماننے سے انکار کردیتا تھا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کو دوسروں پر اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ انھوں نے بلا کا حافظہ پایا ہے۔ بلامبالغہ ہزاروں شعر انھیں یاد ہوں گے، خصوصاً وہ شعر تو نوکِ زبان ہیں جن میں غلط الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ حسرت موہانی نے ''نکاتِ سخن'' میں معائبِ سخن کی مثالوں میں [illegible]

شعر درج کیے ہیں، ان کا حوالہ دینے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو کتاب کی ورق گردانی نہیں کرنی پڑتی، وہ اپنی کتابِ حافظہ کی ورق گردانی کرتے ہیں اور موقع و محل کی مناسبت سے شعر اس طرح سنا دیتے ہیں جیسے یہ انھی کا زائیدۂ فکر ہو۔ ویسے ڈاکٹر صاحب خود بھی اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں۔ بیسویں صدی میں انیسویں بلکہ اٹھارویں صدی کی غزل کا ذائقہ انھی کے کلام میں ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ امام بخش ناسخ نے بے شمار الفاظ کے استعمال پر پابندی عائد کردی تھی۔ خود استعمال کرتے تھے نہ اپنے شاگردوں کو استعمال کرنے دیتے تھے۔ ان الفاظ کی اگر فہرست مرتب کرنی ہو تو پرانے اساتذہ کا کلام دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سارے لفظ ڈاکٹر صاحب کے کلام ہی میں مل جائیں گے اور وہ بھی اس طرح جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ گویا آتش کی طرح وہ بھی شاعری کو مرصع سازی سے کم نہیں سمجھتے۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

ہم ڈاکٹر صاحب کے نیازمندوں میں سے ہیں۔ ہم جس زمانے میں کالج میں پڑھتے تھے وہ اسی زمانے میں ایک دوسرے کالج میں پڑھاتے تھے۔ اگر وہ ہمارے کالج میں یا ہم ان کے کالج میں ہوتے تو ہمیں ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہوتا، لیکن دو مختلف کالجوں میں ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب بال بال بچ گئے، اللہ نے عزت رکھ لی، کیونکہ ہم جیسے نااہل کا استاد ہونا [illegible] ہوتا۔ اصطلاحی معنوں میں نہ سہی، معنوی اعتبار سے ہم بہرحال ڈاکٹر صاحب کے شاگرد ہیں۔ اس لیے کہ جب بھی کسی لفظ کی صحت یا عدمِ صحت کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے یا کسی شعر کے دوسرے مصرعے کی تلاش ہوتی ہے یا کسی عمدہ موضوع پر اساتذہ کے بہت سے خراب شعر [illegible] ہوتے ہیں تو ہم ڈاکٹر صاحب ہی کو زحمت دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے دروازے سے ہم [illegible] نہیں لوٹے، ہماری دلی دعا ہے کہ اس دروازے پر تادیر ہم جیسے گدایانِ لفظ و معنی کی [illegible] اور ڈاکٹر صاحب ضرورت مندوں میں اپنے علم کی زکوٰۃ تقسیم کرتے رہیں۔

ایک محقق کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کا درجہ بہت بلند ہے۔ محمد حسین آزاد پر ان کا تحقیقی [illegible] مثال ہے۔ تحقیق میں لاکھ خوبیاں ہوں مگر ایک برائی ایسی ہے جو تحقیق اور محقق دونوں پر [illegible] ہے، اور وہ یہ ہے کہ تحقیقی مقالے پڑھنا اور کسی محقق سے بات کرنا بہت صبر آزما ہوتا

ہے۔ ہم آج تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ تحقیق زیادہ خشک ہوتی ہے یا محقق..... اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ اچھا شاعر اپنا خونِ جگر صرف کرتا ہے اور اچھا محقق اپنے پڑھنے والوں کا۔ لیکن ڈاکٹر اسلم فرخی عام محققوں سے بالکل الگ ہیں، وہ خود خشک ہیں نہ ان کی تحقیق۔ محمد حسین آزاد پر ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے، جو آزادی کے باغ و بہار اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ یہ واحد تحقیقی مقالہ ہے جسے پڑھنے کے دوران قاری یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ خودکشی کر رہا ہے۔ اس مقالے کی غیر معمولی ضخامت کی وجہ سے کوئی حادثہ پیش آ جائے تو یہ محض حسنِ اتفاق ہوگا، اسے مصنف کی تحقیقی منصوبہ بندی کا لازمی نتیجہ نہیں سمجھنا چاہیے۔

تحقیق جیسے بھاری بھرکم کام کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کچھ ہلکے پھلکے کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ شاعری کا ذکر ہم کر چکے، اب کچھ تذکرہ ان کی شخصی خاکہ نگاری کا ہو جائے۔ حال ہی میں ان کے شخصی خاکوں کا مجموعہ ''گلدستۂ احباب'' کے نام سے چھپا ہے۔ کتاب کے نام ہی سے مصنف کے کلاسیکی مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے، ڈیڑھ دو سو سال پہلے کتابوں کے نام ایسے ہی ہوتے تھے، گلدستۂ سخن، گلزارِ ابراہیم، گلشنِ بے خار، وغیرہ۔ لیکن اطمینان کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جن لوگوں کے خاکے لکھے ہیں، وہ ڈیڑھ دو سو سال پہلے کے نہیں ہیں، ایک محقق سے بعید نہ تھا کہ وہ شیخ ابراہیم ذوق، مصطفیٰ خان شیفتہ، مولوی صدرالدین آزردہ اور حکیم آغا جان عیش پر طبع آزمائی کرتا۔

''گلدستۂ احباب'' میں سترہ شخصیات کے خاکے ہیں، ان میں سے کچھ مصنف کے بزرگ ہیں، جیسے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ذوالفقار علی بخاری، شاہد احمد دہلوی اور اشرف صبوحی۔ کچھ دوست ہیں، جیسے سلیم احمد، مجتبیٰ حسین، عزیز حامد مدنی اور ضمیر الدین احمد۔ باقی خاکے بھی ایسے ہی لوگوں کے ہیں جن کے ساتھ مصنف کا گہرا ذاتی تعلق رہا ہے۔ اس کتاب میں جن لوگوں پر لکھا گیا ہے ان سب میں قدرِ مشترک ادب ہے، کوئی محقق ہے، کوئی نقاد، کوئی شاعر اور کوئی افسانہ نگار۔ گویا یہ کتاب گلدستۂ احباب ہی نہیں، ادب کا گلستانِ بے خزاں بھی ہے۔ چار خاکے زندہ لوگوں کے ہیں، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، تابش دہلوی، شان الحق حقی اور ڈاکٹر جمیل جالبی۔ خدا ان چاروں کو تا دیر سلامت رکھے۔ باقی تیرہ خاکے مرحومین کے ہیں، لیکن اس کتاب میں وہ بھی زندہ نظر آتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر اسلم فرخی کے قلم کی مسیحائی نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ لوگ جو ہمارے درمیان موجود نہیں

ہیں، اس کتاب میں ہم انھیں چلتے پھرتے اور باتیں کرتے دیکھتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہر خاکہ کسی جیتی جاگتی شخصیت کا خاکہ ہے۔

اکثر جگہ ڈاکٹر صاحب نے قلم کی جگہ موقلم سے کام لیا ہے اور ایسی ایسی خوبصورت تصویریں بنائی ہیں کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ ہر شخصیت کو ایسی گہری نظر سے دیکھا ہے کہ بعض ایسے پہلو بھی سامنے آ گئے ہیں جن تک عام نظروں کی رسائی ممکن نہیں۔ مثلاً ذوالفقار علی بخاری اور شاہد احمد دہلوی پر بہت سوں نے لکھا ہے، لیکن ڈاکٹر اسلم فرخی نے ان دونوں کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں وہ کسی دوسرے کی تحریر میں نہیں ملتیں۔ دراصل ڈاکٹر صاحب کے خاکوں کا ایک بڑا مقصد معلومات کی فراہمی بھی ہے۔ خاکے لکھتے وقت ان کے اندر کا محقق انھیں مجبور کرتا ہے کہ وہ ایسی معلومات بھی سامنے لائیں جو آگے چل کر متعلقہ شخصیات کے سوانح نگاروں کے کام آ سکیں۔

شخصی خاکہ ذاتی تعلق کے بغیر نہیں لکھا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خاکہ نگار دوسروں پر لکھنے کے دوران خود اپنی شخصیت کو بھی بے نقاب کرتا جاتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ڈاکٹر اسلم ایک انتہائی شائستہ و مہذب، وضع دار بلکہ دین دار شخص کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان کے نزدیک خاکہ نگاری ایک بہت بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ مقصد ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

''اچھائیوں کو اجاگر کرنا اور ان کے اظہار سے انسانیت کے روشن مستقبل کے امکانات کو واضح کرنا میری خاکہ نگاری کا بنیادی مقصد ہے۔''

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ مقصد بلاشبہ بہت عمدہ ہے لیکن شاعروں ادیبوں کے خاکے لکھ کر یہ مقصد شاید ہی پورا ہو سکے۔ بہتر ہوتا اگر ڈاکٹر صاحب صوفیا یا دیگر برگزیدہ شخصیات پر خاکے لکھتے۔ اس طرح انسانیت کے روشن مستقبل کے امکانات بہتر طور پر واضح ہو سکتے تھے۔ اور ان میں ثواب الگ سے ملتا۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو خاکہ نگار اپنے موضوع کی صرف خوبیاں بیان کرتے ہیں، انھیں خاکہ نگار نہیں، کتبہ نگار کہنا چاہیے۔

ہمیں ان باتوں سے اتفاق نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کمال تو یہی ہے کہ انھوں نے شاعروں ادیبوں میں وہ خوبیاں ڈھونڈ نکالیں جو برگزیدہ شخصیات ہی میں مل سکتی ہیں۔ انھوں نے

اپنے ممدوحین کے روشن پہلوؤں سے سروکار رکھا اور بشری کمزوریوں کو نظر انداز کر دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے موقف کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

"مجھے اعتراف ہے کہ میرے ممدوحین میں بشری کمزوریاں بھی ہیں۔ میں کسی حد تک ان بشری کمزوریوں سے واقف بھی ہوں، لیکن میں نے انھیں الم نشرح نہیں کیا...... مجھے دوسروں کی کمزوریوں پر غصہ بھی آتا ہے لیکن میں تحریر میں اس کا اظہار ضروری نہیں سمجھتا۔ غصہ جلد ختم ہو جانے والا جذبہ ہے۔ تحریر کا زہر ہمیشہ رہنے والا ہے۔ زندگی میں اور الجھنیں کیا کم ہیں کہ میں تحریر کی زہرناکی سے اپنے قارئین کی ذہنی خلش میں اضافہ کروں۔"

یہ اقتباس پڑھنے کے بعد سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ حالی کے بعد ڈاکٹر اسلم فرخی دوسرے بھلے مانس ادیب ہیں۔ لیکن جہاں تک قارئین کی ذہنی خلش کا تعلق ہے، وہ اس وقت بڑھ جاتی ہے جب شاہد احمد دہلوی کے خاکے میں یہ الفاظ نظر آتے ہیں:

"وہ غلط بات برداشت کرنے کے عادی نہیں تھے۔ حق بات کہتے تھے۔ اب اسے کوئی درشتی [illegible] سے تعبیر کرے یا کوئی اور نام دے۔ شاہد بھائی نے جو خاکے لکھے ہیں، ان میں اسی انداز کی [illegible] ہے۔ جو کچھ دیکھا بڑی صاف گوئی سے بیان کیا۔ خوبیاں بھی لکھی ہیں، خامیاں بھی لکھی ہیں۔ خامیوں پر پردہ ڈالنے کی خواہ مخواہ کوشش نہیں کی، نہ کسی شخص کو فرشتہ بنا کر پیش کیا۔"

قارئین کی ذہنی خلش کا سبب یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس بات کو اپنے لیے جائز نہیں رکھتے، وہی بات شاہد احمد دہلوی میں نظر آتی ہے تو وہ لائق تحسین کیوں ٹھہرتی ہے؟

اس مجموعے کے سب ہی خاکوں سے مصنف کا خلوص جھلکتا ہے۔ انھوں نے بڑی محبت سے اپنے بزرگوں اور دوستوں کی تصویر کشی کی ہے البتہ ایک خاکے میں محبت کے ساتھ [illegible] عقیدت بھی شامل ہو گئی ہے۔ اور وہ خاکہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا ہے۔ خاکہ بہت اچھا [illegible] خاکہ نگار کی عقیدت کی وجہ سے وہ بے تکلفانہ فضا پیدا نہیں ہو سکی جس کے بغیر خاکہ، خاکہ [illegible] سوانحی مضمون بن جاتا ہے۔ یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان عالم بے بدل [illegible] شفیق بزرگ ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ایک زندہ دل انسان بھی ہیں۔ اس کے [illegible] غلام مصطفیٰ خان نے خود اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس میں ان کی شخصیت زیادہ [illegible] ہے۔ مثلاً ایک مضمون میں انھوں نے ریل کے ایک سفر کا یہ واقعہ بیان کیا ہے:

"سراج الحق ڈبے سے باہر گئے تو ایک ہندو کوتوال، اُس کا بیٹا اور ایک مسلح سپاہی ڈبے میں داخل ہوا۔ کوتوال کا بیٹا سراج الحق کی جگہ پر بیٹھ گیا۔ کوتوال اور سپاہی ذرا فاصلے پر بیٹھ گئے۔ سراج الحق واپس آئے اور...... انھوں نے کوتوال کے لڑکے سے کہا کہ میری جگہ سے اٹھو۔ لیکن وہ اپنے باپ کی وجہ سے اکڑ میں تھا...... وہ ایک دم سراج الحق سے گتھم گتھا ہو گیا۔ میں نماز میں تھا، جلد سلام پھیرا اور کوتوال کے بیٹے کی پیٹھ پر ایسے گھونسے رسید کیے کہ وہ ڈھیلا پڑ کر بیٹھ گیا۔ لیکن میرا آخری گھونسا اس کے باپ نے دیکھ لیا تو وہ مجھ پر لپکا۔ میں نے جلدی سے دوسرے ہاتھ سے اپنا پنجہ بچایا۔ اتنے میں سپاہی نے میری طرف اپنی بندوق تان لی۔ میں نے اس سے بندوق چھڑا لی۔ پھر تو وہ کانپنے لگا۔ ڈبے کے لوگ بھی گھبرا گئے۔ لیکن پھر ریلوے کے لوگ آ گئے اور بیچ بچاؤ کر دیا، لیکن کوتوال صاحب کو جو گھونسا رسید ہوا تھا، وہ انھیں برسوں یاد آتا رہا ہوگا۔"

کاش اس موقع پر ڈاکٹر اسلم فرخی بھی ریل کے ڈبے میں موجود ہوتے اور جب وہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی شخصیت پر لکھتے ہوئے اس واقعے کی تفصیل بیان کرتے تو خاکہ نگاری کا حق ادا ہو جاتا۔

"گلدستۂ احباب" اگرچہ شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے لیکن دراصل یہ ایک عہد کی تاریخ ہے۔ ان چار شخصیات کو چھوڑ کر باقی سب کا تعلق کراچی سے ہے، اس لیے اس کتاب میں قیام پاکستان کے بعد کے کراچی کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ وہ بھی کیا لوگ تھے جو ہندوستان کے گوشے گوشے سے آئے اور انھوں نے اس شہر کی تہذیبی زندگی کی بنیاد رکھی! پیر حسام الدین راشدی مرحوم کہا کرتے تھے کہ علمی و ادبی لحاظ سے پورا ہندوستان اُجڑا تو شہر کراچی آباد ہوا۔ اس دور کی تفصیل دیکھنی ہو تو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔

(۱۰ اگست ۱۹۹۵ء)

علمی و ادبی ادارے یا علم و ادب کے مزار

شوکت صدیقی اور ڈاکٹر حنیف فوق کے درمیان ثقافتی پالیسی پر جو گفتگو ہوئی تھی، اس کے کچھ نکات پر پچھلے ہفتے کے کالم میں اظہارِ خیال کیا جا چکا ہے۔ ان دونوں دانش وروں نے ثقافتی پالیسی کے ساتھ ساتھ بعض دیگر اہم مسائل پر بھی فکر انگیز اور سنسنی خیز باتیں کیں۔ اس فکر انگیزی اور سنسنی خیزی کو ہم اپنے ان قارئین تک پہنچانا ضروری سمجھتے ہیں جن کی نظر سے مذاکرہ نہیں گزری، تاکہ قارئینِ کرام کو معلوم ہو سکے کہ ہماری ادبی دنیا کے اہم مسائل کیا ہیں اور ان مسائل کے بارے میں ہمارے دو بزرگ ادیب کیا رائے رکھتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ادب کے نقار خانے میں رائٹرز گلڈ کا طوطی بولتا تھا مگر جب سے اکادمی ادبیات منصۂ شہود پر آئی ہے اور ایوانِ اقتدار کی چلمن سے لگی بیٹھی ہے، رائٹرز گلڈ کا طوطی منقار زیرِ پر ہو گیا ہے۔ چند سال پہلے تک رائٹرز گلڈ کے حوالے سے تعزیتی جلسوں کی خبریں کبھی کبھار اخباروں میں چھپ جاتی تھیں جن سے گلڈ کے زندہ ہونے کا ثبوت مل جاتا تھا، اب تو گلڈ نے ایک عرصے سے کوئی تعزیتی جلسہ نہیں کیا، حد تو یہ ہے کہ یہ ادارہ خود اپنا تعزیتی جلسہ کرنا بھی بھول گیا۔ گویا، اوروں کے گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے۔ گلڈ کی اس زبوں حالی کا سبب یہ ہے کہ اب ہر حکومت، گلڈ کی بجائے، اکادمی ادبیات کی سرپرستی کرتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اکادمی ادبیات کا مقصد ہی یہ تھا کہ گلڈ کو خارج از آہنگ کر دیا جائے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر اس ستم ظریف کا سراغ بھی لگانا چاہیے جو اکادمی کا بانی ہے تاکہ اس کے ذہنِ رسا کی داد دی جا سکے۔ ایک زمانے میں احمد فراز نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ اکادمی کے بانی ہیں۔ لیکن اس دعوے کو کسی نے اس لیے تسلیم نہ کیا کہ احمد فراز شاعری ہی میں نہیں اور

گفتگو میں بھی شاعرانہ تعلّی کے عادی ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ شوکت صدیقی نے اس راز سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اکادمی ادبیات پاکستان کو وجود میں لانے کا بنیادی کام رائٹرز گلڈ نے انجام دیا اور اس کا سہرا جمیل الدین عالی کے سر ہے۔"

ایسے ہی موقعوں پر کہتے ہیں، "خود کردہ را علاجے نیست"۔ گلڈ نے اکادمی کو وجود میں لانے کا بنیادی کام انجام دے کر خود اپنے وجود کی بنیادوں پر کاری ضرب لگائی۔ اس افسوس ناک صورتِ حال میں خوشی کا بھی ایک پہلو نکلتا ہے اور وہ یہ کہ ہم اب تک سمجھتے تھے کہ عالی صاحب کے سر پر ایک ہی سہرا بندھا ہے اور وہ ہے رائٹرز گلڈ کے بانی ہونے کا۔ اب معلوم ہوا کہ ان کے سر پر ایک نہیں دو سہرے ہیں، کیونکہ اکادمی کے بانی بھی وہی ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں عالی صاحب دوسرے شاعر ہیں جنھیں بیک وقت دو سہرے باندھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ پہلا شاعر یگانہ تھا جس نے اپنے اعزاز کی تفصیل اس شعر میں پیش کر دی ہے۔

لکھنؤ کے فیض سے دو دو ہیں سہرے میرے سر
اک تو استادِ یگانہ دوسرے داماد ہوں

لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ سہرا تو عالی صاحب کے سر بندھا ہے اور قبضہ اکادمی پر اُن افراد کا ہے جن کے سروں پر مرغ بادنما کا سایہ ہے، جسے وہ ظلِ ہما سمجھتے ہیں۔

مرغ بادنما والی بات ہماری اختراع نہیں، اس کا ماخذ شوکت صاحب کا یہ قولِ سدید ہے:

"پیپلز پارٹی کی حکومت دوبارہ آئی اور اکادمی ادبیات فعال ہوئی تو اس میں وہی لوگ موجود تھے جو [illegible] کی حکومت میں تقریریں سنتے تھے اور ہم ٹیلی ویژن پر دیکھتے تھے کہ وہ تالیاں بجا رہے ہوتے تھے۔"

اس اجمال کی تفصیل بھی شوکت صاحب کی زبانِ حقیقت ترجمان سے سننے کے لائق ہے:

"ہر زمانے میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اربابِ اقتدار سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور اس سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ جب ایک حکومت چلی جاتی ہے تو یہ گوشہ نشین ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد نکل آتے ہیں اور پھر نئی حکومت کی اسی انداز میں قصیدہ خوانی کرتے ہیں۔"

شوکت صاحب پرانے زمانے کے آدمی ہیں، اس لیے وہ تالیاں بجانے اور قصیدہ خوانی

کرنے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص محض تالیاں بجانے کی وجہ سے دانشور سمجھا جائے اور قصیدہ خوانی کرنے کی بنا پر کسی علمی یا ثقافتی ادارے کا سربراہ بنا دیا جائے تو یہ خسارے کا سودا نہیں ہے۔ خسارے میں وہ تو رہتے ہیں جو یہ دونوں کام نہیں کر سکتے اور جو لوگ یہ معمولی کام بھی نہیں کر سکتے، ان سے کسی بڑے کارنامے کی کیا توقع رکھی جا سکتی ہے؟

ثقافتی پالیسی میں مزاحمتی ادب کو اٹھارہ جلدوں میں شائع کرنے کا منصوبہ تجویز کیا گیا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے شوکت صاحب فرماتے ہیں:

"یہ کون سا مزاحمتی ادب ہے۔ وہ جو جنرل ضیاء الحق کے خلاف لکھا گیا؟ آج آپ اسے مزاحمتی ادب قرار دے رہے ہیں، کل آپ کی حکومت کے خلاف لکھا جانے والا ادب مزاحمتی قرار دیا جائے گا۔"

ہم نہایت ادب سے عرض کریں گے کہ اٹھارہ جلدوں میں شائع کیے جانے والے مزاحمتی ادب کی نوعیت سے شوکت صاحب پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ ایک بار ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور اب پھر عرض کرتے ہیں کہ جب سے محلے کی سطح کے سیاسی کارکنوں نے ادیبوں اور دانشوروں کا سوانگ رچایا ہے، تب سے ہر وہ تحریر جو ادب کی راہ میں مزاحم ہو، مزاحمتی ادب کہلاتی ہے۔ سیاسی جلسوں کے پوسٹروں اور جلوسوں کے نعروں کی ہماری زندگی میں جو اہمیت ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اب ادب پاروں کو محفوظ کرنے کے لیے اٹھارہ جلدیں تو بہت کم ہیں۔ [illegible] اتنی جلدیں بھی شائع ہو جائیں تو یہ ایک بڑی خدمت ہوگی۔

شوکت صاحب کا یہ خیال بھی نظر ثانی کا محتاج ہے کہ ضیاء الحق کی آمریت کے دور میں مزاحمتی ادب لکھا گیا تھا۔ اس دور میں کسی "ادیب" یا "دانش ور" کو بھٹو کی پھانسی پر زبانی احتجاج کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی تو کوئی مزاحمتی ادب کیا لکھتا۔ بھٹو کی پھانسی کے چند روز بعد اکادمی ادبیات نے ضیاء الحق کی سرپرستی میں جو اہل قلم کانفرنس منعقد کی تھی، اس میں وہ تمام قلم بردار شریک ہوئے تھے جو آج کل مزاحمتی ادیب کہلانے کا شوق رکھتے ہیں۔ جب سے یہ خبر عام ہوئی ہے کہ حکومت مزاحمتی ادب لکھنے والوں کی سرپرستی کرے گی اور انھیں انعامات سے نوازے گی، اسی وقت سے جیالے پچھلی تاریخوں میں ضیاء الحق کے خلاف خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔ پچھلی تاریخوں میں لوگ قانونی دستاویزات بھی تیار کر لیتے ہیں تو مزاحمتی ادب کیوں نہیں لکھا جا سکتا؟

شوکت صاحب نے اکادمی ادبیات کو ایک ناکارہ اور بے عمل ادارہ ثابت کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے اور یہاں تک کہہ دیا ہے کہ:

"اکادمی نے پچھلے دو برس میں کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا۔ ادیبوں کی سالانہ کانفرنس کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کسی ایک آدمی کے سپرد یہ کام کر دیا جائے تو وہ کر دکھائے گا۔"

شوکت صاحب نے اکادمی کے ساتھ ساتھ اس کے سربراہ کا ذکر بھی نہایت بے تکلفانہ انداز میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہم اکادمی ادبیات کا پہلا سربراہ دیکھ رہے ہیں جس کے اعزاز میں تقاریب منعقد کی جاتی ہیں۔ یوں لگتا ہے یہ ادارہ ہی ان تقاریب کے لیے بنایا گیا ہے۔ ایسے اداروں کے سربراہ اپنی شخصیت کو نمایاں نہیں کرتے۔ آدمی بولنا تو سال دو سال میں سیکھ لیتا ہے لیکن زندگی بھر یہ ہنر نہیں آتا کہ کب نہ بولا جائے۔ جو آدمی بہت بولتا ہے، وہ اپنے لیے اتنے ہی نقصانات پیدا کرتا ہے۔ بعض حکومتیں اس لیے ختم ہو گئیں کہ ان کے لیڈر روز بولتے تھے۔ ماؤزے تنگ کہیں دس بیس سال میں ایک بار تقریر کیا کرتے تھے تو دنیا سنا کرتی تھی۔ اداروں کے سربراہوں کے لیے ضروری ہے کہ کام زیادہ کریں۔"

اکادمی ادبیات کے سربراہ کا ذکر کرتے ہوئے ماؤزے تنگ کی مثال دینا ایسا ہے جیسے نوح ناروی کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بتایا جائے کہ میر و غالب نے اس قسم کی شاعری نہیں کی۔ شوکت صاحب کا یہ مشورہ بھی غیر ضروری ہے کہ اداروں کے سربراہ کام زیادہ کریں اور بولنے سے اجتناب کریں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بولنے کا شمار کاموں میں نہیں ہوتا؟ اطلاعاً عرض ہے کہ یہ خاموش فلموں کا دور نہیں ہے، آج کل تو لوگ وہاں بھی بولتے ہیں جہاں بولے بغیر کام چل سکتا ہو۔

شوکت صاحب نے اکادمی کے سربراہ کے خلاف جو زہر اگلا تھا، اس کا تریاق ڈاکٹر حنیف فوق نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"فخر زماں صاحب اردو اور پنجابی کے نامور ادیب ہیں۔ جب وہ تقریر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خواب اور عمل کے سارے میدان ان کے سامنے کھلے پڑے ہیں اور وہ خواب کو حقیقت کا روپ دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب اچھے خاصے صاحب کشف معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ایسے حقائق کا سراغ کشف ہی کے ذریعے لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بیان سے ان کا مردم شناس ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ خدا کرے دوسری طرف سے بھی مردم شناسی کا مظاہرہ ہو۔ لیکن اس کا امکان کم ہے کیونکہ فی الوقت کسی ادارے کے سربراہ کا عہدہ خالی نہیں ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن میں احمد فراز کا، مقتدرہ قومی زبان میں افتخار عارف کا، اُردو سائنس بورڈ میں ظفر اقبال کا، پاکستان کونسل آف دی نیشنل آرٹس میں کشور ناہید کا اور قائداعظم اکیڈمی میں محمد علی صدیقی کا تقرر ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر حنیف فوق نے اور بھی کئی ایسے انکشافات کیے ہیں جن سے لوگ عام طور پر واقف نہیں ہیں۔ مثلاً انھوں نے بتایا ہے کہ مولانا رومی کے مزار کے احاطے میں ان کے مرید اور علامہ اقبال کی علامتی قبر ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ پوچھیں کہ اس اطلاع کا زیر بحث ثقافتی پالیسی سے کیا تعلق ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہم نے استاد لاغر مراد آبادی سے رہنمائی طلب کی تو انھوں نے فرمایا:

"ڈاکٹر صاحب نے علامتی انداز میں ثقافتی پالیسی کی ایک بنیادی خوبی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دراصل وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس طرح ترکی میں مولانا روم کے مزار کے احاطے میں علامہ اقبال کی علامتی قبر بنائی گئی ہے، اسی طرح موجودہ حکومت نے ملک کے تمام علمی، ادبی اور ثقافتی اداروں کو متعلقہ علوم وفنون کے علامتی مزاروں کی شکل دے دی ہے اور ان پر اپنے پسندیدہ مجاور بٹھا دیے ہیں۔"

ہمیں استادِ گرامی کے ان ارشادات سے اتفاق نہیں ہے۔ علمی و ثقافتی ادارے علامتی نہیں، سچ مچ کے مزار ہیں جن میں علوم وفنون کو دفن کر کے سیاسی سرگرمیوں کے مراکز میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اور گورکنوں ہی کو اگلے گریڈ میں ترقی دے کر مجاور بنا دیا گیا ہے۔

(۲؍نومبر ۱۹۹۵ء)

ادبی حدود اور حدود آرڈیننس

اُردو ادب کے حوالے سے ۱۹۹۵ء کو خواتین کا سال کہنا چاہیے۔ اس سال خواتین کے خصوصاً نئی شاعرات اور افسانہ نگاروں کے کئی ایسے مجموعے شائع ہوئے ہیں جنھیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ پڑھنے والوں کو ان کے گناہوں کی سزا اسی دنیا میں مل رہی ہے۔ حیرت کی ایک بات یہ بھی ہے کہ اس سال ایک نہ دو اکٹھی چار خواتین کی آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ کشور ناہید، ادا جعفری اور سحاب قزلباش کے بعد گزشتہ ہفتے حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی آپ بیتی "ہم سفر" بھی شائع ہو گئی ہے۔ ادا جعفری اور حمیدہ اختر کی آپ بیتیاں حدود کے اندر ہیں، کشور ناہید اور سحاب قزلباش کی حدود آرڈیننس کے اندر۔ ہمارا یہ کالم پاکستان سے باہر بھی پڑھا جاتا ہے، غیر ملکی قارئین حدود آرڈیننس کے معنی پوچھ سکتے ہیں، صحیح معنی تو وہی لوگ بتا سکتے ہیں جن کا اس آرڈیننس کے تحت چالان ہوا ہو۔ ہم نے تو یہ قانونی اصطلاح محض اس لیے استعمال کی ہے کہ حدود دائرے کے اندر رہتے ہوئے لکھی جانے والی آپ بیتیوں کے مقابلے پر ان آپ بیتیوں کی اہمیت واضح کی جائے جو حدود و قیود سے بلند ہو کر لکھی گئی ہیں۔

حمیدہ اختر اُردو کے نامور نقاد اور افسانہ نگار ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی بیگم ہیں اور ویسی ہی بیگم جیسی ادیبوں کی بیگمات ہوتی ہیں۔ انھیں ادب سے زیادہ اُمورِ خانہ داری سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر ادب سے دلچسپی ہوتی بھی ہے تو صرف اتنی کہ خواتین کے لکھے ہوئے معاشرتی یا گھریلو قسم کے ناول پڑھ لیے۔ ایک مشہور ادیب کا واقعہ ہے کہ ایک دن ان کی بیگم غصہ میں آ کر کہنے لگیں، "آپ یہ ہر وقت کیا لکھتے رہتے ہیں، کبھی رضیہ بٹ اور اے آر خاتون کی طرح ایک ناول بھی لکھ کر دکھا دیں تو میں آپ کو ادیب مان لوں۔"

حمیدہ اختر روایتی بیگمات سے قدرے مختلف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب سے ان کا تعلق

شادی سے پہلے بھی تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انھوں نے ادبی ماحول میں پرورش پائی۔ ان کے والد ظفر عمر اپنے زمانے کے مشہور ادیبوں میں سے تھے۔ ان کا ایک ناول ''نیلی چھتری'' تو اردو کے کلاسیکی ادب کا حصہ بن چکا ہے اور آج بھی ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔ باپ کے زیر سایہ ان میں جو ادبی ذوق پیدا ہوا تھا، اس میں ازدواجی زندگی کے بعد اضافہ ضرور ہوا، لیکن اتنا بھی نہیں کہ وہ خود ادیبہ بن جاتیں۔ پڑھنے کی حد تک وہ فعال رہیں، لیکن لکھنے کی طرف توجہ نہیں کی، ہمیشہ یہ خوف دامن گیر رہا کہ اتنے بڑے ادیب کی بیوی سے لکھنے میں کوئی غلطی ہوگئی تو لوگ کیا کہیں گے۔

بہتر برس کی عمر تک حمیدہ اختر نے کچھ نہیں لکھا، اور پھر اچانک ان کی زندگی میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ انھوں نے قلم اور کاغذ کو اپنا ہم راز بنا کر ساڑھے تین سو صفحات کی ایک کتاب تصنیف کر ڈالی۔ یہی کتاب ''ہم سفر'' اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس کے لکھے جانے کا پس منظر یہ ہے کہ جون ۱۹۹۲ء میں جب ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا انتقال ہوا تو حمیدہ اختر کی زندگی ایسی کچھ ایسی ہوگئی کہ وہ پہروں ڈاکٹر صاحب کی خالی کرسی کو دیکھتی رہتیں۔ آنکھوں سے آنسو بھی ہوتے اور گزرے ہوئے لمحوں کی تصویریں بھی۔ ان کے شوہر کے نہایت عزیز دوست ڈاکٹر جمیل جالبی نے یہ دردناک صورت حال دیکھی تو انھوں نے حمیدہ اختر سے کہا، جو کچھ آپ چشم تصور سے دیکھتی ہیں، وہ مجھے بھی دکھا دیجیے۔ وہ کس طرح؟ اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا، آپ کو جو کچھ نظر آ رہا ہے، اسے کاغذ پر منتقل کرتی جائیے۔ حمیدہ اختر کا خیال تھا کہ جس نے زندگی بھر کبھی کچھ نہیں لکھا، اس کے لیے اس عمر میں لکھنا ممکن نہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے انھیں سمجھایا کہ آپ یہ تصور کر لیجیے کہ آپ لکھ نہیں رہیں، بول رہی ہیں۔ میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں اور آپ پرانی باتیں اور قصے مجھے سنا رہی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ بات شاید کسی ایسے لمحے میں کہی تھی جو قبولیت دعا کا لمحہ تھا۔ حمیدہ اختر نے یادوں کو کاغذ پر منتقل کرنا شروع کر دیا۔ ابتدا لکھنے میں دقت تو ہوئی، لیکن جلد ہی زبان قلم سے باتیں کرنے کا سلیقہ آ گیا۔ چند مہینوں میں لکھے ہوئے کاغذوں کا ایک انبار جمع ہو گیا، جسے بعد میں کتاب کی صورت دے دی گئی۔

پوری کتاب میں کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ عبارت کو بنانے سنوارنے یا ادبی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لکھنے کا انداز یہ ہے کہ ''جمیل بھائی'' سامنے بیٹھے ہیں اور وہ انھیں مخاطب کر کے اپنی کتاب زندگی کے اوراق پلٹ رہی ہیں۔ واقعات کو سلسلہ وار بیان کرنے کا کوئی خاص اہتمام نہیں اور پھر بیچ بیچ میں وہ غیر متعلق باتیں بھی کرتی جاتی ہیں۔ ایسی باتوں کو وہ ''دائیں بائیں کی باتیں'' کہتی ہیں۔ یہ باتیں بھی اصل واقعات سے کچھ کم دلچسپ نہیں ہوتیں۔ یہی نہیں، ماضی کے واقعات بیان کرتے ہوئے اگر زمانہ حال سے تعلق رکھنے والی کوئی بات ذہن میں آ گئی تو وہ بھی زبان پر آ جاتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ گئے دنوں کے قصے سناتے ہوئے وہ اچانک ''جمیل بھائی'' کو ہلال امتیاز ملنے کی مبارک باد دیتی ہیں۔ یہ کتاب چونکہ بات چیت کے انداز میں لکھی گئی ہے، اس لیے اس میں وہ زبان محفوظ ہو گئی ہے جو آج سے ساٹھ ستر سال پہلے یوپی کے عام مسلمان گھرانوں میں بولی جاتی تھی۔ بہت سے لفظ اس کتاب میں ایسے نظر آتے ہیں جو لغات میں تو شاید مل جائیں، لیکن اب لوگوں کی زبانوں پر نہیں رہے۔

''ہم سفر'' جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ساتھ گزری ہوئی، نصف صدی سے زیادہ عرصے پر پھیلی ہوئی زندگی کی روداد ہے۔ ڈاکٹر صاحب خود اپنی داستان حیات ''گرد راہ'' کے نام سے لکھ چکے ہیں، مگر یہ داستان اس زمانے میں وجود میں آئی جب ان کی بینائی ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ خود لکھنے اور بول کر لکھوانے میں بڑا فرق ہے۔ اسی لیے بہت سے واقعات ''گرد راہ'' میں بیان ہونے سے رہ گئے اور بہت سے ڈاکٹر صاحب نے اس لیے بیان نہ کیے کہ کہیں خودستائی کا الزام نہ آ جائے۔ ''ہم سفر'' میں ''گرد راہ'' کی انھی دونوں کمیوں کو نہایت عمدگی سے پورا کیا گیا ہے۔

حمیدہ اختر نے شادی سے پہلے کے غائبانہ مراسم سے لے کر ڈاکٹر صاحب کے آخری سانس لینے تک کے واقعات اس طرح بیان کیے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی قد آدم تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ اس تصویر کے ساتھ بہت سی دوسری شخصیات کی چھوٹی بڑی بہت سی تصویریں ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ یہ وہ سب لوگ ہیں جو ڈاکٹر صاحب کے بہت قریب رہے، لیکن ان کی آپ بیتی میں ان کا ذکر یا تو بہت کم ہے یا بالکل نہیں۔ اس اعتبار سے یہ کتاب ''گرد راہ'' کا تکملہ ہی نہیں، اس پر اضافہ بھی ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تصویر کے بعد اس کتاب میں سب سے بڑی تصویر بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ہے، اور اس تصویر کا جو رخ حمیدہ اختر نے دکھایا ہے، وہ بالکل نیا بلکہ عجیب و

غریب ہے۔ ہم تو اس مولوی عبدالحق کو جانتے ہیں جو نوّے سال کی عمر میں بھی نوجوانوں جیسی توانائی کے ساتھ علمی و ادبی کام کرتے تھے۔ ان کی مستعدی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد ان سے ملنے کے لیے آئے، جب وہ رخصت ہوئے تو ان کے محافظوں نے سہارا دے کر انھیں گاڑی تک پہنچایا، انھیں الوداع کہنے کے لیے مولوی صاحب گاڑی تک ان کے ساتھ گئے، کچھ لوگوں نے انھیں بھی سہارا دینا چاہا تو انھوں نے یہ کہہ کر منع کر دیا: ''میں گورنر جنرل نہیں ہوں، ابھی سہارے کے بغیر چل سکتا ہوں۔''

''ہم سفر'' میں جو مولوی صاحب نظر آتے ہیں، وہ پڑھنے لکھنے والے کم اور کھلنڈرے زیادہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی شادی مولوی صاحب ہی کے ذریعے طے ہوئی تھی اور وہی برات لے کر علی گڑھ گئے تھے۔ برات میں ڈاکٹر محمد اشرف، سبط حسن اور مجاز بھی شامل تھے۔ جب علی گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر برات کا استقبال کیا گیا تو مولوی عبدالحق دوسرے براتیوں کے ساتھ یہ گا رہے تھے:

لائق دولہا لائیوں ہوں
ان پڑھ لڑکی لے لیں گے
بجنی لے لیں گے، بجنی لے لیں گے

مولوی عبدالحق اور گانا! یہ ویسی ہی بات ہے جیسے مشہور گلوکار مہدی حسن اُردو زبان کے آغاز و ارتقا پر کوئی تحقیقی مقالہ لکھ ڈالیں۔

اس کتاب میں مولوی عبدالحق کہیں بیڈمنٹن، تاش اور پچیسی کھیلتے نظر آتے ہیں اور کہیں بچوں جیسی معصوم شرارتیں کرتے ہوئے بچوں ہی کی طرح کھیل میں ہار جانے پر جیتنے والوں کو بے ایمانی کا الزام دیتے ہیں اور جب جیت جاتے ہیں تو خوشی سے شور مچانے لگتے ہیں۔

حمیدہ اختر کی پکچر گیلری میں مختلف طبقوں کے اہم افراد کی تصویریں آویزاں ہیں۔ سیاست دانوں میں قائداعظم، مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور سروجنی نائیڈو جیسے مشاہیر نظر آتے ہیں تو ادیبوں میں قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر محمد اشرف، ن م راشد، سعادت حسن منٹو اور سید سبط حسن جیسے نامور ادیبوں سے ہماری ملاقات ہوتی ہے۔ حمیدہ اختر نے ان میں سے ہر ایک کے بارے میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور بتائی ہے جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتی، مثلاً انھوں نے ایک لڑکے کا

قصہ سنایا ہے جس کا باپ متھرا کے پاس ایک گاؤں کا معمولی کاشت کار تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو ایک باحیثیت شخص کے ہاں ملازم رکھوا دیا جہاں اس کا کام حقہ بھرنا تھا۔ مالک کے بیٹے کو جب اس کے استاد پڑھاتے تھے تو وہ پاس کھڑا سنتا رہتا تھا اور سب کچھ ذہن نشین کر لیتا تھا۔ یہ شوق اتنا بڑھا کہ اس نے راتوں کو چھپ چھپ کر نصابی کتابوں کو اپنی کاپی میں نقل کرنا شروع کر دیا۔ یہی لڑکا آگے چل کر مشہور دانشور، مورخ اور سیاسی مفکر ڈاکٹر محمد اشرف کے نام سے مشہور ہوا۔

حمیدہ اختر نے شخصیات کے تذکرے میں خاصی صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ مولوی عبدالحق پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے انگریزی، اردو ڈکشنری کی تدوین میں ڈاکٹر رائے پوری کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ مولوی صاحب یہ نہیں چاہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب ان کا ساتھ چھوڑ کر پیرس جائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جب مولوی صاحب کی بات نہ مانی تو انھوں نے اس کا انتقام یوں لیا کہ ڈکشنری کے دیباچے میں جہاں بہت سوں کی خدمات کا اعتراف کیا، وہاں ڈاکٹر صاحب کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

سید سبط حسن اور ڈاکٹر رائے پوری پرانے اور گہرے دوست تھے۔ ایک زمانہ ایسا آیا کہ دونوں میں میل جول ختم ہو گیا۔ ایک مرتبہ سبط حسن ہاتھ لگ گئے تو حمیدہ اختر نے انھیں یوں کھری کھری سنائیں:

''تمھارے پاس اختر کے لیے صرف اعتراضات ہی کے الفاظ رہے، کس لیے؟ اس لیے نہ کہ انھوں نے زندگی بھر کبھی غیر ذمہ داری کا ثبوت نہ دیا۔ ان کے قلم نے کبھی بے سوچے سمجھے کسی کے کہنے پر کوئی بات نہ لکھی۔ کبھی کسی کی دکھائی بتائی ڈگر پر نہ چل سکے۔ تم کو جب بھی کسی ملازمت کی سفارش کی ضرورت ہوئی ...... تو انھوں نے بڑے پیار کے ساتھ یہ کام کر دیا۔ اختر نے جو اخلاقی ذمہ داری شادی کر کے اٹھائی، اس کو پورا کرنا ان کا اولین فرض تھا۔ تمھاری طرح نہیں کہ بے چاری بھابھی اور معصوم نوشابہ کو ایک کونے میں ڈال کر ایک عرصے تک بھولے رہے۔ ڈاکٹر اشرف نے بیوی بچوں کو دربدر کی ٹھوکریں کھلوائیں۔''

حمیدہ اختر نے ستر برس کی عمر کے بعد جو کتاب لکھی ہے، اسے ان ادیبوں کو ضرور پڑھنا چاہیے جو ویسے تو کم عمر ہیں، لیکن اپنی تحریروں سے سترے بہترے معلوم ہوتے ہیں۔

(۷ر دسمبر ۱۹۹۵ء)

شاعری یا گائیکی

منظر علی خاں منظر کو ہم بہترین شاعر اس لیے مانتے ہیں کہ وہ بہاری کباب نہایت عمدہ بناتے ہیں۔ اپنے بنائے ہوئے کباب کھلانے کے دوران جب وہ شعر سناتے ہیں تو انھیں کباب میں ہڈی والا محاورہ یاد آ جاتا ہے۔ اسی طرح احمد فراز کو بھی ہم دورِ حاضر کا سب سے بڑا شاعر اس لیے مانتے ہیں کہ وہ باتیں بہت عمدہ کرتے ہیں۔ ان کے شعر تو گویّوں کی زبان ہی سے اچھے لگتے ہیں، لیکن ان کی باتیں انھی کی زبانِ حقیقت ترجمان سے بھلی لگتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اخبارات کے ادبی صفحات پر اُن کے انٹرویو آئے دن چھپتے رہتے ہیں اور ہر انٹرویو میں دو چار نہیں، دس بیس باتیں ایسی ضرور ہوتی ہیں جن کی وجہ سے فراز کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے (اگر یہاں سہو کتابت سے "مقبولیت" کی جگہ "معقولیت" لکھا جائے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا، بلکہ خوشی ہوگی کہ ہم نہ سہی ہمارے کالم کے کمپوزر حسِ مزاح سے بہرہ ور ہیں)۔

آج کل فراز کے اس انٹرویو کا بہت شہرہ ہے جو پچھلے دنوں "جنگ" لندن میں اور پھر اسی اخبار کے لاہوری ایڈیشن میں شائع ہوا ہے۔ اس انٹرویو کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سوال کرنے والوں نے جواب دینے والے کے مزاج و مذاق کا پورا پورا خیال رکھا، یعنی کوئی سوال اور اُس کا جواب ایسا نہیں تھا، جس کے لیے طرفین کو ذہن پر زور دینے کی ضرورت ہوتی۔ ویسے بھی ذہن جیسی نازک چیز کو مشاعروں میں یا اخبارات کے ادبی صفحات پر کام میں نہیں لایا جاتا، کیونکہ ان دونوں مملکتوں میں دل کا سکہ چلتا ہے، بات دل سے نکل کر دل پر ہی اثر کرتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ دل کے معاملات کا ذہن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مسئول کے مزاج و مذاق کے مطابق سب سے عمدہ سوال جو کیا گیا، وہ یہ تھا..... "آپ ماشاء اللہ خوب مشاعرے لوٹتے ہیں اور آپ کو داد بھی بہت زیادہ ملتی ہے، داد دینے والوں میں سننے والے اور سننے والیاں بھی ہوتی ہیں تو ان دونوں میں سے آپ کو کون سی داد اچھی لگتی ہے؟" سوال کا اگر سلیس اُردو میں ترجمہ کیا جائے تو یوں ہوگا کہ آپ کو مردوں کی داد اچھی لگتی ہے یا خواتین کی؟ احمد فراز نے اس سوال کا جواب تفصیل سے دیا اور نہایت عمدگی سے ثابت کر دیا کہ جب وہ مشاعرے میں شعر سناتے ہیں تو انھیں اس کا خیال نہیں ہوتا کہ داد عورتوں کی طرف سے آ رہی ہے یا مردوں کی طرف سے۔ گویا دوسرے لفظوں میں موصوف کا خیال یہ ہے کہ لفظ "داد" چونکہ بذاتِ خود مؤنث ہے، اس لیے اس کا آ جانا ہی کافی ہے، آنے کی سمت کا تعین غیر ضروری ہے۔ اس سوال اور اس کے جواب سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے اہلِ ادب کیسے کیسے سنجیدہ اور فکر انگیز مسائل پر سوچنے کی نہ صرف صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ شرمائے بغیر اپنے خیالات کے اظہار پر بھی قادر ہیں۔

فراز سے ایک دلچسپ سوال یہ بھی کیا گیا کہ کیا یہ سچ ہے کہ عام شاعر تو گانے والوں کو پیسے دے کر اپنا کلام گواتے ہیں مگر آپ گانے والوں سے بھی رائلٹی وصول کرتے ہیں۔ فراز نے اقرار کیا کہ وہ ایسا کرتے ہیں کیونکہ گویّے ان کی غزلیں گا گا کر کروڑ پتی بن چکے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے یہ دلچسپ واقعہ بھی سنایا کہ ایک مرتبہ ایک گویّے نے ان سے کہا: "دیکھیں جی ہم آپ پر کتنا احسان کرتے ہیں۔ آپ تو سیدھے سادے لفظ لکھ دیتے ہیں، ہم ان میں نغمہ ڈالتے ہیں ہم انھیں سرخی پوڈر لگاتے ہیں اور سُر ڈالتے ہیں۔" یہ سن کر فراز کو غصہ آ گیا اور انھوں نے گویّے کو ترکی بترکی جواب دیا: "ہاں غالب کو آپ نے بنایا، میر کو آپ نے بنایا...... چھوڑیں یہ باتیں، آپ لوگ میری غزلوں کو بے سُرے طریقے سے گا کر تباہ کر دیتے ہیں...... چند ایک گلوکاروں کو چھوڑ کر باقی گلوکار تو ریں ریں کرتے ہیں، جس سے میری شاعری تباہ ہوتی ہے۔"

اس خالص ادبی گفتگو سے کئی اہم امور پر روشنی پڑتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ جس طرح گانے والے دنیا بھر سے خراج وصول کرتے ہیں لیکن بعض اخبارات کے کرائم رپورٹرز کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں اور اپنے حاصل کردہ خراج کا کچھ حصہ ان کے حوالے کر دیتے ہیں، اسی طرح گانے والے بھی اپنی ریں ریں سے حاصل کی ہوئی کمائی میں احمد فراز کو شریک کر لیتے ہیں۔ ایسی ہی افتاد غالب پر بھی پڑی تھی کہ اسے اپنی تنخواہ کا ایک تہائی ساہوکار کے حوالے کرنا

پڑتا تھا۔

فراز کے لفظوں کو سرخی پوڈر لگانے کا دعویٰ جس گویے نے کیا، فراز کی طرح ہم بھی اس کی دیدہ دلیری کی مذمت کرتے ہیں۔ جن گویوں کا شین قاف تک درست نہیں ہوتا، وہ بھلا فراز کے لفظوں کو سرخی پوڈر کیسے لگا سکتے ہیں۔ یہ کام تو فیض صاحب بہت پہلے انجام دے چکے ہیں۔ انھی کا لگایا ہوا سرخی پوڈر اب تک کام دے رہا ہے۔

فراز کا یہ خیال درست ہے کہ یہ ریں ریں کرنے والے گویے اگر آج فراز کو فراز بنانے کا دعویٰ کرتے ہیں تو کل وہ غالب کو غالب اور میر کو میر بنانے کا دعویٰ بھی ضرور کریں گے۔ اردو میں بھی تین بڑے شاعر ہیں۔ اگر یہ تینوں گویوں کے پروردہ ثابت ہو گئے تو اردو شاعری کے دامن میں کیا رہ جائے گا؟ شاید صرف ریں ریں کرنے والوں کی گائیکی ہی رہ جائے گی۔

اردو زبان کا ذکر آیا تو یہ بتا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ جیسی رائے فراز کی شاعری کے بارے میں مذکورہ بالا گویے نے دی، ویسی ہی رائے فراز کی اردو زبان کے بارے میں فرماتے ہیں: "اردو مکمل تو کیا، میچور زبان بھی نہیں ہے...... ابھی اردو زبان کو میچور ہونے کے لیے بہت وقت درکار ہے۔" ہمیں فراز کی اس رائے سے صد فیصد اتفاق ہے۔ جس زبان میں صرف نابالغوں کے لیے شاعری کی جاتی ہو، اس زبان کے میچور ہونے کا فی الحال تو کوئی امکان نہیں۔

استاد لاغر مراد آبادی کا خیال ہے کہ فراز کو چاہیے، اردو زبان کو اس کے حال پر چھوڑ دیں اور خود کو گویوں کے حال پر چھوڑتے ہوئے کسی میچور زبان مثلاً انگریزی یا پشتو کو کام میں لائیں۔ انگریزی میں شاعری کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ بین الاقوامی شہرت مل جائے گی۔ پشتو فراز کی مادری زبان ہے۔ مادری زبان کا حق غصب کر کے کسی ناپختہ زبان میں شعر کہنا سلامت روی کی دلیل نہیں ہے۔

ہمیں استادِ گرامی کے ان خیالات سے اتفاق نہیں ہے۔ اب تو انگریزی زبان میں شاعری کر کے خود انگریزوں کو بھی شہرت نہیں ملتی تو بے چارہ فراز اس زبان کے ذریعے شہرت کیا حاصل کرے گا۔ رہا پشتو میں شعر کہنے کا معاملہ تو یہ بھی فراز کے بس کی بات نہیں ہے۔ پشتو میں خوشحال خاں خٹک کی طرح مجاہدانہ اور رحمان بابا کی طرح صوفیانہ شاعری کی روایت رہی ہے۔ اس روایت کو کوئی ایسا شاعر نہیں نبھا سکتا جو بقول مولانا حسرت موہانی عاشقانہ و فاسقانہ شاعری

دلدادہ ہو۔

انٹرویو کے آخر میں ایک صاحب نے فراز سے کہا، "کاش آپ نے بے نظیر بھٹو کی ملازمت نہ کی ہوتی۔" فراز نے اس کا یہ جواب دیا، "میں نے بے نظیر کی نہیں پاکستان کی ملازمت کی ہے۔" جب یہ دیکھا کہ جواب ناکافی ہے تو فراز نے ان لفظوں میں عذرِ تقصیر پیش کیا، "جب مجھے ملازمت کی آفر ملی تو میں نے فیض صاحب سے پوچھا کہ ملازمت کر لوں تو انھوں نے کہا، بھائی یہ تو انفارمیشن منسٹری کی ملازمت ہے، اگر تمھیں سی آئی ڈی میں بھی ملازمت مل جائے تو کر لو کیونکہ ہمارا ایک آدمی وہاں بھی ہونا چاہیے۔"

فیض صاحب تو بے نظیر کے اقتدار میں آنے سے پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے، یہ فراز کی سعادت مندی کی انتہا ہے کہ فیض کے انتقال کے بعد بھی وہ ان سے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ فیض کی مردم شناسی بھی قابلِ داد ہے کہ انھوں نے فراز کو سی آئی ڈی کے محکمے میں ملازمت کا مشورہ دیا۔ فیض اگر زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے کہ آج ان کے بہت سے پسندیدہ آدمی بسلسلۂ روزگار اسی محکمے سے منسلک ہیں۔

بین الاقوامی غیرادبی کانفرنس

کیا زمانہ آ گیا ہے کہ لوگ اچھے کاموں میں بھی برائی کا پہلو نکال لیتے ہیں اور موجودہ حکومت کی تو ہر اچھائی کو تعصب کی عینک سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر برسراقتدار پارٹی سے تعلق رکھنے والے کسی شوہر کو گھوڑے پالنے اور ایئر کنڈیشنڈ اصطبل تعمیر کرنے کا شوق ہے اور بیوی ہارس ٹریڈنگ سے شغف رکھتی ہے تو اعتراض کیا جاتا ہے کہ لاکھوں کروڑوں کے اس شوق میں ملک کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ میاں بیوی کو اس کی داد دی جانی چاہیے کہ دونوں جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو کر ملک کی ہارس پاور میں اضافہ کر رہے ہیں۔

اسی طرح بعض لوگ اکادمی ادبیات کو بھی ایک ایئر کنڈیشنڈ اصطبل سمجھ کر اس کے خلاف زبان درازی کرتے رہتے ہیں اور الزام لگاتے ہیں کہ اکادمی ادب سے بے بہرہ جیالوں کی آخری پناہ گاہ بن چکی ہے۔ معترضین یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہاں تو ادیبوں کو بھی ادب سے کوئی تعلق نہیں رہا تو کسی ادارے کے بے ادب ہو جانے پر تشویش کا اظہار کیوں کیا جائے۔

پچھلے دنوں اسلام آباد میں اکادمی کی طرف سے ادیبوں کی بین الاقوامی کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں جو کچھ سننے میں آیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ کانفرنس بین الاقوامی تو ضرور تھی، لیکن اس کا ادب یا ادیبوں سے اتنا بھی تعلق نہیں تھا جتنا موجودہ حکومت کا سیاسی و معاشی استحکام سے ہے۔ غیر ملکوں سے جو "ادیب" آئے تھے، ان میں خاصی تعداد پاکستانیوں کی تھی، وہ وہ لوگ تھے جنھیں ذاتی تعلقات کی وجہ سے بلایا گیا تھا۔ "الٹے بانس بریلی کو" ایسے ہی موقعوں پر بولتے ہیں۔ اگر غیر ملکوں سے ساقی فاروقی جیسے نامور ادیبوں کو بلایا جاتا تو کوئی بات بھی تھی،

مجہول الاحوال پاکستانیوں کو بلانا تھا تو پاکستان میں یہ جنس کون سی نایاب تھی، پیپلز پارٹی کے مقامی کارکن نہایت عمدگی سے یہ ضرورت پوری کر سکتے تھے۔ اس کا کم از کم یہ فائدہ تو ہوتا کہ ہوائی جہاز کے کرایوں پر جو لاکھوں روپے کا زرمبادلہ ضائع ہوا، وہ کسی دوسری مد میں ذرا سلیقے سے ضائع کیا جا سکتا تھا۔

باہر سے آنے والوں میں جو واقعی غیر ملکی تھے، ان میں سوائے رسول حمزہ جیسے دو چار ادیبوں کے باقی سب اسکولوں کالجوں کے جغرافیہ اور تاریخ کے استاد تھے، مترجم تھے یا پھر وہ لوگ تھے جنھیں بذریعہ قرعہ اندازی مدعو کیا گیا تھا۔ ان لوگوں کو کانفرنس میں بطور مشاہیر متعارف کرایا گیا حالانکہ یہ لوگ وہ ہیں جنھیں خود ان کے ملکوں میں بھی کوئی نہیں جانتا۔ کانفرنس سے پہلے اکادمی کے چیئرمین کی طرف سے بہت زور شور سے اعلان کیا گیا تھا کہ کئی نوبل انعام یافتہ ادیب کانفرنس میں شرکت کریں گے لیکن ایسا کوئی ادیب کانفرنس میں شریک نہیں ہوا۔

اس قسم کے اور بھی اعتراضات سننے میں آئے ہیں جن کا ذکر بعد میں ہوگا، پہلے ہم مذکورہ اعتراضات کو بدلائل غلط ثابت کریں گے، لیکن اس سے بھی پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہم یہ کام محض خلقِ خدا کے فائدے کے لیے انجام دے رہے ہیں، اکادمی نے ہمیں اس پر مامور نہیں کیا۔ ہاں اگر یہ کالم اکادمی کے اربابِ اختیار کی نظر سے گزرے اور ہماری یہ کاوش انھیں پسند آئے تو ہم یہ چاہیں گے کہ وہ ایک درجن علمی، ادبی اور ثقافتی ادارے جو اکادمی کے چیئرمین کی نگرانی میں چل رہے ہیں یا چلنے کو تیار بیٹھے ہیں، ان میں سے کسی ایک میں استاد لاغر مرادآبادی کو بھی خدمت کا موقع دیا جائے کہ موصوف مزاحمتی شاعری کر کر کے بیروزگار ہی نہیں ازکار رفتہ بھی ہو چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قائداعظم کے دو مزار ہیں جو آمنے سامنے واقع ہیں۔ دوسرے مزار کا نام قائداعظم اکیڈمی ہے۔ اگر اکیڈمی میں جگہ نہ ہو تو اصلی مزار کی صفائی ستھرائی کے شعبے ہی میں کوئی جگہ مل جائے تو استادِ گرامی بخوشی قبول کر لیں گے۔ استاد کا مقصد خدمت کرنا ہے اور اس کی کوئی بھی صورت ان کے لیے قابلِ قبول ہوگی۔ کسی مزار کی صفائی ہو یا کسی ادارے کا صفایا، وہ ہر کام یکساں مہارت کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، اب ہم اکادمی کے ناقدوں کے اعتراضات کو سلسلہ وار رد کرتے ہیں۔

سب سے پہلا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ ادیبوں کی بین الاقوامی کانفرنس میں غیر ملکوں سے

جونفری آئی۔ ان میں خاصی تعداد پاکستانیوں کی تھی جو کسی طرح بھی ان ملکوں کی نمائندگی نہیں کرتے جن سے وہ آئے تھے۔ نیز وہ ادیب نہیں تھے، محض ذاتی تعلقات کی بنا پر انھیں مدعو کیا گیا تھا۔ اگر یہ سب باتیں درست بھی ہوں تو معترضین کا انداز فکر حب الوطنی کے جذبات کے منافی ہے۔ غیر ملکوں میں ہمارے بہت سے ہم وطن محنت مزدوری کرتے ہیں اور ان کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ وہ آمد و رفت کے مصارف برداشت کر کے اپنے وطن آ کر اپنے اعزہ و اقارب سے مل سکیں۔ اکادمی ادبیات مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے متعدد پاکستانیوں کو ادیبوں کے روپ یا بہروپ میں اکادمی کے خرچ پر کانفرنس میں مدعو کر کے انھیں یہ موقع دیا کہ کچھ دن وہ اپنے پیارے وطن میں گزاریں اور اپنے پیاروں سے ملاقاتیں کریں۔ ادبی نقطۂ نظر سے یہ طریق کار غلط ہو سکتا ہے مگر انسانی نقطۂ نظر سے درست ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ادب کے مقابلے پر انسانیت کا درجہ بلند ہے۔ اس معاملے کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ جن غیر ادیب پاکستانیوں نے کانفرنس میں شرکت کی، ان میں تھوڑا بہت ادب کا ذوق ضرور پیدا ہوا ہوگا۔ ممکن ہے ان میں سے بعض آگے چل کر ادیب بن جائیں۔ اس دل خوش کن صورت حال کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ اکادمی کی نظر صرف ادب کے حال پر نہیں، مستقبل پر بھی ہے۔ گویا اس کانفرنس کے ذریعے مستقبل کے مزاحمتی ادیبوں کی پیدائش کے لیے راہ ہموار کی گئی ہے۔

غیر ملکی مندوبین کے حوالے سے یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ان میں ادیب برائے نام تھے، باقی سب اسکولوں کالجوں کے تاریخ و جغرافیہ اور دیگر علوم کے اساتذہ تھے، مترجم تھے یا پھر ارباب اختیار کے وہ منظور نظر افراد تھے جنھیں پاکستان کی سیر کرا کے ممنون احسان کرنا تھا۔ ہمیں ان باتوں میں کوئی بات قابل اعتراض نظر نہیں آتی۔ ادب کا تاریخ اور جغرافیے سے بہت گہرا تعلق ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ تاریخ اور جغرافیے کے بغیر ادب وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ عالمی ادب کے بیشتر شاہکار تاریخ اور جغرافیے سے استفادہ کر کے لکھے گئے ہیں اور بعد میں خود ان دونوں کا ماخذ بن گئے۔ اس بات کو ہم ایک مثال سے واضح کریں گے۔ آج سے پانچ یا دس ہزار سال بعد عبدالعزیز خالد کی شاعری سے یہ ثابت کیا جا سکے گا کہ پاکستان میں عربی عام بول چال کی زبان تھی اور یہ ملک جزیرہ نمائے عرب کا حصہ تھا۔

بلاشبہ کانفرنس میں مترجمین خاصی تعداد میں مدعو کیے گئے تھے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کا ادب ترجموں ہی کے ذریعے دوسری زبانوں کے بولنے والوں تک پہنچتا ہے۔ اگر مترجمین نہ ہوں تو دنیا کا کوئی فرد دوسری زبانوں کے ادب سے مستفید نہیں ہو سکتا۔ مترجمین ادیب نہ سہی، ادیبوں کے محسن ضرور ہوتے ہیں۔ وہ جب کسی ادب پارے کا ترجمہ کرتے ہیں تو نہ صرف اس کی خامیوں کو دور کر دیتے ہیں بلکہ بہت سی خوبیاں اپنی گرہ سے بھی ڈال دیتے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو ساقی فاروقی، افتخار عارف اور کشور ناہید کی شاعری کے انگریزی تراجم دیکھ لیے جائیں۔ ان تراجم کو جب ہم پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تخلیقی قوت کا ایک دریا ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ یہ تراجم پڑھنے کے بعد اصل اردو کلام پڑھا جائے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ دریا غالب کے دریائے معاصی کی طرح تنک آبی سے خشک ہو چکا ہے اور مذکورہ تینوں شعرائے کرام دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے اپنی تردامنی کو دریا کا نعم البدل سمجھ رہے ہیں۔

کانفرنس میں مترجمین کی کثیر تعداد میں موجودگی سے یہ فائدہ ہوا کہ پاکستانی ادیبوں کو ان سے براہ راست ملاقات کا موقع ملا اور انھوں نے اپنی تصانیف اس گزارش کے ساتھ مترجمین کی خدمت میں پیش کیں کہ انھیں غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ اس طرح وہ کتابیں جنھیں ان کی اصل زبان میں کوئی نہیں پڑھتا، جب دوسری زبانوں میں منتقل ہوں گی تو انھیں پڑھنے والوں کا ایک بہت بڑا حلقہ مل جائے گا۔

معترضین کی یہ بات درست ہے کہ کانفرنس کے انعقاد سے پہلے بہت زور شور سے کہا جا رہا تھا کہ کانفرنس میں ایک درجن سے زیادہ نوبل انعام یافتہ ادیب شرکت کریں گے۔ یہ اگر نہیں آئے تو اس میں اکادمی یا اس کے چیئرمین کا کوئی قصور نہیں۔ اکادمی نے جن نوبل انعام یافتہ ادیبوں کو مدعو کیا تھا، انھوں نے انتہائی بداخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دعوت نامے کا جواب تک نہیں دیا۔ ایسے بداخلاق ادیبوں کا اخلاق درست کرنے کے لیے پاکستان کے وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر سے کہا جا سکتا تھا کہ انھیں گرفتار کر کے لے آئیں لیکن افسوس کہ وزیر موصوف کو پاکستان سے باہر مقیم لوگوں کو گرفتار کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ انٹرپول سے رابطہ کر کے مطلوبہ ادیبوں کو پاکستان لانے کی تجویز پر بھی عمل ہو سکتا تھا مگر اس کارروائی میں خاصا وقت صرف ہوتا اور اس طرح کانفرنس کے انعقاد میں تاخیر کا امکان تھا، اس لیے اس جہت میں کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کانفرنس میں نوبل انعام یافتہ ادیب نہیں آئے۔

لوگوں کے خیال کے مطابق وزیر اعظم کو اپنی افتتاحی تقریر میں ادب میں ابہام یا تجریدیت پر یا نثری نظم اور علامتی افسانے کی افادیت پر یا ساختیاتی تنقید کے ارتقا پر اظہارِ خیال کرنا چاہیے تھا۔ اس قسم کے پیش پا افتادہ مسائل پر گفتگو کرنا قمر جمیل اور انیس ناگی جیسے زعمائے ادب کا کام ہے۔ وزیر اعظم کے منصب کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ انھوں جو کچھ فرمایا وہ اسی منصب کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔

ہمیں تو وزیر اعظم کی تقریر میں کوئی ایسا نکتہ نظر نہیں آیا جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ یہ موقع محل کی مناسبت سے نہیں تھا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ معترضین کو معلوم ہونا چاہیے، جب سے اکادمی ادبیات جیالوں کے حبالۂ تصرف میں آیا ہے، ادب سے مراد وہ ادب نہیں رہا جو ہمیں حافظ و سعدی اور غالب و اقبال کی تصانیف میں ملتا ہے۔ اب ادب کی بجائے مزاحمتی ادب کا چلن ہے اور مزاحمتی ادب ایسی تحریروں کو کہتے ہیں جو ادب تو کیا صحافت کے معیار پر بھی پوری نہیں اترتیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وزیر اعظم کی تقریر مزاحمتی ادب کا شاہکار تھی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس میں سابق صدر مرحوم ضیاء الحق کا ذکر ہے اور اس ذکر کے بغیر مزاحمتی ادب لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ ضیاء الحق زندہ تھا تو اس کی آمریت راتوں کی نیند اڑا دیتی تھی، مرنے کے بعد مرحوم نے جیالوں کے خوابوں میں آ کر انھیں ڈرانے کا شغل اختیار کر رکھا ہے، موجودہ دور اسی خواب آلود مزاحمتی ادب کا دور ہے۔ وزیر اعظم کی تقریر بھی اسی خواب آور فضا کی عکاسی کرتی ہے۔

یہ اعتراض بھی معترضین کی کج فہمی کا نتیجہ ہے کہ وزیر اعظم کو غیر ملکی سیاحوں کے اجتماع میں اپنے گھریلو حالات یعنی فوجیوں کی ناکام بغاوت اور مولویوں اور دینی جماعتوں کی غیر جمہوری حرکتوں کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کاش معترضین کو معلوم ہوتا کہ اب دنیا اس حد تک سکڑ چکی ہے کہ کسی بھی ملک کے اندرونی معاملات صرف اسی ملک کے لیے وجہ تشویش نہیں ہوتے، بلکہ دنیا کے تمام ممالک اس تشویش میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اگر امریکہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ نواز شریف پر بغاوت کا مقدمہ چلانے پر اعتراض کرے اور حکومتِ پاکستان اور ایم کیو ایم کی محاذ آرائی میں دخل دے تو ہماری حکومت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ پانچ سو سے زیادہ غیر ملکی سیاحوں کو پاکستان کے اندرونی معاملات پر غور و فکر کی دعوت دے۔ غیر ملکیوں میں چونکہ ادیب بھی شامل

کانفرنس میں رائٹرز گلڈ کے انعام یافتہ ادیب درجنوں کی تعداد میں موجود تھے جن کی وجہ سے نوبل انعام یافتہ ادیبوں کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ رائٹرز گلڈ تو مارشل لاء کی پیداوار تھا، اس کی طرف سے دیے گئے انعامات کو اہمیت دینا درست نہیں۔ ایسے لوگوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ کانفرنس میں گلڈ کے انعام یافتہ انھی ادیبوں کو مدعو کیا گیا تھا جنھیں ذوالفقار علی بھٹو کے عوامی مارشل لاء کے دور میں انعامات ملے تھے۔

(۲۱ر دسمبر ۱۹۹۸ء)

(۲)

جن لوگوں کو اسلام آباد کی بین الاقوامی ادبی کانفرنس کے غیر ادبی ہونے پر اصرار [illegible] یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس کے افتتاحی اجلاس میں وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے جو تقریر [illegible] ادب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انھوں نے پاکستانی فوج میں ایک حالیہ ناکام بغاوت کے حوالے [illegible] فوجی انقلاب لانے والے گرفتار شدگان کے بارے میں یہ کہا کہ وہ پاکستان کو ایک فرقہ [illegible] ریاست بنانا اور اسے خانہ جنگی میں دھکیلنا چاہتے تھے۔ صدرِ پاکستان، وزیر اعظم اور ان [illegible] خاندان کے ساتھ ساتھ چیف آف دی آرمی سٹاف اور مسلح افواج کی اعلیٰ قیادت کو بھی قتل [illegible] ارادہ رکھتے تھے۔ وزیر اعظم نے اس سلسلے میں مولویوں، دینی جماعتوں اور مرحوم صدر ضیاء [illegible] بھی کھری کھری سنائیں۔

معترضین کہتے ہیں کہ ایک ایسی بین الاقوامی کانفرنس میں، جو ادب کے نام پر [illegible] تھی اور جس میں پانچ سو کے قریب غیر ملکی بھی موجود تھے، ایسی باتیں کہنے کا کوئی جواز [illegible] تعلق پاکستان کے اندرونی معاملات سے ہے۔ غیر ملکی ادیبوں یا سیاحوں کو ہماری [illegible] بغاوت، مولویوں سے یا ضیاء الحق سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وزیر اعظم کی تقریر [illegible] ہے کہ یہ بین الاقوامی کانفرنس صد فیصد سیاسی تھی اور سیاسی مقاصد ہی کے تحت منعقد کی گئی [illegible]

ہمیں معترضین کی سادگی پر رحم بھی آتا ہے اور ہنسی بھی۔ رحم اس لیے کہ [illegible] ہیں نہ سیاست کو اور ہنسی اس پر کہ وہ ادب اور سیاست کو سمجھنے کا دعویٰ بھی [illegible]

ہیں، اس لیے اس دعوت کے نتائج ادب کے حق میں نہایت مفید ہوں گے۔ اگر چار پانچ غیر ملکی ادیبوں نے بھی وزیر اعظم کی تقریر سے متاثر ہو کر رزمیہ نظمیں یا ڈرامے لکھ دیے تو عالمی مزاحمتی ادب خاصا باثروت ہو جائے گا۔ دنیائے ادب میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہوگا کہ کسی وزیر اعظم کی تقریر سے متاثر ہو کر ادبی شاہکار تصنیف کیے جائیں گے۔ اس طرح ہمارے فوجیوں، مولویوں اور ضیاء الحق کے حواریوں کے کارنامے عالمی ادب کا حصہ بن جائیں گے۔ اہل نظر کو یقین ہے کہ وزیر اعظم کی تقریر عالمی ادب کی تاریخ میں چراغِ راہ ثابت ہوگی اور اس چراغ تلے اکادمی ادبیات پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ سرگرم عمل رہے گی۔

کچھ لوگ سوال کر سکتے ہیں کہ وزیر اعظم کی تقریر سے استفادہ کر کے صرف رزمیہ نظمیں اور ڈرامے ہی کیوں لکھے جائیں، دوسری اصناف ادب میں طبع آزمائی کیوں نہیں کی جا سکتی۔ یہ سوال نہایت مضحکہ خیز ہے۔ بڑے موضوعات کے لیے ضروری ہے کہ اصناف ادب ایسی ہوں جو ان موضوعات کا حق ادا کر سکیں۔ شاہنامۂ فردوسی غزل یا رباعی میں سما سکتا تو اس کے لیے مثنوی کا انتخاب کیوں کیا جاتا۔ ڈراما ”انارکلی“ اگر مثنوی کی صورت میں لکھا جاتا تو پہلے سین ہی میں مصنف کا قافیہ تنگ ہو جاتا۔ اسی طرح وزیر اعظم کی تقریر میں رجعت پسند مذہبی قوتوں کے خلاف جو اعلانِ جنگ کیا گیا ہے، اس کو ادبی سطح پر پیش کرنے کے لیے رزمیہ نظموں کے سوا کوئی دوسری صنفِ ادب موزوں نہیں ہو سکتی۔ وزیر اعظم کی تقریر میں فوجی سازشوں کے حوالے سے جو سنسنی خیز عنصر ملتا ہے، اس کی بنیاد پر ڈراما ہی لکھا جا سکتا ہے، دوہے نہیں لکھے جا سکتے۔

مشہور کالم نگار عطاء الحق قاسمی کا خیال ہے کہ اس کانفرنس سے پاکستان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ وہ لکھتے ہیں:

”اگر کسی کو کوئی فائدہ پہنچا تو وہ وزیر اعظم صاحب کو پہنچا ہوگا جنھوں نے دنیا بھر کے دانشوروں کو اپنی تقریر کے ذریعے اپنا وہ امیج دینے کی کوشش کی جو امیج وہ بیرونی دنیا کو دینا چاہتی ہیں اور یا پھر برادرم فخر زماں کو فائدہ پہنچا جو اس بین الاقوامی کانفرنس سے خود بھی بین الاقوامی ادیب ہو گئے ہیں۔ اس کانفرنس سے وزیر اعظم اور فخر زماں کے علاوہ پاکستان کو بھی فائدہ پہنچ سکتا تھا اگر پاکستان کو فائدہ پہنچانا پارٹی پالیسی کے منافی نہ ہوتا۔“

ہم عطاء الحق قاسمی کے بے حد مداح ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اگر کوئی غلط بات

کہیں تو ہم اس کی تردید نہ کریں۔ غلط بات یہ ہے کہ انھوں نے فرض کر لیا کہ افراد کا فائدہ ملک کا فائدہ نہیں ہے۔ جبکہ صحیح صورت حال یہ ہے کہ فائدہ پہلے افراد ہی کو پہنچتا ہے جو بالواسطہ قوم کا فائدہ ہوتا ہے۔ قوم کا فائدہ ملک کا فائدہ ہے کہ قوم اور ملک ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ لہٰذا کانفرنس سے اگر صرف دو آدمیوں کو بھی فائدہ پہنچا ہے تو دراصل یہ ملک ہی کا فائدہ ہے۔ قاسمی صاحب کا یہ اندازہ بھی درست نہیں کہ کانفرنس سے صرف دو آدمیوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ ہماری اطلاع کے مطابق ایسے افراد کی تعداد تین ہے۔ تیسرا وہ ٹھیکے دار ہے جسے مندوبین کے قیام و طعام کا ٹھیکہ دیا گیا تھا۔

قاسمی صاحب کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ اس کانفرنس کی وجہ سے صرف فخر زماں بین الاقوامی ادیب بنے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس نے اس کانفرنس میں شرکت کی اپنے آپ کو بین الاقوامی ادیب سمجھنے لگا ہے اور اس میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنھیں لکھنے کا تو کیا، دوسرے کے لکھے کو پڑھنے کا بھی تجربہ نہیں ہے۔ اکادمی ادبیات کا موجودہ عہد جیالیت (یہ لفظ ”جیالا“ سے بنایا گیا ہے) اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ جو لوگ مقامی سطح پر بھی ادیب نہ بن سکے، انھیں بین الاقوامی سطح کا ادیب بنا دیا گیا۔

عطاء الحق قاسمی نے اپنے کالم میں فخر زماں کو مخاطب کر کے لکھا ہے، ”پاکستان نہ بنتا تو آپ کسی پرائمری اسکول میں ماسٹر ہوتے اور میں وہاں تالی وغیرہ بجانے پر مامور ہوتا۔“ ہم اس بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے، البتہ یہ ضرور عرض کریں گے کہ پرائمری اسکول میں پڑھانا اور تالی بجانا دونوں بہت مشکل کام ہیں اور ہر کس و ناکس انھیں انجام نہیں دے سکتا۔

تالی بجانے پر یاد آیا کہ بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کرنے والے کراچی کے ادیب جب واپس آئے تو اتفاق سے ان میں سے بعض سے کراچی ایئر پورٹ پر ہماری ملاقات ہو گئی۔ یہ بین الاقوامی ادیب ایسے خستہ حال اور درماندہ بلکہ پس ماندہ نظر آ رہے تھے جیسے انھوں نے اسلام آباد سے کراچی تک سفر پاپیادہ طے کیا ہو۔ ہم نے ایک دوست سے کہا: ”نصیبِ دشمناں، یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ آپ کانفرنس سے شرکت کر کے آ رہے ہیں یا محنت مزدوری کر کے۔“ موصوف نے نہایت مضمحل لہجے میں کہا: ”گئے تو تھے ہم کانفرنس میں شرکت کے لیے مگر وہاں ہمیں محنت مزدوری ہی کرنی پڑی۔“ ہم نے اس کی تفصیل پوچھی تو انھوں نے جواب دیا: ”اکادمی کے

ارباب اختیار نے ہمیں تالیاں بجانے کے کام پر لگا رکھا تھا۔ کانفرنس کے چاروں دن صبح سے شام تک ہم سے یہی کام لیا گیا۔" ہم نے پوچھا: "کیا کراچی والوں میں سے کسی سے کوئی مقالہ نہیں پڑھوایا گیا؟" کہنے لگے: "مقالہ پڑھوانا تو بڑی بات ہے، ہمیں تو کانفرنس کی کسی کارروائی میں بھی شریک نہیں کیا گیا۔" ہم نے عرض کیا: "تالیاں بجانا تو کارروائی کا حصہ تھا۔" وہ خاموش رہے۔ ہم نے ان کی دلجوئی کے خیال سے کہا: "ویسے آپ لوگوں کی آؤ بھگت تو خوب ہوئی ہوگی؟" فرمایا: "آؤ بھگت کا اس سے اندازہ کر لیجیے کہ ہم اسلام آباد کے ائیر پورٹ پر تین گھنٹے سردی میں کانپتے رہے اور کوئی پرسان حال نہ ہوا۔ بعد از خرابی بسیار ایک صاحب آئے جنھیں ہمارے قیام و طعام کا ٹھیکہ دیا گیا تھا۔ انھوں نے ہماری حاضری لی، بالکل اسی طرح جس طرح جیل میں قیدیوں کی حاضری لی جاتی ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ ہوا کہ وہ کانفرنس کرتے رہے اور ہم تالیاں بجاتے رہے۔"

(۲۸ دسمبر ۱۹۹۵ء)

ساقی فاروقی کا معاصرین کے خلاف اعلانِ جنگ

اس باب میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ ساقی فاروقی موجودہ دور کے اہم ترین شاعروں میں سے ہیں۔ ہاں دو سے زائد رائیں ہو سکتی ہیں کہ ساقی کو اہم شاعر نہ ماننے والے بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ ساقی کو اہم شاعر ماننے والوں میں سر فہرست تین عدد ہیں: ہم، شمس الرحمٰن فاروقی اور خود ساقی فاروقی۔ ہم ساقی کے اس لیے مداح ہیں کہ ہمارا شاعری کا مطالعہ بے حد محدود ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اس لیے کہ ان کا مطالعہ بے حد وسیع ہے۔ ایک کے محدود اور دوسرے کے وسیع مطالعے کا یکساں نتیجہ اس لیے برآمد ہوا کہ ہم دونوں سخن فہم ہونے کے باوجود طرف دار ہیں اور ساقی کی شاعری کے بارے میں ایسی رائے نہیں رکھ سکتے جو خود ساقی کی رائے سے مختلف ہو۔ خود ساقی اپنے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، اس کا اندازہ ان کی شاعری سے نہیں نثر سے ہوتا ہے۔ ساقی اپنے مضامین نثر میں اپنے ہم عصر شاعروں کے کمالات کی نفی ایسی عمدگی سے کرتے ہیں کہ موجودہ دور میں صرف ایک ہی باکمال شاعر ابھر کر سامنے آتا ہے اور وہ خود ساقی فاروقی ہے۔

ساقی کا نثری مجموعہ چند سال پہلے "بازگشت و بازیافت" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اب یہی مجموعہ چند مضامین کے اضافے کے ساتھ "ہدایت نامۂ شاعر" کے نام سے چھپا ہے۔ نام کی تبدیلی سے ہمیں کویراج ہرنام داس بی اے کی دو مشہور کتابیں، "ہدایت نامۂ خاوند" اور "ہدایت نامۂ بیوی" یاد آ گئیں جو ساٹھ ستر سال پہلے بار بار شائع ہوتی اور خوب بکتی تھیں۔ کویراج ہرنام داس کا مقصد عام معاشرے کو صحت مند بنانا تھا۔ ساقی ادبی معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ اس اعتبار سے اگر ساقی کو ادب کا کویراج ہرنام داس کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ساقی کے نثری مجموعے میں تنقیدی مضامین، شخصی خاکے، کتابوں پر تبصرے اور ادبی خطوط وغیرہ شامل ہیں جو سب کے سب شاعری اور شاعروں کے بارے میں ہیں۔ یہ سب تحریریں کسی نہ

کسی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہیں۔ بعض مضامین میں ساقی نے تنقید کا اعلیٰ معیار پیش کیا ہے اور بعض میں تنقیص کا۔ یوں تو ساقی کے تمام مضامین ایسے ہیں کہ انھیں بار بار پڑھا جائے لیکن تین مضمون ایسے ہیں جنھیں اُردو ادب کا کوئی قاری نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ان میں سے ایک ''نظم کا سفر'' ہے جس میں فیض، راشد اور میراجی کی شاعری پر بصیرت افروز گفتگو کی گئی ہے اور باقی دو شخصی خاکے ہیں جن میں فیض اور راشد کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اگر ساقی کی تمام ادبی کاوشیں خدانخواستہ ضائع ہو جائیں اور صرف یہ تین مضمون بچ جائیں تو جب بھی اُردو ادب کی تاریخ میں ساقی کا نام زندہ رہے گا۔ ممکن ہے یہاں بعض لوگ یہ پوچھیں کہ جب صرف تین مضامین کی وجہ سے ساقی کا نام زندہ رہ سکتا ہے تو انھوں نے باقی مضامین کیوں لکھے اور اتنی ڈھیر ساری شاعری کیوں کی۔ اس دخل در معقولات کے جواب میں عرض ہے کہ ساقی نے اتنا بہت سا اس لیے لکھا ہے کہ اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ مذکورہ تینوں مضامین ضائع ہو جائیں تو باقی ماندہ ادبی اثاثے کی وجہ سے ساقی کے ادبی مقام کا تعین کیا جا سکے۔ یہ کام اگرچہ بہت مشکل ہے مگر ہماری دعاؤں اور نیک تمناؤں کے سائے میں شمس الرحمٰن فاروقی جس طرح ڈاکٹر انور سجاد کو اُردو افسانے کا معمارِ اعظم ثابت کر چکے ہیں، اسی طرح وہ ساقی کو بھی کسی نہ کسی ادبی صنف کا معمارِ اعظم ثابت کر دکھائیں گے۔

مذکورہ تین مضامین سے قطع نظر، باقی مضامین پڑھ کر ہمیں علامہ اقبال یاد آ گئے جنھوں نے ''ضربِ کلیم'' کے سرورق پر جلی حروف میں لکھا ہے، ''اعلانِ جنگ، دورِ حاضر کے خلاف''۔ ساقی نے بھی اپنے متعدد معاصر شعراء کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے۔ ساقی اپنے کسی ہم عصر کے بارے میں کلمۂ خیر کہنا جانتے ہی نہیں، اور اگر کبھی بادلِ ناخواستہ کسی کے بارے میں کلمۂ خیر کہہ بھی دیتے ہیں تو اس کے اثر کو جلد ہی دو چار کلماتِ شر سے زائل کر دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساقی نے اپنے معاصرین سے نبرد آزمائی کا فن یگانہ سے سیکھا ہے۔ وہی یگانہ جو اپنا تعارف یوں کراتے ہیں:

یگانہ کون؟ وہ بزمِ ادب سے بیگانہ
لڑائی چھیڑ کے پگڑی اتارنے والے

دوسرا مصرع ساقی کے بھی حسبِ حال ہے۔ یگانہ اور ساقی میں فرق یہ ہے کہ یگانہ دوسروں کی پگڑیاں اتار کر اپنے سر باندھ لیتے تھے۔ ساقی ان پگڑیوں کو مضامین کی صورت میں شائع کر دیتے ہیں۔

یگانہ اور ساقی میں ایک فرق اور بھی ہے۔ ساقی اپنی تعریف اپنی زبان سے نہیں کرتے بلکہ ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ لوگ خوف زدہ ہو کر ان کی تعریف کرنے لگتے ہیں۔ اس کے برعکس یگانہ میں اتنی اخلاقی جرأت تھی کہ وہ اپنی شاعری کی تعریف میں اس قسم کا لہجہ اختیار کرنے میں بھی شرم محسوس نہیں کرتے۔

چھٹ بھیّوں میں ڈھونڈتے کیا ہو میرے بانکے شعر کی بات
شیر کا پنجہ، کتے کا دھکا، مینڈھے کی چوٹ، گدھے کی لات

شیر تو خیر شیر ہے اور مینڈھا بھی ٹھیک ہے، لیکن اپنی شاعری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کتے اور گدھے سے ان کی خصوصیات مستعار لینا بڑے حوصلے کی بات ہے۔

جانوروں سے ساقی کو بھی خاصی دلچسپی ہے۔ ان پر کئی معرکے کی نظمیں لکھی ہیں۔ ساقی کے پاس اخفش کی بکری جیسا ایک سخن فہم کتا ہے جسے وہ اپنی ہر نظم اور غزل سب سے پہلے سناتے ہیں اور داد حاصل کرتے ہیں۔ ساقی نے کچھوے کا ایک بچہ بھی پال رکھا ہے۔ اس کے متعلق انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے، ''جب اس سے گفتگو کرتا ہوں تو اس کی زندہ اور دوررس آنکھوں میں ایک عجب تحیر ابھرتی ہے...... یہ کائنات کیا خوبصورت جگہ ہے مگر افسوس کہ یہاں انسان بہت ہیں۔'' کچھوے کے بچے نے آنکھیں کھولنے کے بعد ساقی ہی کو دیکھا۔ اس کا انسانوں سے مایوس ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خاصا مردم شناس ہے۔

یگانہ نے اپنے معاصرین جگر مراد آبادی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، یہاں تک کہ علامہ اقبال کے بھی خلاف بہت کچھ لکھا ہے، مثلاً اصغر گونڈوی کو وہ ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

شعر کہنے لگا ہے کالا بھوت
رنگ لایا ہے کیا نرالا بھوت
گھی کے جلنے لگے خیشوں میں
کس اندھیرے کا ہے اجالا بھوت
انھیں ابتوں کی ہے یہ بلہاری

پہچان سکتا تھا کیا اُجالا بھوت
صورت و سیرت ایک ہی واللہ
کس نے سانچے میں ایسا ڈھالا بھوت

یگانہ کی طرح ساقی بھی معاصرین کے ساتھ کسی قسم کی رعایت برتنے کے قائل نہیں ہیں۔ زیر نظر کتاب کے پہلے ہی مضمون کے دوسرے پیراگراف میں اکٹھے پانچ معاصرین کا حساب کتاب برابر کر دیا ہے۔ اس پیراگراف کا کچھ حصہ یہ ہے:

''میں نے لندن کے ایک گمنام شاعر مسٹر بخش لائلپوری کے بے حد اصرار پر...... ان کا فلیپ لکھ دیا۔ وہ بھی اس لیے کہ میں نے اس قدر انکار کیا تھا کہ انکار سے بھی شرمندگی ہونے لگی تھی۔ اس عزیز نے کمال حوصلہ مندی سے اپنی کتاب میں میری تحریر شامل کر دی، اس کے بعد وہ گمنام رہے نہ میں۔ اس عبارت کے ایک دو فقرے...... ۱۹۳۶ء والوں نے اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے مسائل کے اظہار کے لیے جو عوامی پیرایہ اختیار کیا تھا اس کی یکسانیت اور بے تہی مجھے سخت ناپسند ہے، مگر میری پسند ناپسند سے ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی کی پاپولیرٹی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بلکہ انھیں لوگوں کا لہجہ اور الفاظ مستعار لے کے ۳۵ سال بعد بھی حبیب جالب اور احمد فراز جیسے لوگ اپنی ایک پرت کی شاعری کے بل بوتے پر مشاعرے لوٹتے نظر آتے ہیں۔ آپ سے اتنی درخواست ہے کہ اگر آپ مندرجہ بالا شاعروں کی شاعری سے شغف رکھتے ہیں تو پھر مسٹر بخش لائلپوری کا کلام بھی پڑھیے...... بظاہر یہ فقرہ بے ضرر تھا، میں نے دانستہ اسے ضرر رساں کر دیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دونوں جہاں دیدہ عندلیب (جن پر ساٹھواں برس یا تو لگ چکا ہے یا لگ رہا ہے) سرمہ اور خضاب لگا کر آہ و زاریاں کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ تیس تیس، چالیس چالیس سال جہالت کے زور پر شعر لکھنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو مہربان چھوڑ آئے، داستاں چھوڑ آئے یا شرابوں میں ملیں، پھول کتابوں میں ملیں جیسے فرسودہ رومانی جذبات پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔''

یگانہ نے اصغر کی آبنوسی رنگت کو سامنے رکھ کر شعر کہے تھے، ساقی نے اپنے معاصرین کے رنگِ سخن کو موضوع بنا کر دادِ سخن دی ہے۔ لیکن یہ داد اس وقت بیداد ہو جاتی ہے جب ساقی بزرگ معاصرین کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں کئی جگہ سردار جعفری اور وامق جونپوری جیسے بزرگوں کو انھیں لفظوں میں یاد کیا گیا ہے جن لفظوں میں وہ اپنے ہم عمروں کو عموماً یاد کرتے ہیں۔ دیدہ دلیری اور بے مروتی کی انتہا ہے کہ سردار جعفری کے اعزاز میں منعقد ہونے والے ایک جلسے میں ساقی نے جو مضمون پڑھا، اس میں سردار جعفری کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں کمزور ضرور ہوں مگر منطقی میرے مزاج میں ہے اور آج صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ آپ کی شخصیت کا ہمیشہ سے قدر دان رہا ہوں اور میرا مسلک بھی آپ سے جدا نہیں ہے کہ کمبخت سوشلسٹ ہوں بلکہ یہاں بسنے کے بعد اور بائیں طرف سرک گیا ہوں مگر شاعری میں صرف ایک ہی خیال اور ایک ہی جذبے کو متھنے کا قائل نہیں کہ میری کمٹمنٹ صحافت سے نہیں شاعری سے ہے جو پوری ذات کا مکمل اظہار مانگتی ہے۔ یہی نہیں میں احمد فراز ٹائپ کے شاعروں کو یہ تنبیہ بھی کرتا رہتا ہوں کہ فیض کے الفاظ، سردار کے انداز، ساحر کے لہجے اور مخدوم کے نغمے کی چوری نہ کرو۔''

ایسے ہی موقعوں پر کہتے ہیں کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ مقصود تھی اصلاح سردار جعفری کی اور تنبیہ کر دی احمد فراز کو۔ ایک طرف تو ساقی اپنی منصف مزاجی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اور دوسری طرف ناانصافی کا یہ عالم ہے کہ کاما اور فل اسٹاپ کی جگہ بھی وہ احمد فراز ہی کو استعمال کرتے ہیں۔ احمد فراز کے صبر کی داد دینی چاہیے کہ اس نے ساقی کی کسی بات کا کبھی کوئی جواب نہیں دیا۔ سننے میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ کسی نے فراز سے کہا کہ آپ ساقی کی باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ فراز نے کہا، جتنا وقت ساقی کی باتوں کا جواب دینے میں صرف ہوگا، اتنے وقت میں میں دس غزلیں کہہ لوں گا۔ یہ بات ساقی تک پہنچی تو اس نے کہا، فراز غزل تو ایک ہی کہتا ہے، باقی تو کاربن کاپیاں ہوتی ہیں۔

ساقی کی کتاب لاہور سے چھپی ہے لیکن ہمارے پاس براہ لندن آئی ہے۔ یہ نسخہ نوادر میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ اس میں ساقی نے خود اپنے قلم سے تقریباً ڈیڑھ سو اغلاطِ طباعت کی تصحیح کی ہے اور اتنے ہی مقامات پر سفیدہ استعمال کر کے بعض الفاظ کو مٹایا ہے۔ ساقی نے بہت اچھا کیا کہ معنوی اغلاط کو درست نہیں کیا، ورنہ تصحیح کا کام بہت بڑھ جاتا۔ سفیدے کے استعمال سے بھی ساقی نے ہاتھ روک کر کیا ہے، اگر یہ خدمت ہم سے لی جاتی تو کتاب کا کم از کم ایک چوتھائی حصہ سفید پوشوں میں شمار ہونے کے لائق ہو جاتا۔ (۴ر جنوری ۱۹۹۶ء)

تنقید کی توپ چلانے والے طوطے

پچھلے کالم میں ہم نے ساقی فاروقی کی کتاب "ہدایت نامۂ شاعر" کے بارے میں کچھ مذاق کی باتیں کی تھیں۔ ہمیں اپنی یہ بری عادت خود بھی پسند نہیں ہے کہ مذاق ہی مذاق میں دل کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اس مرتبہ ہم سنجیدگی سے کام لے کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ساقی کی کتاب میں پرانے شاعروں کے لیے عبرت اور نئے شاعروں کے لیے بصیرت کا خاصا سامان موجود ہے۔ جدید اُردو شاعری پر جتنی گہری نظر ساقی کی ہے، اتنی کم لوگوں کی ہوگی۔ قدیم شاعری کا مطالعہ بھی بہت وسیع ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساقی نے عالمی شاعری خصوصاً انگریزی شاعری کو بڑی توجہ سے پڑھا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کا ایسا قابلِ رشک مطالعہ ہوگا، جب وہ اپنے معاصرین کی شاعری پر لکھے گا تو پڑھنے والوں کے لیے خاصا غور وفکر کا سامان فراہم کرے گا۔ ساقی کی یہ کتاب ہر اس شخص کو پڑھنی چاہیے جو اچھی اور بُری شاعری کا فرق جاننے کا خواہاں ہو۔ ساقی نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ تخلیقی ادب کا بہترین نقاد ایک تخلیقی فنکار ہی ہوسکتا ہے، کیونکہ وہی صحیح طور پر بتا سکتا ہے کہ تخلیقی ہنر آزمائش کے کس کس مرحلے سے گزر کر کسی ادب پارے کو وجود میں لاتا ہے۔

ساقی کی اتنی ہی تعریف بہت ہے۔ اس سے زیادہ ہم اس لیے نہیں کر سکتے کہ ہمارے پاس تعریفی الفاظ کی جو لغت ہے، اس میں الفاظ کا ذخیرہ بس اتنا ہی تھا جتنا اوپر کے پیراگراف میں صَرف ہوگیا۔ مجبوراً اب ہمیں دوسری لغت کو سامنے رکھ کر یہ کالم پورا کرنا پڑے گا۔

چند سال پہلے ساقی کی زیرِ نظر کتاب کا پہلا ایڈیشن "بازگشت و بازیافت" کے نام سے شائع ہوا تھا تو ہم نے اس پر ایک مفصل کالم لکھا تھا۔ نئے ایڈیشن پر گفتگو کرتے ہوئے ہم پرانے مضامین کو موضوعِ بحث نہیں بنائیں گے، کیونکہ اس کا اندیشہ ہے کہ ہم کوئی ایسی بات نہ لکھ دیں

جس سے ہماری سابقہ باتوں کی تردید کا پہلو نکلتا ہو۔ کالم نگار کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ "حافظہ نباشد" والی پھبتی کا اصل ہدف اسی کو سمجھنا چاہیے۔ اسے یاد نہیں رہتا کہ کس موضوع پر وہ پہلے کیا لکھ چکا ہے، لہٰذا ہم اپنی گفتگو کو انھی مضامین تک محدود رکھیں گے جو کتاب کے پہلے ایڈیشن میں شامل نہیں تھے۔

ساقی کی کتاب میں جو نئے مضامین شامل ہیں، ان میں سے سردار جعفری والے مضمون کا ذکر ہم پچھلے کالم میں کر چکے ہیں۔ دو تنقیدی شذرے جو مجاز اور مخدوم کے حوالے سے ہیں، مختصر ہونے کے باوجود ساقی ٹائپ تنقید کا عمدہ نمونہ ہیں۔ یعنی خصوصی عدالتوں کے فیصلوں کی طرح مختصر بھی ہیں اور جامع بھی۔ مجاز کے متعلق ساقی کی رائے یہ ہے:

"ان کے یہاں ایک ہی جذبے اور احساس کی تکرار اس قدر ہے کہ جی بولانے لگتا ہے اور علم اور مشاہدے کی کمی بری طرح کھٹکنے لگتی ہے۔"

دوسرے شذرے میں مخدوم کے ایک مصرعے (رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم) کے حسن و قبح پر بحث کی گئی ہے اور ضمناً یہ معنی خیز فیصلہ صادر کیا گیا ہے:

"میں ترقی پسند تحریک کے دو شاعروں فیض اور مخدوم کا بہت قائل ہوں۔ فیض تو اپنی نسل کی خوبصورت ترین آواز بن کر اُبھرے اور دوسری طرف مخدوم بھی اپنے ہم عصروں یعنی سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی سے ذرا بہتر شاعر ثابت ہوئے۔ سردار جعفری اور قاسمی اپنے اپنے ملک ہندوستان اور پاکستان میں بہترین ثانوی یعنی Second best نواپیراؤں میں ہیں۔"

احمد ندیم قاسمی کے ساتھ جن سردار جعفری کا نام لیا گیا ہے، اسی سردار جعفری کے بارے میں زیرِ نظر کتاب میں ساقی نے یہ بھی لکھا ہے:

"ایک طرف ترقی پسندوں کے گل محمد سردار جعفری جیسے مجہول نظریات داں ہیں جو اپنے کرم خوردہ اکھڑے پن کے بچاؤ کے لیے قاسمی کی مذہبیت اور پاکستانیت پر گاہے گاہے شاید اس لیے حملہ آور ہوتے ہیں کہ لوگوں کی نظر خود اُن کی نہایت بیزار کن، بودی اور یکسانیت پسند شاعری پر نہ پڑے۔"

خود احمد ندیم قاسمی کی شاعری کو ساقی نے "روکھی پھیکی شاعری" کہا ہے اور یہ بھی کہ "ان کے یہاں مجموعی طور پر کسی آنچ کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔"

علی سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی کے بارے میں ان آرا سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ

ساقی کے ذہن میں ”بہترین ثانوی نوابیرا“ کا تصور کیا ہے۔ گویا ساقی اگر کسی کو خوش بھی کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خلاف کوئی بات کہہ کر خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ساقی کے نئے مضامین میں سب سے طویل اور سنسنی خیز مضمون ”نابالغ شاعری کی ایک مثال“ ہے جس میں ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں جو لہجہ ملتا ہے اور جس طرح ڈاکٹر وزیر آغا کی تضحیک کی گئی ہے، اس کے پیش نظر بعض لوگوں کی یہ رائے ہے کہ یہ مضمون بذات خود نابالغ تنقید کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے، کیونکہ اردو کا بیشتر تنقیدی سرمایہ ایسا ہی ہے اور نابالغوں ہی کے لیے لکھا گیا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ ساقی فاروقی اور ڈاکٹر وزیر آغا میں خاصے خوشگوار تعلقات تھے۔ اتنے خوشگوار کہ ساقی جب بھی پاکستان آتے تھے تو ڈاکٹر صاحب کی میزبانی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہی نہیں ساقی کو اس کا بھی قلق تھا کہ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی میں تعلقات کشیدہ کیوں ہیں۔ ساقی کی یہ خواہش تھی کہ ان دونوں میں صلح ہو جائے اور اپنے اس خیر خواہانہ جذبے کا اظہار انھوں نے قاسمی صاحب پر اپنے مضمون میں ان الفاظ میں کیا تھا:

”قاسمی صاحب اور آغا صاحب کو اپنے اپنے رویے میں لچک پیدا کر لینی چاہیے۔ دونوں ہی بیمار رہنے لگے ہیں اور یہ کہ ان کی عمروں میں میری عمر گئے، مگر وقت کم ہے اور اپنے دوست ڈاکٹر وزیر آغا سے مزید کہتا ہوں کہ آغا صاحب یہ نہ بھولیے کہ قاسمی صاحب آپ سے طبعی عمر میں بڑے ہیں اور ادبی عمر میں بھی۔ پہل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر آخری کوشش ناکام رہے تو بھی یہ قلق تو نہیں ہوگا کہ آپ کی طرف سے کوتاہی ہوئی۔“

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے کہ قاسمی صاحب اور آغا صاحب میں صلح کا خواہش مند اب خود آغا صاحب کے خلاف برسرِ پیکار ہے اور وہ بھی بقول استاد لاغر مرادآبادی ایسی زبان میں جس کا شائستگی سے کوئی تعلق نہیں۔ استاد گرامی کا یہ خیال بھی ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری کے خلاف ساقی ضرور لکھیں، لیکن یہ حق انھیں کس نے دیا ہے کہ وہ بازاری زبان میں گفتگو کریں۔ استاد لاغر مرادآبادی کے ان خیالات سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ ہر شخص کا شائستگی کا معیار جداگانہ ہوتا ہے۔ ایک چیز جو استاد کے نزدیک شائستہ ہے، ساقی کے نزدیک غیر شائستہ ہو سکتی ہے۔ رہا بازاری زبان کا مسئلہ تو یہ بھی اس وقت غیر اہم ہو جاتا ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ اُردو تو ہے ہی بازاری

زبان۔ اس کی پیدائش اور نشو نما بازاروں میں ہوئی ہے، اس لیے اگر ساقی نے بازاری زبان میں گفتگو کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُردوئے معلی میں گفتگو کر رہے تھے۔ اُردوئے معلی میں گفتگو کرنے والے کی زبان سے سند لی جاتی ہے، اعتراض نہیں کیا جاتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ساقی اگر خالص علمی انداز میں وزیر آغا کی شاعری پر گفتگو کرتے تو ان کی تنقید ایک بہت بڑی ادبی خدمت ہوتی لیکن ذاتی حملوں کی وجہ سے مضمون کی ادبی قدر و قیمت بہت کم ہو گئی ہے۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اگر ساقی کا مضمون صرف علمی و ادبی نکات تک محدود ہوتا تو اسے کوئی نہ پڑھتا اور اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو جوش ملسیانی کی کتاب ”اقبال کی خامیاں“ کا ہوا۔ جوش ملسیانی نے اقبال کی جن خامیوں کی نشاندہی کی تھی، آج اس کا شمار خوبیوں میں ہوتا ہے اور جوش کی کتاب طاق نسیاں میں رکھ دی گئی ہے۔ اس کے برعکس ساقی کا مضمون ہر عہد میں تازہ رہے گا، لوگ اسے پڑھیں گے اور ہنستے رہیں گے اور کوئی تعجب نہیں کہ اس مضمون کی بنا پر اکیسویں صدی میں ساقی کا شمار شاعروں کی بجائے مزاح نگاروں میں ہو۔

تین سال پہلے ساقی نے یہ مضمون کراچی کی ایک ادبی نشست میں سنایا تھا، پھر اسے زبیر رضوی کے رسالے ”ذہن جدید“ (دہلی) اور عطاء الحق قاسمی کے رسالے ”معاصر“ (لاہور) میں چھپوایا۔ اب یہ ”ہدایت نامۂ شاعر“ میں شامل کیا گیا ہے۔ مضمون کی ان چاروں اشاعتوں میں خاصا فرق ہے۔ کتاب میں شامل متن میں نہ صرف یہ کہ بعض ”نرم“ جملے حذف کر دیے گئے ہیں بلکہ بعض مقامات پر انتہائی سخت اور تلخ جملوں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ ان تبدیلیوں کو پسند نہ کریں لیکن ہماری رائے اس کے برعکس ہے۔ ہر مصنف کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی کسی تحریر میں کمی بیشی کرے۔ رجب علی بیگ سرور نے اپنی کتاب ”فسانۂ عجائب“ کے ہر ایڈیشن میں تبدیلیاں کیں۔ اس پر کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا تو ساقی پر اعتراض کیوں کیا جائے؟ ساقی نے بہت اچھا کیا کہ اپنے مضمون کے بعض حصے حذف کر دیے۔ خصوصاً وہ حصہ جس میں انھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا سے یہ شکایت کی تھی...... ”آپ نے مجھ سے بھی زیادہ کمتر شاعروں کا گوشہ اوراق میں نکالا، میرا کیوں نہیں“...... اس شکایت سے یہ ترشح ہوتا تھا جیسے یہ مضمون لکھ کر ساقی نے ڈاکٹر وزیر آغا کو گوشہ نہ نکالنے کی سزا دی ہو۔ مضمون کے موجودہ متن کے اعتبار سے اب سزا کا سبب تبدیل ہو گیا ہے جو یہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے ساقی کی مرضی کے مطابق شاعری کیوں

نہیں کی۔ ہم ڈاکٹر وزیر آغا کو ان کے مفاد میں مشورہ دیں گے کہ وہ آئندہ ساقی کی منظوری حاصل کیے بغیر اپنی کوئی نظم یا غزل شائع نہ کرائیں، ورنہ ساقی کو آئندہ بھی اس قسم کے مضامین لکھتے رہنے کا حق حاصل ہوگا۔

ساقی نے مضمون کے ساتھ مضمون کی سابقہ اشاعتوں پر بعض لوگوں کا ردِ عمل بھی درج کتاب کیا ہے۔ مشفق خواجہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب ساقی نے اپنا مضمون آغا صاحب کو بھیجا تو انھیں اتنا صدمہ ہوا کہ وہ تین مہینے تک اپنے گاؤں سے باہر نہ نکلے۔ ہم نے مشفق خواجہ سے اس کی تصدیق چاہی تو انھوں نے کہا:

''یہی ایک بات نہیں، ساقی نے اور بھی کئی باتیں مجھ سے منسوب کی ہیں۔ جس مضمون کے لکھنے کے دوران بقول ساقی، رات بھر میں فرانس کی سرخ وائن اور جرمنی کی سفید وائن کی دو بوتلیں ختم کی گئی ہوں، اس مضمون میں لکھنے والے کو آزادی ہے کہ جو بات جس سے چاہے منسوب کر لے۔''

مضمون کے ساتھ شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ جملہ بھی درج کیا گیا ہے: ''تم نے ایک مچھر کو توپ سے مار دیا ہے۔'' یہ جملہ پڑھ کر استاد لاغر مرادآبادی نے کہا: ''اب تک شمس الرحمٰن فاروقی کے تنقیدی لشکر میں طوطے توپ چلاتے تھے، خوشی کی بات ہے کہ اب یہ کام ساقی فاروقی سے لیا جا رہا ہے۔''

(۱۱ر جنوری ۱۹۹۶ء)

اکادمی ادبیات یا بے ادبیات

جب سے کاغذ مہنگا ہوا ہے، ادب سستا ہو گیا ہے۔ رسالے اس کثرت سے شائع ہونے لگے ہیں کہ انہیں پڑھنا تو الگ رہا، ان کی ورق گردانی بھی ایک مشکل کام ہے۔ اس مشکل کام کو انجام دیتے دیتے ہم اچھے خاصے ''ورق گردان'' بن گئے ہیں۔ اب کا تو معلوم نہیں، قیام پاکستان سے پہلے لائبریریوں میں ایک منصب ''ورق گردان'' کا ہوا کرتا تھا۔ اس منصب پر فائز ہونے والے کا کام یہ تھا کہ وہ کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور اس کی ورق گردانی کرتا رہتا، ایک کپڑا اس کے ہاتھ میں ہوتا جس سے وہ ہر ورق کو صاف بھی کرتا جاتا تھا۔ اس طرح کتابیں کیڑوں اور گرد و غبار سے محفوظ رہتی تھیں۔ ہم میں اور لائبریری کے ورق گردان میں فرق صرف یہ ہے کہ اسے اس کام کی تنخواہ ملتی تھی اور ہم یہ فرض کسی معاوضے کے بغیر ادا کرتے ہیں۔ بہر حال اس ورق گردانی کا یہ فائدہ ضرور ہوا ہے، ہم اس راز سے آگاہ ہو گئے ہیں کہ جو رسالے آنکھیں بند کر کے شائع کیے جاتے ہیں، انہیں آنکھیں بند کر کے پڑھا بھی جا سکتا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ ہم پرانے زمانے کے آدمی ہیں، اس لئے ہمیں پرانے رسالے ہی اچھے لگتے ہیں۔ ''افکار'' اور ''تخلیق'' جیسے رسالوں سے ہمارا تعلق ویسا ہی ہے جیسا اپنی دوسری بری عادتوں سے۔ سب کچھ چھوڑا جا سکتا ہے، بری عادتوں سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا۔ یہ دونوں رسالے ہمیں اس لئے پسند ہیں کہ ان کے مدیران گرامی ادب کے بے لوث خدمت گزار ہیں اور اپنے رسالوں کو اپنی ذاتی تشہیر کا ذریعہ نہیں بناتے۔ مدیر ''افکار'' جناب صہبا لکھنوی تو اس حد تک منکسر المزاج ہیں کہ اداریہ بھی خود نہیں لکھتے، ہر مہینے کسی مہمان مدیر کو زحمت تحریر دیتے ہیں۔ اس کا ضمنی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بعض ناقابل اشاعت تحریریں بھی بطور اداریہ شائع ہو کر مقبول خواص و عوام

ہو جاتی ہیں۔

مدیر افکار کی منکسر المزاجی کا دوسرا بڑا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے شاعر ہونے کے باوجود اپنے رسالے کو آلودۂ ذاتیات نہیں کیا۔ یعنی کبھی اپنی کوئی نظم یا غزل شائع نہیں کی۔ حالانکہ دوسرے مدیر، دوسروں کی معیاری تحریروں پر اپنی خرافات عالیہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ بلکہ رسالے نکالتے ہی اسی لئے ہیں کہ اپنی ادیبانہ حیثیت کو مستحکم کر سکیں۔ صہبا لکھنوی نے اپنی شاعری کو "افکار" میں اشاعت کے لائق نہ سمجھا تو شاعری ہی ترک کر دی۔ اب ان کے پاس اپنے شاعرانہ عہد کی یادگار ایک تخلص رہ گیا ہے اور اسی کو وہ شاعری کا نعم البدل سمجھ کر سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

اظہر جاوید اتنے منکسر المزاج نہیں ہیں۔ وہ شاعری بھی کرتے ہیں اور کبھی کبھار اپنے رسالے میں، جگہ بچ جاتی ہے تو اسے شائع بھی کر دیتے ہیں اور اداریہ بھی لکھتے ہیں جو خاصا زوردار ہوتا ہے بلکہ ان کے بعض اداریے تو علامہ اقبال کی "ضربِ کلیم" کی طرح دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں بڑے سے بڑے آدمی کی رائے سے اختلاف کرنے کی جرأت ہے اور اس معاملے میں وہ دوسروں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "تخلیق" میں ادیبوں کے ایک دوسرے کے خلاف خطوط باقاعدگی سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہم سب سے پہلے یہی خطوط پڑھتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید اور عطاء الحق قاسمی نیز ان کے طرف داروں نے ایک دوسرے کے خلاف جیسے خطوط "تخلیق" میں لکھے ہیں، ان کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ اس سطح پر تو مصحفی و انشا نے باہمی ہجویات کا تبادلہ بھی نہیں کیا تھا۔ "تخلیق" میں شائع شدہ خطوط کو پڑھ کر ہی ہم نے ڈاکٹر انور سدید اور عطاء الحق قاسمی کی انشا پردازی کا لوہا مانا تھا۔ لیکن اس میں ان دونوں کا کوئی کمال نہیں، موضوع پسندیدہ ہو تو تحریر میں شگفتگی آ ہی جاتی ہے۔

اظہر جاوید کے رسالے کی ایک خوبی جو اسے اردو کے دوسرے تمام رسالوں سے ممتاز کرتی ہیں، یہ ہے کہ اس کے ذریعے پچھلے پچیس برسوں میں درجنوں نئی لکھنے والیوں کو تحریراً و صورتاً متعارف کرایا گیا ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ ہر شمارے میں متعدد پرانے ناموں کے ساتھ ایک دو نئے باتصویر نام ضرور ہوتے ہیں۔ پرانے ناموں کے ساتھ تحریریں تو پرانی ہو سکتی ہیں، مگر تصویریں ہمیشہ نئی ہوتی ہیں۔ گویا "تخلیق" ادب کے ساتھ ساتھ فوٹوگرافی کے فن کی بھی خدمت کر رہا ہے۔

اظہر جاوید کا تازہ ترین کارنامہ، جس کی وجہ سے ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں، یہ ہے کہ انہوں نے اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین کے نام ایک قانونی نوٹس بھجوایا ہے۔ سبب یہ ہے کہ اکادمی نے "مزاحمتی ادب" کے نام سے ایک کتاب اور اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔ جس میں اظہر جاوید کی ایک نظم "کب تک جبر کا پہرہ ہوگا" ان کی اجازت کے بغیر اصل اور انگریزی ترجمے کی صورت میں شامل کی گئی ہے۔ اکادمی کے اس اقدام سے کاپی رائٹ آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۲ء اور تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۳ کی خلاف ورزی ہوتی ہے جو ایک قابل مؤاخذہ فعل ہے۔ اظہر جاوید کے وکیل نے نوٹس میں یہ لکھا ہے کہ اس کے مؤکل کو اکادمی کی غیر قانونی حرکت سے جو نقصان پہنچا ہے، اس کی تلافی اس طرح ہو سکتی ہے کہ بہ تفصیل ذیل ہرجانہ ادا کیا جائے۔

۱۔ نظم اور اس کے ترجمے کی رائلٹی ایک لاکھ روپے
۲۔ اظہر جاوید کو جو ذہنی کوفت ہوئی، اس کا زر تلافی ایک لاکھ روپے
۳۔ وکیل کی فیس دس ہزار روپے

کل دو لاکھ دس ہزار روپے کا مطالبہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ اکادمی ملک کے دو ممتاز روزناموں میں غیر مشروط معافی نامہ شائع کرائے، بصورت دیگر قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

اظہر جاوید کا مؤقف یہ ہے کہ اکادمی ادیبوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے قائم کی گئی ہے، اگر وہ بھی عام ناشروں کی طرح ادیبوں کے حقوق پامال کرنے لگے تو پھر ادب کا خدا ہی حافظ ہے۔ ہم نہایت ادب کے ساتھ عرض کریں گے کہ پاکستان کے عام ناشروں کی اخلاقی حالت ابھی اتنی خراب نہیں ہوئی کہ وہ ادیبوں کی تخلیقات ان کی اجازت کے بغیر شائع کر دیں۔ یہ جسارت صرف اکادمی ادبیات ہی کر سکتی ہے اس لئے ضابطۂ اخلاق کی رو سے ادب کے نام پر ہر قسم کی خوش فعلیاں جائز ہیں۔ وہ دن گئے جب لکھنے والے کو ادیب اور لکھے ہوئے کو الفاظ کو ادب کہا جاتا تھا، اب اکادمی کی عنایت سے یہ شرطیں اڑا دی گئی ہیں اور "دانشور" اور "دانشوری" کی اصطلاحیں استعمال کی جا رہی ہیں۔ ان اصطلاحوں کے مفاہیم میں اتنی وسعت ہے کہ ہر برسر اقتدار سیاسی پارٹی کا ہر کاسہ لیس "دانشور" ہے اور جو کچھ وہ اپنی زبان ظرافت ترجمان سے صادر فرماتا ہے وہ "دانشوری" ہے بلکہ دانشور ہونے کے لئے اب زبان سے زیادہ بے زبانی کام آتی ہے۔ کہ زبان کھولنے سے آدمی کی اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اظہر جاوید کا ادب سے چونکہ جائز تعلق ہے اور یہ

حیثیت شاعر وہ ایک مقام رکھتے ہیں اور مذکورہ معنوں میں دانشور نہیں ہیں، اس لئے انہیں اپنے حقوق کی پامالی پر بجا طور پر دکھ ہوا ہے۔ اگر وہ جیالے دانشور ہوتے تو انہیں بغیر قانونی نوٹس کے بھی بہت کچھ مل سکتا تھا۔

اظہر جاوید سے دلی ہمدردی ہونے کے باوجود ہمیں اس سے اتفاق نہیں کہ اکادمی کو اپنی کتاب میں ان کی نظم اجازت کے بغیر شامل نہیں کرنی چاہئے تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے جب اظہر جاوید نے نظم لکھنے سے پہلے کسی سے اجازت نہیں لی تو اکادمی کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اجازت وغیرہ کے چکر میں پڑے۔ جہاں تک نظم کے انگریزی ترجمے کا تعلق ہے، اس پر اظہر جاوید کو نہیں ان لوگوں کو ناراض ہونا چاہیے جن کی زبان انگریزی ہے۔ ایک یہی نظم کیا، وہ سارا مزاحمتی ادب جسے اردو سے انگریزی میں منتقل کیا گیا ہے، انگریزی والوں کے لئے تشویش کا باعث ہو سکتا ہے کہ اس طرح ان کی زبان کو خراب کیا جا رہا ہے۔ "مضامین پطرس" کے دیباچے میں یہ اصول ہمیشہ کے لئے طے پا چکا ہے کہ اردو کی کسی کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنے سے پہلے اس ملک کے لوگوں کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ افسوس کہ اکادمی نے اس اصول پر عمل نہیں کیا۔

اظہر جاوید جیسے طرح دار شاعر کے ساتھ جو اصل زیادتی ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ اکادمی نے انہیں ان لکھنے والوں کی صف میں شامل کیا ہے جن کی صحافیانہ تحریروں کو مزاحمتی ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ اظہر جاوید کو چاہئے کہ وہ اکادمی پر ایک الگ مقدمہ ازالۂ حیثیت عرفی کا بھی دائر کریں جس میں یہ دلیل پیش کی جائے کہ جو شخص بھی مزاحمتی ادب پر اکادمی کی شائع کردہ کتاب دیکھتا ہے وہ انہیں مزاحمتی شاعر سمجھتا ہے۔ اس طرح ان کی ادبی ساکھ کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ رائلٹی اور ذہنی اذیت کے سلسلے میں جو رقم طلب کی گئی ہے، اس سے کہیں زیادہ ازالۂ حیثیت عرفی کے مقدمے میں طلب کی جا سکتی ہے۔ اس مقدمے میں انشاء اللہ ضرور کامیابی حاصل ہو گی۔ اظہر جاوید صاحب سے گزارش ہے کہ جب وہ اس مقدمہ میں جیت جائیں اور رقم انہیں مل جائے تو ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ وکیل کو فیس دی جا سکتی ہے تو ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کرنے کا مشورہ دینے والے کا بھی کچھ حق بنتا ہے۔ اظہر جاوید ماشاءاللہ سمجھدار ہیں، امید ہے اس اشارے کو وہ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے۔

قانونی نوٹس میں نظم اور اس کے ترجمے کی رائلٹی صرف ایک لاکھ روپے طلب کی گئی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ اتنی رقم تو علامہ اقبال کو ان کی زندگی میں ان کی تمام تصانیف سے بھی نہیں ملی تھی تو اظہر جاوید کو صرف ایک نظم کا اتنا معاوضہ کیسے مل سکتا ہے۔ معترضین کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔ قسام ازل نے علامہ اقبال کو جو کچھ دیا وہ اظہر جاوید کو نہیں ملا۔ اگر علامہ رائلٹی کے معاملے میں پیچھے رہ گئے تو اس میں اظہر جاوید کا کیا قصور ہے۔ یہ اس کی دین ہے، جسے پروردگار دے۔

قانونی نوٹس میں ذہنی اذیت کی تلافی کے لئے بھی صرف ایک لاکھ کی رقم طلب کی گئی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ دست طلب کی کوتاہی ہے جس نے اکادمی کے دامن پر حریفانہ تو کھینچا ہے، حریصانہ نہیں کھینچا۔ ہم نے اظہر جاوید کی نظم پڑھی ہے، نہ اس کا انگریزی ترجمہ۔ صرف وکیل کا نوٹس پڑھ کر جو ذہنی اذیت ہمیں پہنچی ہے، اس کا ازالہ ڈیڑھ لاکھ کی رقم سے نہیں ہو سکتا۔ اظہر جاوید تو نظم کے مصنف ہیں، نظم لکھنے کے دوران اور پھر اسے چھپا ہوا دیکھ کر انہیں جو ذہنی اذیت ہوئی ہو گی، اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس لئے ہم ان سے عرض کریں گے کہ: نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔

یہ تو صرف ایک نظم کا معاملہ ہے، مزاحمتی ادب سے متعلق اردو اور انگریزی دونوں کتابیں مکمل طور پر پڑھنے والوں پر جو قیامت گزری ہو گی، اس کی کیفیت اور کمیت کو اگر روپوں میں منتقل کیا جائے تو معاملہ کروڑوں تک پہنچ سکتا ہے۔ اکادمی ادبیات سے گزارش ہے کہ ان دونوں کتابوں کا ایک ایک نسخہ ہمیں بھی بھیج دیا جائے تاکہ انہیں پڑھ کر ذہنی کوفت کے زر تلافی کا قانونی نوٹس بھجوایا جا سکے۔ ممکن ہے اکادمی کی طرف سے عذر پیش کیا جائے کہ اکادمی کی سرکاری گرانٹ تو چیئرمین کے استقبالیہ جلسوں میں ـــــ لگ جاتی ہے، اس کے مالی وسائل ایسے نہیں ہیں کہ ذہنی کوفت کا ہرجانہ ادا کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں ہماری گزارش یہ ہے کہ اکادمی جیالوں کے ہاتھ میں ہے اور حکومت بھی انہی کی ہے۔ رقم حاصل کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ کسی بھی بینک سے قرض لے کر معاف کرایا جا سکتا ہے۔ اور اگر اس میں کوئی تکلف ہے تو پھر جہاں عوام کو ذہنی کوفت پہنچانے کے لئے نئے بجٹ میں بے شمار ٹیکس لگائے گئے ہیں، وہاں اکادمی ادبیات کی طرف سے ہرجانے ادا کرنے کے لئے بھی ایک ٹیکس لگایا جا سکتا ہے۔ اس نئے ٹیکس کو "اکادمی ادبیات ذہنی کوفت ٹیکس" سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

اظہر جاوید کے وکیل کی طرف سے جو نوٹس بھیجا گیا ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ اکادمی ملک کے دو ممتاز روزناموں میں غیر مشروط معافی نامہ چھپوائے۔ یہ خاصا مہنگا کام ہے۔ ایک بہت بڑی رقم اخبار کو مفت میں مل جائے گی۔ ہماری تجویز ہے کہ یہ معافی نامہ اخباروں کی بجائے ادبی رسالوں میں چھپنا چاہیے تاکہ ادب کا بھلا ہو۔ ہم اس سلسلے میں ”تخلیق“ اور ”افکار“ کے نام پیش کرتے ہیں۔ ”تخلیق“ میں یہ معافی نامہ اس جگہ چھپنا چاہیے جہاں ڈاکٹر انور سدید اور عطاء الحق قاسمی کے خطوط چھپتے ہیں تاکہ ان دونوں کو بھی ایک دوسرے کی خطائیں معاف کرنے کا خیال آئے۔ ”افکار“ میں معافی نامے کو بطور اداریہ شائع کیا جا سکتا ہے تاکہ کسی مہمان مدیر کے لکھے ہوئے اداریے کی جگہ قارئین کو کوئی ڈھنگ کی چیز پڑھنے کو ملے۔

غالب کے طرف داروں کی سخن فہمی

ڈاکٹر تحسین فراقی نقاد ہیں، شاعر ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پنجاب یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب کے استاد ہیں۔ فارسی اور انگریزی سے بھی گہری آشنائی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس آشنائی کا کوئی منفی نتیجہ برآمد نہیں ہوا یعنی انہوں نے فارسی اور انگریزی میں شاعری نہیں کی ورنہ جن لوگوں کو شاعری کا چسکا پڑ جاتا ہے، وہ اپنی زبان کے ساتھ غیر زبانوں سے بھی برا سلوک کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ کسی غیر زبان میں خود شاعری کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی تو دوسروں سے ترجمہ ہی کرا لیتے ہیں۔ یہ جو آج کل اردو شاعری کے انگریزی میں دھڑا دھڑ تراجم شائع ہو رہے ہیں، تو اس میں مترجمین کا کوئی قصور نہیں۔ خود شعرائے کرام فرمائشیں کر کے اپنے کلام بلاغت نظام کو، بلوغت نظام بنانے کی خاطر انگریزی میں منتقل کرا رہے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ جو خیالات عالیہ صحیح طور پر اردو میں منتقل نہیں ہو سکے، وہ انگریزی میں کیا منتقل ہوں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزوں نے ہمیں غلام بنا کر ڈیڑھ سو سال تک ہم پر جو مظالم کیے ہیں، اس کا انتقام اسی طرح لیا جا سکتا ہے کہ اردو کی خراب شاعری کو انگریزی میں منتقل کر کے انگریزوں کی زبان خراب کی جائے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کی محققانہ، نقادانہ اور شاعرانہ خوبیوں کو بیان کرنے کی صحیح جگہ تو ان کی کسی کتاب کا دیباچہ ہی ہو سکتا ہے۔ فی الحال ہم کالم لکھ رہے ہیں اور کالم میں کسی بخیل کے دل کی طرح اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ کسی کی خوبیاں بیان کی جائیں کیونکہ خوبیوں کو بیان کرنے سے پہلے انہیں تلاش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ہم تو خود گم شدگان ادب میں سے ہیں۔ اندھیری کوٹھڑی میں کالی بلی کو یا گم شدہ اور معدوم چیزوں کو تلاش کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ ویسے بھی تحسین

فراق سے ہمارے تعلقات کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہیں، وہ جب بھی خط لکھتے ہیں، اس میں ہماری دو چار کالمانہ غلطیوں کا ذکر بھی ہمارے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ بات ہمیں بری تو لگتی ہے مگر خوشی بھی ہوتی ہے کہ وہ ہمارا کالم بڑی توجہ سے پڑھتے ہیں۔ اگر اتنی ہی توجہ سے انہوں نے کچھ ڈھنگ کی چیزیں بھی پڑھ لی ہوتیں تو خدا جانے وہ کیا قیامت ڈھاتے!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب تحسین صاحب نے ڈھنگ کی چیزیں بھی پڑھنی شروع کر دی ہیں۔ ان کا تذکرہ خط جو موصول ہوا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں: "رسالہ افکار کے فروری ۱۹۹۶ء کے شمارے میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا اداریہ شامل تھا۔ اس کے بارے میں میں نے ایک استدراک مدیر افکار کی خدمت میں اپریل کے شروع میں بھیجا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ میرا خط افکار میں شائع کیا جائے گا، لیکن جب مسلسل دو ماہ تک خط شائع نہیں ہوا تو میں نے مدیر افکار سے رابطہ کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ میرا خط گم ہو گیا ہے۔ اگر دوبارہ بھجوا دیا جائے تو ضرور شائع کر دیا جائے گا۔ میں نے خط کی عکسی نقل دوبارہ بھیج دی۔ اب اس واقعے کو بھی کئی مہینے گزر چکے ہیں لیکن خط شائع نہیں ہوا۔ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ یہ خط شائع نہیں ہو گا۔ میرا یہ خط خالص علمی نوعیت کا ہے اور کسی کی ذات کے خلاف نہیں ہے۔ اسے اشاعت سے محروم رکھنا سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ میں اپنے خط کی نقل آپ کو بھیج رہا ہوں، اگر آپ مناسب سمجھیں تو اسے اپنے کالم میں شائع کر دیں تا کہ بعض علمی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے۔"

ڈاکٹر تحسین فراقی کا بھی جواب نہیں، جو خط افکار میں اشاعت کے قابل نہیں ہے، اسے ہم اپنے کالم میں چھاپ دیں! گویا ہمارا کالم نہ ہوا، رسالہ افکار کی ردی کی ٹوکری ہو گیا۔ دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ ممکن ہے، اس خط کی اشاعت سے بعض علمی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے لیکن بعض ایسی غیر علمی غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں گی جن کا ازالہ ممکن نہ ہو گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ ہم اس جھگڑے میں تحسین صاحب کی طرف داری کر رہے ہیں۔ مدیر افکار جناب صہبا لکھنوی اور اداریہ نویس ڈاکٹر محمد علی صدیقی، دونوں کے ہم پرانے نیاز مند ہیں، ایک کے رسالے سے اور دوسرے کی کتابوں سے ہم نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ ان دونوں کے احسانات کو زائل کر کے اگر ہم نے تحسین صاحب کا خط چھاپ کر انہیں خوش کر بھی دیا تو اس سے ہمیں کیا فائدہ ہو گا؟ ہاں، خط نہ چھاپنے کی صورت میں نقصان ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ تحسین صاحب ہماری شکایت عطاء الحق قاسمی سے کر دیں گے۔ اور ان سے ہمارے خلاف ایک کالم لکھوا دیں گے۔ ہم قاسمی صاحب سے بہت ڈرتے ہیں کیونکہ وہ جس کے خلاف لکھ دیتے ہیں اس کی دنیا خراب ہو جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ جس کے خلاف لکھ دیں وہ سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ ہمیں قاسمی صاحب کے ذریعے اپنی دنیا خراب کرنے کا شوق نہیں ہے کہ یہ پہلے ہی خاصی خراب ہے اور جنت میں جانا بھی قبول نہیں ہے کہ اس معاملے میں ہمارا عمل شیخ سعدی کے اس قول کے مطابق ہے:

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

بہت غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کوئی ایسا راستہ اختیار کیا جائے جو صلح و سلامتی کا ہو۔ تحسین صاحب کی خواہش بھی پوری کر دی جائے اور افکار کے اداریہ نویس کو شکایت کا موقع بھی نہ دیا جائے، لہٰذا ہم نے طے کیا ہے کہ تحسین صاحب کا خط شائع کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مطالب کی تردید بھی شائع کر دی جائے۔ پہلے تحسین صاحب کا خط شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہم اپنا تبصرہ پیش کریں گے۔

……

مکرمی و محترمی جناب صہبا صاحب۔ آپ جس باقاعدگی سے افکار نکال رہے ہیں، وہ حد درجہ قابل ستائش ہے۔ فروری ۱۹۹۶ء کا شمارہ بھی دیگر شماروں کی طرح لائق مطالعہ تھا۔ اسی شمارے میں آپ نے محترمی محمد علی صدیقی کا اداریہ بھی شامل فرمایا ہے۔ مجھے اسی اداریے کے حوالے سے چند گزارشات کرنا ہیں۔ اور یہ گزارشات محض ریکارڈ کی درستی کی خاطر ہیں۔ جناب محمد علی صدیقی لکھتے ہیں: "یوں لگتا ہے جب غالب نے سر سید کی مرتبہ آئین اکبری کے لئے تعریض (محمد علی صدیقی غالباً "تقریظ" کہنا چاہتے تھے) لکھنے سے معذرت کر لی تھی، اسی وقت سر سید نے غالب کی نکتہ رسی کو اپنے دور کے بزرگ شاعر کی شاعری میں تلاش کیا ہو گا اور وہ لاجواب ہو چکے ہوں گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سر سید غالب کے صاف جواب کے باوجود بھی آثار الصنادید میں غالب کی شان میں قصیدہ خواں نظر آتے ہیں۔"

اس اقتباس میں محمد علی صدیقی سے دو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ اول یہ کہ ان کے بقول غالب نے سر سید کی مرتبہ آئین اکبری کی تقریظ لکھنے سے معذرت کر لی تھی اور دوم یہ کہ اس کے

باوجود سرسید نے اپنی تصنیف آثار الصنادید میں غالب کا ذکر نہایت مدحیہ انداز میں کیا تھا۔ یہ بات قطعاً درست نہیں کہ غالب نے آئین اکبری پر تقریظ لکھنے سے معذرت کی تھی۔ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی یہ کہ غالب نے آئین اکبری پر اڑتیس اشعار کی تقریظ لکھی تھی مگر سرسید نے اسے اپنی کتاب میں شامل نہیں کیا تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ غالب نے اس تقریظ میں آئین اکبری کو انگریز کے لائے ہوئے نئے آئین حیات کے مقابلے میں تقویم پارینہ قرار دیا تھا۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ سرسید نے آئین اکبری کو ۱۸۵۵ء میں مرتب کیا تھا اور یہ پہلی بار ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ رہا آثار الصنادید میں غالب کا قصیدۂ مدحیہ تو یہ بات جاننی چاہئے کہ آثار الصنادید آئین اکبری کی اشاعت سے نو برس پہلے ۱۸۴۷ء میں شائع ہو چکی تھی۔ گویا آثار الصنادید کی اشاعت آئین اکبری پر مقدم ہے، موخر نہیں، جیسا کہ محمد علی صدیقی صاحب کا خیال ہے۔

مخلص تحسین فراقی۔"

……

تحسین صاحب نے اپنے نام سے پہلے لفظ "مخلص" لکھا ہے۔ لہٰذا ہم بھی نہایت خلوص سے عرض کریں گے کہ انہوں نے ڈاکٹر محمد علی صدیقی پر دو نہیں، تین اعتراض کئے ہیں۔

پہلا اعتراض اداریے کا اقتباس نقل کرنے کے دوران یہ کیا ہے کہ اداریہ نگار کو تقریظ اور تعریض کا فرق معلوم نہیں۔ انہوں نے مطلوبہ لفظ کی جگہ ایک ایسا لفظ لکھ دیا جس کے معنی بالکل برعکس ہیں۔ "تقریظ" تعریف کو کہتے ہیں اور "تعریض" کے معنی اعتراض کرنے یعنی برائی کرنے کے ہیں۔ ہمارے نزدیک تحسین صاحب کا اعتراض درست نہیں ہے۔ اداریہ نویس نے جو لفظ لکھا ہے، وہی درست ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آج کل "تقریظ" متروک ہے۔ علامہ اقبال سے لے کر اقبال صفی پوری تک اور پریم چند سے لے کر گوپی چند (نارنگ) تک کسی ادیب نے یہ لفظ اپنی تحریروں میں استعمال نہیں کیا۔ ایسی صورت میں افکار کے اداریہ نویس کو کیا ضرورت تھی کہ وہ ایک متروک لفظ کے استعمال سے اپنی تحریر کو پیچیدہ بناتے جب کہ آج کل کسی تحریر کو پیچیدہ بنانے کے لئے مروج الفاظ بآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ موجودہ دور تقریظ کا نہیں، تعریض کا ہے، جس کا سب سے بڑا ثبوت خود تحسین فراقی کا زیر بحث خط ہے جس میں سوائے اعتراضات کے اور کچھ نہیں۔

محمد علی صدیقی کا خیال ہے کہ غالب نے سرسید کی مرتبہ آئین اکبری پر تقریظ لکھنے سے

معذرت کر لی تھی۔ تحسین فراقی کہتے ہیں، غالب نے معذرت نہیں کی تھی، تقریظ لکھی تھی جسے سرسید نے آئین اکبری میں شامل نہیں کیا۔ اگر تحسین صاحب کی بات بادل ناخواستہ مان بھی لی جائے تو اداریہ نویس کا موقف کمزور نہیں ہوتا کیونکہ اصل مسئلہ جس کی طرف اداریہ نویس نے توجہ دلائی ہے، معذرت کا ہے۔ چلئے اغالب نے معذرت نہیں کی، سرسید نے تو کی کہ غالب سے تقریظ لکھوا کر شامل کتاب نہ کی۔ معذرت کوئی بھی کرے، اس سے دونوں کے معذرت خواہانہ تعلقات کی نوعیت نہیں بدلتی۔ آگے چل کر یہ تعلقات مزید خراب ہو گئے۔ جس تقریظ کو سرسید نے پسند نہیں کیا تھا، غالب کو چاہئے تھا کہ اسے ضائع کر دیتے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اپنی کلیات فارسی شائع کرائی تو اس میں یہ تقریظ بھی شامل کر لی جو سرسید کی بدنامی کا مستقل سبب بنی۔

ایسا ہی ایک واقعہ پچھلے دنوں ہمارے ہاں بھی پیش آیا تھا۔ شاعرہ فہمیدہ ریاض کے رپورتاژ "زندہ بہار" پر مظفر علی سید نے دیباچہ لکھا تھا۔ مصنفہ نے دیباچے کو اس قدر ناپسند کیا کہ دیباچے سمیت پوری کتاب ضائع کرا دی اور پھر اسے دیباچے کے بغیر دوبارہ چھپوایا۔ مگر دیباچہ ہے کہ کتاب کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ سنا ہے کہ لاہور کے ایک نقاد نے اس دیباچے پر ایک مضمون لکھا ہے جو دیباچے سمیت لاہور ہی کے ایک رسالے میں شائع ہو رہا ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ مظفر علی سید کے دیباچے کا وہی حال نہ ہو جو دیوان حالی کے مقدمے کا ہوا تھا۔ دیوان حالی کو تو کوئی نہیں پڑھتا اور اس کا مقدمہ "مقدمۂ شعر و شاعری" کے نام سے چار دانگ عالم میں مشہور ہے اور اسے ہر وہ شخص پڑھتا ہے جسے تنقید سے تھوڑی بہت دلچسپی ہوتی ہے۔

تحسین صاحب نے اداریہ نویس کی ایک غلطی یہ بھی بتائی ہے کہ انہوں نے آئین اکبری کو آثار الصنادید سے پہلے کی تصنیف سمجھ لیا جب کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں بھی تحسین صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آئین اکبری، سرسید کی نہیں، اکبری عہد کے انشا پرداز ابوالفضل کی تصنیف ہے جسے سرسید نے مرتب کیا تھا۔ یہ کتاب سولہویں صدی عیسوی کے آخری چند برسوں میں آثار الصنادید سے تقریباً اڑھائی سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ افکار کے اداریہ نویس نے اگر اسے آثار الصنادید سے پہلے کی تصنیف بتایا ہے تو تاریخی اعتبار سے ان کا بیان بالکل درست ہے۔

اب جب کہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے اعتراضات کا مسکت جواب دیا جا چکا ہے، نامناسب نہ

ہوگا، اگر یہاں آثار الصنادید کے حوالے سے غالب اور سرسید کے تعلقات پر کچھ مزید روشنی ڈال دی جائے تاکہ آئندہ بھی ہمارے ممدوحین اس موضوع پر کچھ لکھیں تو انہیں حوالے کی کتابیں دیکھنے کی ضرورت نہ ہو، اور ضروری مواد ہمارے کالم ہی سے مل جائے۔

آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں اپنا قصیدۂ مدحیہ پڑھ کر غالب بہت خوش ہوئے۔ انہیں یہ کتاب اتنی پسند آئی کہ اس کا ایک نسخہ خرید کر مولوی رجب علی ارسطو جاہ کو تحفتاً بھیجا۔ اسی کے ساتھ جو خط لکھا، اس میں وہ اپنی خوشی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں: ''ایک دوست نے ایک کتاب دہلی کی نئی اور پرانی عمارتوں کے بارے میں لکھی ہے۔ اس کے چوتھے باب میں شاعروں کے حالات قلم بند کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب جامعیت کے اعتبار سے مجھے پسند آئی ہے، اس لئے اس کا ایک نسخہ مطبع سے خرید کر بطور تحفہ بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس نذرانے کو قبول فرمائیں گے۔ (یہ خط فارسی میں ہے، ہم نے اس کا خلاصہ درج کیا ہے)

عجیب بات ہے کہ غالب کی زندگی ہی میں ۱۸۵۴ء میں جب آثار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن چھپا تو سرسید نے اس میں سے وہ حصہ حذف کر دیا جس میں غالب کا ذکر تھا۔ یہ ایڈیشن دیکھ کر غالب کو یقیناً صدمہ ہوا ہوگا۔ ایسا ہی صدمہ سرسید کو اس وقت پہنچا ہوگا جب غالب نے آئین اکبری کی تقریظ لکھی ہوگی۔ آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن سے غالب کے حالات حذف کر دینا کہیں سرسید کی انتقامی کارروائی تو نہیں تھی؟

کیا ادب پر بھی ٹیکس لگانا چاہئے؟

جنگ فورم میں ادیبوں کے درمیان گفتگو

شرکائے گفتگو:

ایک مشہور نقاد، ایک معروف محقق

ایک مقبول شاعر، ایک ممتاز افسانہ نگار

جنگ پینل: ۱۔ منیجر شعبہ اشتہارات، ۲۔ فوٹو گرافر، ۳۔ پروف ریڈر

جنگ: سب سے پہلے میں آپ حضرات کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

کیا آپ مجھے خوش آمدید نہیں کہیں گے۔ میں بھی تو محفل میں موجود ہوں۔

جنگ: معاف کیجئے گا، محترمہ غلطی ہو گئی۔ ہاں تو حضرات و خواتین ....

ناول نویس: آپ میرے لئے جمع کا صیغہ کیوں استعمال کر رہے ہیں۔

نقاد: آپ تو پچاس ناولوں کی مصنفہ ہیں۔ آپ کے لئے جمع الجمع کا صیغہ بھی استعمال کیا جائے تو مناسب ہوگا۔

جنگ: شرکائے محفل سے گزارش ہے کہ وہ براہ راست گفتگو نہ کریں، جو کچھ فرمانا ہو، جنگ پینل کو مخاطب کر کے فرمائیں۔ ہاں، تو پانچ عدد حضرات اور ایک عدد خاتون! میں آپ سب کو خوش آمدید کہتا ہوں اور شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ گزشتہ بارہ گھنٹوں سے اس کمرے میں بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں، حالانکہ جو دعوت نامہ آپ کو بھیجا گیا تھا، اس میں واضح طور پر لکھا تھا کہ آپ شام سات بجے تشریف لائیں لیکن آپ از راہ لطف و کرم صبح سات بجے تشریف لے آئے۔ آپ کے اس لطف و کرم سے ثابت ہو گیا کہ وقت کے ضیاع کا مسئلہ صرف آپ کے قارئین کو درپیش ہی نہیں ہے بلکہ

آپ خود بھی اس معاملے میں خاصے فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ ادیب کو فراخ دل ہونا چاہئے کیونکہ اس وصف کے بغیر اعلیٰ ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ ادارہ بھنگ......

نقاد: پہلے یہ تو بتایئے کہ آپ نے اپنے اخبار کا نام "بھنگ" کیوں رکھا ہے؟

بھنگ: جناب عالی! آپ کو سوال کرنے کے لئے نہیں، جواب دینے کے لئے بلایا گیا ہے۔ اگر آپ کو اخبار کے نام کی وجہ بتا دی گئی تو آپ دوسرا سوال یہ کریں گے کہ اخبار کے ایڈیٹر کا نام مخمور عدم آبادی کیوں ہے؟

نقاد: میں نے آپ کے اخبار کی وجہ تسمیہ اعتراضاً نہیں پوچھی، محض اپنی معلومات میں اضافے کی خاطر سوال کیا ہے۔

بھنگ: یہ کام گزشتہ پچاس برسوں میں نہیں ہو سکا تو اب کیا ہوگا۔ بہر حال آپ کی خواہش کے احترام میں عرض ہے کہ موجودہ دور منشیات کا ہے اور اس وقت دنیا کے تمام ممالک کو منشیات کا خطرہ درپیش ہے۔ اسی خطرے کے سدباب کے لئے ہمارے اخبار کا نام "بھنگ" رکھا گیا ہے۔

نقاد: میرے نزدیک تو اس نام سے منشیات کے رجحان کی حوصلہ افزائی کا پہلو نکلتا ہے۔

بھنگ: اگر آپ اسی طرح گفتگو کے نئے نئے پہلو نکالتے رہے تو ہم موضوع سے ہٹ جائیں گے۔ تنقیدی مقالوں میں تو اس قسم کی بے تکلفی کی گنجائش نکل سکتی ہے مگر ہمیں محدود وقت کے اندر ایک خاص موضوع پر گفتگو کرنی ہے۔ لیکن اس سے پہلے میں چاہوں گا کہ آپ سے بھنگ پینل کو متعارف کرا دیا جائے۔ میں اخبار کے شعبہ اشتہارات کا سربراہ ہوں۔ میری دائیں طرف ادبی صفحے کے پروف ریڈر بیٹھے ہیں۔ یہ اتنے صاحب نظر ہیں کہ کسی ادیب کی صورت دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ اس کے مسودے میں کس کس لفظ کا املاء غلط ہوگا۔

شاعر: آپ انہیں پروف ریڈر کیوں کہتے ہیں۔ قیافہ شناس کہئے۔

بھنگ: میری بائیں طرف فوٹوگرافر ہیں۔ یہ بھی اپنے کام میں ماہر ہیں۔ جیسی کوئی صورت ہوتی ہے ویسی ہی اس کی تصویر کھینچتے ہیں۔

ناول نویس: ان سے کہئے، میری تصویر نہ کھینچیں۔ خدا جانے، فوٹوگرافروں کو مجھ سے کیا دشمنی ہے کہ میری تصویر کبھی ایسی نہیں کھینچتے جسے دیکھ کر میرے علاوہ بھی کوئی خوش ہو۔ میں اپنی ایک تصویر لے کر آئی ہوں اور آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں۔ اخبار میں یہی چھاپی جائے۔

بھنگ: بہت عمدہ تصویر ہے، مگر یہ تو کم از کم ۲۵ سال پہلے کی ہے۔

ناول نویس: ۲۵ سال پہلے کی تو نہیں، ہاں ۲۳ سال پہلے کی ضرور ہے۔

بھنگ: مگر ہم تازہ تصویر چھاپیں گے۔ باسی خبریں اور باسی تصویریں ہمارے اخبار میں نہیں چھپتیں۔

شاعر: اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ یہاں تصویریں کھینچی جائیں گی تو میں منہ دھو کر آتا۔

فوٹوگرافر: آپ پریشان نہ ہوں۔ چھاپنے سے پہلے تصویر کا منہ دھلوا لیا جائے گا۔

شاعر: بے حد شکریہ۔ آپ نے مجھے بے جا زحمت سے بچا لیا۔

افسانہ نگار: فوٹوگرافر صاحب! اس کا خیال رکھئے گا کہ فلیش کی تیز روشنی میں میری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔

فوٹوگرافر: کوئی بات نہیں، تصویر دیکھنے والوں کی آنکھیں تو کھل جائیں گی بلکہ کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔

بھنگ: بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب تک ہم نے بڑی فکر انگیز گفتگو کی مگر اب ہمیں اپنے اصل موضوع پر بھی اظہار خیال کرنا چاہئے۔

نقاد: یہ تو بتا دیجئے کہ آج کی گفتگو کا موضوع کیا ہے؟

بھنگ: خدا جانے وہ کاغذ کہاں چلا گیا، جس پر موضوع لکھا تھا اور ایڈیٹر صاحب نے کچھ جملے بھی لکھ کر دیئے تھے جنہیں یہاں بطور ابتدائی کلمات گوش گزار کرنا تھا۔ محترمہ ناول نویس صاحبہ! میں نے آپ کی تصویر واپس کرتے ہوئے اس کے ساتھ کوئی کاغذ تو آپ کو نہیں دے دیا تھا۔

ناول نویس: آپ نے تصویر مجھے واپس نہیں کی۔ وہ آپ نے اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ ہاں ایک کاغذ مجھے دیا تھا جسے یہ سمجھ کر میں نے پرس میں رکھ لیا تھا کہ کوئی خط ہوگا، جسے گھر جا کر پڑھوں گی۔ لیجئے، آپ کا کاغذ یہ ہے۔

بھنگ: یہی تو وہ کاغذ ہے، جس کی مجھے تلاش تھی۔ ہاں تو آج کا موضوع گفتگو یہ ہے کہ کیا ادب پر بھی ٹیکس لگانا چاہئے؟ اس موضوع پر گفتگو کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ہماری عوامی حکومت نے زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے متعلق تمام چیزوں پر ٹیکس لگا دیا ہے یا بڑھا دیا ہے۔ ایک آزادیٔ تحریر باقی رہ گئی تھی، سو اسے بھی نشانے پر رکھ لیا ہے۔ کاغذ اور چھپائی کے سامان کے ساتھ ساتھ کتابیں، رسالے اور اخبارات بھی ٹیکس کی زد میں آ گئے ہیں۔ اہل نظر کی رائے یہ ہے کہ

حکومت اس وقت تک آزادیٔ تحریر پر پوری طرح قابو نہیں پا سکتی، جب تک ادب پر ٹیکس نہ لگایا جائے کہ تمام خرابیوں کا سرچشمہ یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب لکھنے والوں کو اپنی ہر تحریر پر ٹیکس ادا کرنا پڑے گا تو وہ لکھنے کی بجائے کوئی شریفانہ شغل اختیار کریں گے۔

نقاد: میری رائے میں صرف تخلیقی ادب پر ٹیکس لگنا چاہئے۔ تنقید پر نہیں کیونکہ تنقید ایک اصلاحی کام ہے اور جو کام معاشرے کے کسی شعبے کی اصلاح کے لئے کئے جائیں، ان پر ٹیکس لگانے سے معاشرے کی اصلاح کا کام متاثر ہوگا۔

سفرنامہ نگار: سفرناموں کی شمار بھی تخلیقی ادب میں نہیں ہوتا کیونکہ ہم لوگ تو دوسرے ملکوں کے معلوماتی کتابچوں کو اردو میں منتقل کرتے ہیں۔

افسانہ نگار: تخلیقی ادب پر اگر ٹیکس لگانا ہے تو صرف شاعری پر ٹیکس لگانا چاہئے۔ کیونکہ یہ بے کار کام ہمارے ہاں بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ ایک شاعر دن میں دس دس غزلیں لکھتا ہے جو کسی کام کی نہیں ہوتیں۔ ایسے بے مقصد شغل کی حوصلہ شکنی ہونی چاہئے تا کہ ردیاتِ ادب میں اضافہ نہ ہو سکے۔

شاعر: ردیاتِ ادب میں اضافہ تو افسانوں کی صورت میں بھی ہو رہا ہے۔

بھنگ: آپ لوگوں نے تو ذاتی لڑائی شروع کر دی۔ ہمیں اصولی باتوں تک اپنے آپ کو محدود رکھنا چاہئے۔ از راہ کرم آپ ایک دوسرے سے براہ راست گفتگو نہ کریں۔ صرف بھنگ چینل کے سوالوں کا جواب دیں۔ میں سب سے پہلے جناب نقاد سے پوچھنا چاہوں گا کہ ادب پر ٹیکس لگنا چاہئے یا نہیں۔

نقاد: ٹیکس ہی نہیں لگنا چاہئے، بلکہ خراب تحریروں پر جرمانے بھی ہونے چاہئیں، میں تو یہاں تک کہوں گا کہ تخلیقِ ادب کو قابل دست اندازیٔ پولیس ہونا چاہئے۔

بھنگ: کیا آپ کی مراد یہ ہے کہ پولیس کی دسترس ادب تک ہونی چاہئے، یعنی پولیس والوں کو بھی ادب پڑھنا چاہئے۔

نقاد: ہرگز نہیں۔ ہماری پولیس کم تنخواہ ملنے کی وجہ سے پہلے ہی ناگفتہ بہ حالات کا شکار ہے۔ ادب پڑھ کر تو وہ پولیس مقابلوں کے بھی لائق نہیں رہے گی۔ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ پولیس کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ خراب ادب لکھنے والوں کا چالان کر کے عدالت سے

انہیں سزا دلوائے۔

سفرنامہ نگار: اس قسم کے معاملات کو پولیس پر نہیں چھوڑنا چاہئے کیونکہ پولیس، مجرموں سے ساز باز کر کے بے گناہوں کو سزا دلوا دیتی ہے۔

محقق: سفرنامے لکھنے والے تو واقعی بے گناہ ہوتے ہیں کہ سفر کا گناہ کئے بغیر سفرنامے لکھ ڈالتے ہیں۔

بھنگ: خدا کا شکر ہے کہ آپ نے بھی اپنی زبان مبارک کو زحمت دی۔ اب جب کہ یہ ثابت ہو گیا کہ آپ بول بھی سکتے ہیں تو یہ فرمائیے کہ ادب پر ٹیکس لگانے کے سلسلے میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

محقق: میری رائے ہے کہ سوائے تحقیقی کاموں کے باقی ہر قسم کی تحریروں پر ٹیکس لگنا چاہئے۔

بھنگ: یہ عجیب بات ہے کہ ہر ادیب صرف اس صنفِ ادب پر ٹیکس لگانے کا حامی ہے، جس سے اس کا اپنا کوئی تعلق نہیں۔ محقق صاحب! یہ بتایئے کہ آپ کے کام پر ٹیکس کیوں نہ لگایا جائے؟

محقق: اس لئے کہ ہم لوگ ادیب نہیں ہیں۔ ہم تو ادیبوں کی پیدائش اور موت کا حساب رکھتے ہیں۔ اسی میں زندگی بسر کر دیتے ہیں کہ کون کب پیدا ہوا اور کب مرا۔

بھنگ: اس سے آپ کو کوئی فائدہ تو ہوگا۔ اور جس کام سے فائدہ ہو اس پر ٹیکس تو لگنا چاہئے۔

محقق: اس کام سے ہمیں تو کیا فائدہ ہوگا، ادیب ہی فائدے میں رہتے ہیں کہ ہماری متعین کردہ تاریخوں کے مطابق ان کے یوم پیدائش اور یوم وفات منائے جاتے ہیں۔

بھنگ: آپ تخلیقی ادب پر ٹیکس لگانے کے حامی کیوں ہیں؟

محقق: ادیب اس کثرت سے پیدا ہونے لگے ہیں کہ اس سے مستقبل کے محققوں کی مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔ تخلیقات پر ٹیکس لگانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ادیبوں کی تعداد خود بخود کم ہو جائے گی، بلکہ میں تو یہ تجویز پیش کروں گا کہ جس طرح کار چلانے اور گدھا گاڑی چلانے کے لئے مقررہ فیس ادا کر کے لائسنس حاصل کیا جاتا ہے، اسی طرح قلم چلانے کے لئے بھی لائسنس حاصل کرنے کا قانون نافذ کر دیا جائے۔ اس میں حکومت کا بھی فائدہ ہے اور ادب کا بھی۔ حکومت کو لائسنس فیس کے ذریعے خطیر رقم ملے گی اور ادب کو ان لوگوں سے نجات مل جائے گی جنہیں قلم چلانا نہیں آتا مگر چلائے جاتے ہیں۔

افسانہ نگار: مجھے اس تجویز سے سخت اختلاف ہے کہ ادیبوں پر یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ یہ جیسی

ڈرائیوروں اور کوچوانوں کی طرح لائسنس حاصل کریں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ حکومت شادی بیاہ اور بچوں کی پیدائش پر ٹیکس عائد کر دے تاکہ بچے کم پیدا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب بچے کم پیدا ہوں گے تو اسی نسبت سے ادیب بھی کم پیدا ہوں گے۔

بھنگ: میرے خیال میں یہ تجویز بہت عمدہ ہے اور اسی پر ہمیں یہ گفتگو ختم کر دینی چاہیے۔

شہزاد منظر کی کتاب
"پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال"

شہزاد منظر کی کتاب "پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال" اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مبارک باد کسے دی جائے۔ شہزاد منظر کو یا خود اپنے آپ کو۔ وہ مبارک باد کے اس لئے مستحق ہیں کہ کتاب انہوں نے لکھی ہے اور ہم اس لئے کہ ہم نے اسے اول سے آخر تک پڑھا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کتاب کا پڑھنا، اس کے لکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ تنقیدی کتاب لکھنا یوں آسان ہے کہ اس کے لئے صرف کاغذ، قلم اور ارادے کی ضرورت ہوتی ہے، جو باسانی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ کسی تنقیدی کتاب کا پڑھنا یوں مشکل ہے کہ اس کے لئے فالتو عقل درکار ہے۔ ہم جیسے لوگ جن کے پاس روز مرہ امور میں کام آنے والی عقل بھی بقدر اشکِ بلبل ہوتی ہے، فالتو عقل رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح کتاب ہم نے پڑھ ڈالی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اب مصنف کا سارا علم ہمارے پاس ہے، ہم تنقیدی مسائل پر نہ صرف گفتگو کر سکتے ہیں بلکہ ان میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ گویا اس علم سے مصنف کا یہ ایثار لائق تحسین ہے کہ وہ اپنا علم قاری کے حوالے کر دے اور خود تہی دست ہو کر کتاب کی اشاعت سے حاصل ہونے والی روکھی سوکھی شہرت پر گزارا کرے۔

علم کی بات چلی ہے تو ہم یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پاکستان کی اردو تنقید اور نقادوں کے بارے میں شہزاد منظر کی معلومات حیرت انگیز طور پر وسیع ہیں۔ گزشتہ نصف صدی کے تنقیدی ادب کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو ان کی نظر میں نہ ہو۔ انہیں نہ صرف ہر نقاد کا کچا چٹھا معلوم

ہے بلکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کون سی تنقیدی تحریر کب لکھی گئی اور ادب پر اس کے کیا اثرات ہوئے۔ شہزاد منظر کے علم کی وسعت کی ہم قسم کھا سکتے ہیں۔ گہرائی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ کسی دوسرے کے علم کی گہرائی کو ناپنے کے لئے جس علم کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ہمارے پاس تو کیا، خود شہزاد منظر کے پاس بھی نہیں ہے ورنہ ہم انہیں سے مستعار لے کر ایک اور جھوٹی قسم بھی کھا سکتے تھے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ شہزاد منظر کی زیر نظر تصنیف اپنے موضوع پر پہلی جامع کتاب ہے جسے اردو تنقید سے دلچسپی رکھنے والا کوئی شخص نظر انداز نہیں کر سکتا۔

کتاب کے شروع میں ایک طویل مقدمہ ہے جس میں مختلف ادبی تحریکوں کے زیر اثر پروان چڑھنے والی تنقید کا جائزہ لیا گیا ہے نیز مختلف تنقیدی دبستانوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں میں جو اہم مسائل اردو تنقید کا موضوع قرار پائے، ان کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں لیکن شہزاد منظر نے صرف معلومات جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جا بجا اپنی ذاتی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ ان کی رایوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک سوچنے والا ذہن اور پرکھنے والی نظر رکھتے ہیں، ورنہ ہمارے ہاں تنقید بالعموم ان دونوں چیزوں کے بغیر لکھی جاتی ہے۔ شہزاد منظر نے یہ ستم ضرور کیا ہے کہ اپنی رائے کو ''محاکمانہ تنقید'' کا نام دیا ہے۔ ''محاکمہ'' فیصلے کہتے ہیں۔ کسی نقاد کے عدالت کی کرسی پر بیٹھ جانا ایک ایسی ستم ظریفی ہے جس کی بنا پر توہین عدالت کا مقدمہ چل سکتا ہے۔

مقدمے کے بعد کتاب میں اختر حسین رائے پوری، ممتاز حسین، عزیز احمد، محمد حسن عسکری، سلیم احمد، مظفر علی سید اور محمد علی صدیقی جیسے ممتاز نقادوں پر الگ الگ مضامین ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ اعتراض کریں کہ ان نقادوں کے علاوہ بھی پاکستان میں کم از کم نصف درجن نقاد ایسے ہیں جن پر لکھے بغیر کتاب کے موضوع سے انصاف نہیں ہو سکتا۔ ان معترضین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کتاب کا دوسرا حصہ بھی لکھا جا رہا ہے، جس میں باقی ماندہ نقادوں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر حنیف فوق وغیرہ پر مضامین ہوں گے نیز کچھ پس ماندہ نقادوں یعنی نظیر صدیقی اور انیس ناگی وغیرہ کا تذکرہ ہوگا۔

شہزاد منظر جس ''محاکمانہ تنقید'' کے علم بردار ہیں، اسے اگر جرأت مندانہ تنقید کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے جرأت اور دلیری سے کام لیتے ہوئے اپنی رایوں کے اظہار میں کسی مصلحت کو روا نہیں رکھا۔ اختر حسین، رائے پوری، محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کے تنقیدی نظریات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں اور فکری تضادات پر بھی نظر رکھی ہے۔ وہ ان تینوں نقادوں کے علم و فضل کے قدر دان ہیں اور ان کی تنقیدی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن ان کی جن باتوں سے اختلاف ہے، ان پر سخت الفاظ میں تنقید بھی کرتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ شہزاد منظر کی اختلافی آراء کی کوئی اہمیت ہے یا نہیں، انہیں اس کی داد بہر حال ملنی چاہئے کہ وہ کسی بھی بڑے سے بڑے نقاد سے مرعوب نہیں ہوتے، اور اپنے علم کی حد تک جس بات کو درست سمجھتے ہیں، اس کا برملا اظہار کرتے ہیں۔

شہزاد منظر نے نقادوں کے عیب و ہنر بیان کرتے ہوئے محمد علی صدیقی کے ساتھ یہ امتیاز برتا ہے کہ ان کے صرف عیبوں کو شایانِ التفات سمجھا ہے۔ انہیں سب سے زیادہ شکایت اس کی ہے کہ محمد علی صدیقی ژولیدہ بیان ہیں اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں، وہ قاری کی فہم سے بالا ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''محمد علی صدیقی کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ بہت ہی پڑھے لکھے اور وسیع المطالعہ ناقد ہیں اور انہوں نے مشرق و مغرب کے تمام علوم و فنون کو گھول کر پی لیا ہے...... یہ تاثر ان کے مضامین کے عنوانات سے بھی ہوتا ہے۔ جن کا عام قاری پر ابلاغ ہو نہ ہو، رعب ضرور پڑتا ہے اور وہ جب ان مضامین کو پڑھتا ہے اور مصنف کی ژولیدہ بیانی اور گنجلک طرزِ اظہار کے باعث اس کے کچھ پلے نہیں پڑتا تو وہ اور بھی مرعوب ہو کر اپنے تئیں خود کو کند ذہن تصور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر کوئی بات صاف اور واضح طور پر کہنے کی بجائے بہت مبہم اور پیچیدہ انداز میں کہی جائے اور اس کا ابلاغ مشکل ہو تو قارئین احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر ان کی بے پناہ علمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔''

اس اقتباس سے محمد علی صدیقی سے زیادہ ان کے قارئین کے عیوب سامنے آتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو قاری خود کو کند ذہن سمجھتا ہے اور بات بات پر احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسے محمد علی صدیقی کی تحریریں پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس کند ذہن قاری کے ہمدرد اور غم گسار شہزاد منظر بخوبی جانتے ہیں کہ ادب، کسی اخبار میں چھپنے والی خبر نہیں ہوتا جو بیک نظر سمجھ میں آ جائے۔ اس کے لئے ایک خاص ذہنی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک خاص سطح کا علم درکار ہوتا ہے۔ کیا غالب اور بیدل کے دیوانوں کو اس لئے سوختنی قرار دیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں

شاعروں کے بہت سے شعر بعض قارئین تو کیا نقادوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ محمد علی صدیقی کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ جن موضوعات پر لکھتے ہیں، ان پر کوئی دوسرا نقاد نہیں لکھتا۔ اس لئے اردو میڈیم قاری یا نقاد کو ان کی تحریریں مشکل نظر آتی ہیں۔ نئے خیالات اپنے ساتھ نئی زبان بھی لے کر آتے ہیں۔ یہ بات جن لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے انہیں محمد علی صدیقی کی تحریروں سے اجتناب کرنا چاہئے اور صرف دت بھارتی اور ایم اسلم کے ناول پڑھنے چاہئیں۔

ژولیدہ بیانی کے مضمون کو شہزاد منظر نے سو رنگ سے باندھا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''محمد علی صدیقی گنجلک زبان لکھنے میں پہلے ہی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ژولیدہ بیانی کے باعث ادبی موضوعات پر ان کے مضامین کی تفہیم پہلے ہی مشکل تھی اس پر لسانیات کے موضوع پر ان کے مضامین نے ناقابل ابلاغ اور ناقابل فہم ہونے کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ ان مضامین کی خوبی یہ ہے کہ ان میں یکے بعد دیگرے ماہرین لسانیات اور فلاسفہ کے نام آتے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مصنف نے جن مشاہیر کا حوالہ دیا ہے، انہوں نے لسانیات کے میدان میں کیا کارنامہ انجام دیا ہے یا ان کا نظریہ کیا ہے؟

لسانی مضامین محمد علی صدیقی کے ہوں یا کسی اور کے، عموماً کم ہی سمجھ میں آتے ہیں۔ لسانیات بڑا موذی علم ہے جو ہلکی پھلکی تحریریں پڑھنے والوں پر اپنے راز منکشف نہیں کرتا۔ محمد علی صدیقی کے مضامین سمجھ میں نہ بھی آئیں تو قاری کو ان کا ممنون ہونا چاہئے کہ کچھ ماہرین لسانیات کے نام تو کان میں پڑ جاتے ہیں۔ بحث و مباحثے کے لئے اتنا علم بھی کافی ہے۔ محمد علی صدیقی اگر تنقید کی بجائے پرائمری جماعتوں کے لئے نصابی کتابیں لکھنا شروع کر دیں تو شاید شہزاد منظر کو ان سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

محمد علی صدیقی نے اپنے کسی مضمون میں بنگالی مصنف سرت چندر چیٹر جی کا نام غلطی سے سرت چندر بوس لکھ دیا تھا۔ شہزاد منظر اس غلطی کی نشان دہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''محمد علی صدیقی نہ بنگلہ زبان و ادب سے واقف ہیں، نہ بنگلہ ادب کی تاریخ سے۔'' خود شہزاد منظر کا حال یہ ہے کہ انہوں نے کتاب میں کئی جگہ محمد دین تاثیر کو دین محمد تاثیر اور سرور جہاں آبادی کو سرور شاہ جہانپوری لکھا ہے۔ کیا ان غلطیوں کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موصوف اردو زبان و ادب سے ناواقف ہیں؟ یہی نہیں انہوں نے مشہور مورخ اور ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر احمد حسن دانی کو 'اردو کے

مشاہیر اہل قلم'' میں شمار کیا ہے۔ کیا اس لاعلمی کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہزاد منظر صاحب علم نہیں ہیں؟ وہ ایسی ہزاروں غلطیاں بھی کریں تو ان کے علم میں کمی نہیں ہو سکتی، ہاں پڑھنے والوں کے علم میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

شہزاد منظر نے ایک الزام یہ بھی عائد کیا ہے کہ محمد علی صدیقی کے بعض مضامین کے عنوانات مضامین کے متون سے مطابقت نہیں رکھتے۔ عنوان کچھ ہوتا ہے اور مضمون کچھ۔ جناب معترض کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ مضامین کی بات کر رہے ہیں، لوگ تو پوری پوری کتابوں کے گمراہ کن نام رکھتے ہیں۔ شہزاد منظر کی زیر نظر کتاب ۱۹۹۶ء میں چھپی تھی، اس وقت پاکستان کے قیام کو انچاس برس گزرے تھے۔ اس مناسبت سے کتاب کا نام ''پاکستان میں اردو تنقید کے انچاس سال'' ہونا چاہئے تھا مگر یک جنبش قلم انچاس کو پچاس کر دیا گیا۔ محتاط لوگ تو محاورۃً بھی انیس بیس کا فرق روا نہیں رکھتے لیکن شہزاد منظر نے انچاس کے فرق کے بھی نظر انداز کر دیا۔

کچھ عرصہ قبل شہزاد منظر نے محمد علی صدیقی کے ایک مضمون پر کسی رسالے میں تبصرہ لکھا تھا۔ اس کے حوالے سے وہ زیر نظر کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں: ''تنقید نگاری میں بھی ہم مصلحت پسندی کے عادی ہیں اور بری اور گھٹیا تصنیف کو گھٹیا کہنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ اگر کوئی ناقد ایسا کرتا ہے تو مصنف سے لے کر مدیر تک سے اس کے تعلقات بگڑ جاتے ہیں۔ ایسے عالم میں سچ بول کر تعلقات کو بگاڑنے کا خطرہ کون مول لے گا؟ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ میں نے محمد علی صدیقی کے ایک مضمون کی بعض کوتاہیوں کی نشان دہی کی تو ان سے مراسم بگڑ گئے۔ حالانکہ میں نے ان کی کتابوں پر لکھے ہوئے تبصروں اور اپنے انٹرویوز میں ان کی مکمل تعریف کی ہے، لیکن وہ میری محاکمانہ تنقید برداشت نہ کر سکے۔ میں نے اپنے مضمون میں کوئی ایسی بات نہیں لکھی تھی جو ان کے شان یا مرتبے کے خلاف ہو یا جس سے توہین کا پہلو نکلتا ہو۔ میں نے ان سے صرف اختلاف کیا تھا اور ان سے بعض ناقدین کے بارے میں سرزد ہونے والی ناانصافیوں کی شکایت کی تھی۔''

معلوم ہوتا ہے، زیر نظر کتاب میں شامل مضمون تعلقات کو مزید بگاڑنے کے لئے لکھا گیا ہے۔ ایسی ''محاکمانہ تنقید'' کس کام کی، جس سے تعلقات خراب ہوں۔ پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔

”شہاب نامہ“ کا مقصد اخفائے ذات ہے

(۱)

خدا بخشے قدرت اللہ شہاب بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ تین سربراہانِ مملکت کے سیکرٹری کی حیثیت سے وہ ہمارے قومی زوال کے قریب ترین تماشائی ہی نہیں، جزوِ تماشا بھی تھے۔ ان کے مزاج میں بے حد لچک تھی۔ غلام محمد جیسا مغرور اور نیم دیوانہ ہو یا اسکندر مرزا جیسا عیش پسند یا ایوب خاں جیسا خود پسند، وہ سب کے اعتماد پر پورے اترے۔ ان آمروں اور جمہوریت کے دشمنوں کو پوری سول سروس میں قدرت اللہ شہاب ہی قابلِ التفات نظر آئے کہ وہ یکے بعد دیگرے انھیں اپنے قرب سے نوازتے رہے۔ بس ایک یحییٰ خان سے ان کی نہ نبھ سکی جس کا سبب یحییٰ خان تھے نہ خود قدرت اللہ شہاب، بلکہ ایک تیسرے صاحب جنرل پیرزادہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے علاوہ کوئی اور یحییٰ خان کے مزاج میں دخیل ہو۔ یحییٰ خان کے دورِ حکومت کا مختصر عرصہ شہاب صاحب نے خود اختیاری جلاوطنی میں بسر کیا۔ لیکن جب عنانِ اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھ آئی تو شہاب صاحب دوبارہ ”بندۂ بارگاہِ سلطان“ بن گئے۔ اب کے وہ صرف تماشائی تھے، جزوِ تماشا نہ تھے۔ جنرل ضیاء الحق راج سنگھاسن پر بیٹھے تو انھوں نے بھی قدرت اللہ شہاب کو کاروبارِ حکومت میں شریک کرنا چاہا لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ موصوف دنیا کی محفلوں سے اُکتا چکے تھے، اس لیے انھوں نے گوشہ نشینی میں عافیت دیکھی..... آخر شہاب صاحب میں کوئی تو خاص الخاص قسم کی خوبی ہوگی جس کی بنا پر وہ ایک دو نہیں، اکٹھے پانچ سربراہانِ مملکت کے منظورِ نظر رہے اور یہ سربراہ وہ تھے جن میں سے ہر ایک نے اپنے سے پہلے سربراہ کا تختہ اُلٹا تھا۔

شہاب صاحب کے کردار کا یہ پہلو قابلِ ستائش ہے کہ وہ اُن معدودے چند اعلیٰ سرکاری عہدیداروں میں سے تھے جنھوں نے اپنے اختیارات سے کوئی مادّی فائدہ نہ اٹھایا۔ غیر قانونی تو کیا ”قانونی بدعنوانیاں“ سے بھی ان کا دامن پاک ہے (حالانکہ ”قانونی بدعنوانیاں“ ہمارے ملک میں سرکاری ملازمت کا لازمی جزو ہیں۔ مثلاً زمین سستی حاصل کر کے مہنگے داموں بیچ دینا، اپنے نااہل عزیزوں کو اچھی ملازمتیں دلوانا وغیرہ)۔ انھوں نے ہمیشہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے۔ یعنی صرف اپنی تنخواہ پر گزارا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال کے وقت انھی کے نہیں، ان کے پس ماندگان کے بھی دونوں ہاتھ خالی تھے۔

اگر کوئی سرکاری عہدیدار ادب کا معمولی سا ذوق بھی رکھتا ہو تو اس کے لیے ادیب بن جانا کچھ مشکل نہیں۔ اس کے عہدے کی مناسبت سے اس کی ادبی حیثیت متعین ہوتی ہے۔ جتنا بڑا عہدیدار ہوگا۔ اتنا ہی بلند اس کا ادبی مقام ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے عہدیدار ملازمت اور ادب سے بیک وقت ریٹائر ہو جاتے ہیں اور انتقال سے بہت پہلے ان کی ادبی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ہم نے بہت سے ایسے ادیبوں کو دیکھا ہے جو اپنے سرکاری عہدوں کی وجہ سے اپنی معمولی قسم کی کتابوں پر درجنوں اہلِ قلم سے تعریفی و توصیفی مضامین لکھواتے ہیں اور سرکاری ذرائع ابلاغ کو اپنی تشہیر کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ ادیب جب اپنے عہدوں سے محروم ہو جاتے ہیں تو ان کی بے کسی پر کوئی آنسو بہانے والا بھی نہیں ملتا۔ شہاب صاحب اس معاملے میں بے حد محتاط تھے۔ انھوں نے اپنی ادبی حیثیت منوانے کے لیے کبھی اپنے عہدے سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سرکاری حیثیت کی وجہ سے ان کی ادبی حیثیت کو نقصان پہنچا اور ”ترقی پسندوں“ نے تو ان کے خلاف محاذ آرائی بھی کی۔ کسی کتاب کی رونمائی تو بڑی بات ہے، انھوں نے کبھی کسی کو اپنی کوئی کتاب تبصرے کے لیے بھی نہیں دی۔ انکسار کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی ان کے سامنے ”یا خدا“ یا ”ماں جی“ کی تعریف کرتا تو وہ شرما جاتے۔ ایسی اعلیٰ ظرفی بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔

شہاب صاحب کی ادبی فتوحات کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ چند افسانے، چند ڈرامے اور ایک ناولٹ۔ لیکن جہاں تک معیار کا تعلق ہے، شہاب صاحب ان لکھنے والوں میں سے ہیں جنھیں کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور کچھ نہیں تو ”یا خدا“ کے مصنف کے طور پر ان کا نام زندہ رہے گا۔ اور اب ”شہاب نامہ“ کی اشاعت کے بعد مرحوم کے ادبی قد و قامت میں مزید اضافہ ہوگا۔

"شہاب نامہ" مرحوم کی خودنوشت سوانح عمری ہے جو گیارہ سو اکیاسی صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک انتہائی دلچسپ کتاب ہے لیکن اس میں شبہ ہے کہ یہ آپ بیتی ہے۔ آپ بیتی انکشافِ ذات کے لیے لکھی جاتی ہے لیکن "شہاب نامہ" کا مقصد اخفائے ذات ہے۔ اس کتاب میں بہت کچھ ہے لیکن وہ سب کچھ نہیں جس سے مصنف کی صحیح تصویر سامنے آتی۔ یہی بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ صیغۂ متکلم میں لکھی ہوئی اس کتاب میں خود متکلم ہی بڑی حد تک غائب ہے۔ شہاب صاحب نے اپنے گرد و پیش پر زیادہ توجہ صرف کی ہے اور اپنے آپ کو پس منظر میں رکھا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ منظر اور پس منظر میں کوئی مقام اتصال نظر نہیں آتا۔ کتاب کے مطالعے کے دوران بیشتر جگہ قاری کو یہ یاد نہیں رہتا کہ وہ کوئی آپ بیتی پڑھ رہا ہے یا کوئی ایسی کتاب جس میں ایک خاص دور کے حالات یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ بیچ بیچ میں ذاتی حوالے ضرور آتے ہیں لیکن مصنف کے افسانوی اندازِ بیان کی وجہ سے یہ حوالے بھی افسانہ و افسوں کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں۔

دراصل بات یہ ہے کہ شہاب صاحب بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔ ان میں واقعہ تخلیق کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی اور پھر واقعے کو بیان کرنے کا ڈھنگ ایسا تھا کہ ان کا لکھا ہوا جھوٹ بھی سچ نظر آتا تھا۔ زیرِ نظر کتاب میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یعنی افسانوی اندازِ بیان کی وجہ سے سچ بھی "چیزے دیگر" نظر آتا ہے۔ خدانخواستہ اس سے یہ مراد نہیں کہ شہاب صاحب نے جھوٹی باتیں لکھی ہیں، عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچ کو بھی ایسے افسانوی انداز سے بیان کرتے ہیں کہ قاری مسحور تو ہو جاتا ہے، لیکن اس کا یقین متزلزل ہو جاتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ کسی افسانہ خواں کو وقائع نگاری نہیں کرنی چاہیے کیونکہ جس طرح وہ افسانوی واقعات میں تراش خراش کر کے انھیں بہتر سے بہتر صورت میں پیش کرتا ہے، اسی طرح وہ اصلی واقعات میں بھی "فنی ضروریات" کے تحت کمی بیشی کر لیتا ہے۔ یہ عمل شعوری نہیں، لاشعوری ہوتا ہے۔ لکھنے والے کو اس کا کامل یقین ہوتا ہے۔ حقیقت صرف وہی ہے جو اس کے احاطۂ بیان میں آئی ہے۔

جو لوگ "شہاب نامہ" کو کتاب الواقعات سمجھ کر پڑھیں گے، وہ کچھ زیادہ خوش نہیں ہوں گے کیونکہ انھیں بے شمار واقعات افسانوی نظر آئیں گے۔ لیکن جو لوگ اسے ناول سمجھ کر پڑھیں گے وہ مصنف کو اس بات کی داد دیں گے کہ اس نے طلسم ہوش رُبا جیسی داستان تخلیق کی ہے جو

خیالی نہیں ہے، جس کے کردار فرضی نہیں ہیں اور جس کا ماحول اجنبی نہیں ہے۔

شہاب صاحب نے دیباچے میں اس کتاب کے لکھے جانے کی جو وجوہ بیان کی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے:

"بعض مفروضوں کی بنا پر میرے ماتھے پر کچھ ایسے کلنک کے ٹیکے لگ چکے ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مثلاً میرے محترم اور مہربان بزرگ ابوالاثر حفیظ جالندھری نے کسی شاعرانہ موڈ میں کہا تھا:

جب کہیں انقلاب ہوتا ہے
قدرت اللہ شہاب ہوتا ہے

اس شعر کا بہت چرچا ہوا اور یہ تاثر دیا گیا کہ وطنِ عزیز میں "انقلاب" کی آڑ میں جتنی غیر جمہوری کارروائیاں ہوتی رہی ہیں، ان سب میں میرا کچھ نہ کچھ ہاتھ تھا۔"

اس اقتباس کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ "شہاب نامہ" دراصل ایک بیانِ صفائی ہے جس میں "ملزم" نے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش کہاں تک کامیاب رہی ہے، اس پر ہم آئندہ گفتگو کریں گے۔

(۱۷؍ اگست ۱۹۸۷ء)

(۲)

قدرت اللہ شہاب مرحوم پر جو الزامات عام طور پر عائد کیے جاتے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے پاکستان رائٹرز گلڈ قائم کر کے ادیبوں کو ایوب خانی مارشل لاء کے قدموں میں لا بٹھایا۔ ادبی انعامات اور تفریحی دوروں کے سبز باغ دکھا کر ادیبوں کو حکومت کی محاسن شماری کے کام پر لگا دیا۔ اس سے بعض ادیبوں کو چھوٹے چھوٹے فوائد ضرور حاصل ہوئے لیکن اس کاروبار کا خالص منافع صرف قدرت اللہ شہاب کے حصے میں آیا۔ حکومت کی نظر میں ان کا وقار بڑھا۔ سول سروس میں انھیں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوئی۔ ان کی ایک جنبشِ ابرو پر سینکڑوں ادیبوں کا حکومت سے غیر مشروط وفاداری کا اعلان آخر کوئی معمولی کارنامہ تو نہیں تھا!

گلڈ کو پہلے ہی دن سے شک و شبہ کی نظر سے دیکھا گیا جس کی فوری وجہ یہ تھی کہ قدرت اللہ شہاب سمیت جن آٹھ ادیبوں کے دستخطوں سے ادیبوں کا کنونشن بلانے کا اعلان نامہ جاری ہوا

تھا، ان میں سے ایک (ضمیر الدین احمد) کے سوا باقی سب سرکاری ملازم تھے اور یہ ایک صاحب بھی اعلان نامے پر دستخط کرنے کے بعد غائب ہو گئے۔ ایک ایسے زمانے میں جب انجمنوں اور اداروں پر طرح طرح کی پابندیاں عائد تھیں، سرکاری ملازموں کی طرف سے کسی نئے ادارے کے قیام کی کوشش کا مطلب یہ تھا کہ “گلڈ” بھی ایک سرکاری منصوبہ ہے۔

شہاب صاحب نے “شہاب نامہ” میں اعتراف کیا ہے کہ گلڈ نے ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو منصوبے بنائے تھے، وہ سب ناکام ہو گئے، لیکن گلڈ کا اصل اثاثہ عزتِ نفس کا وہ احساس ہے جو اس کے ذریعے ادیبوں میں پیدا ہوا۔ حالانکہ اصل صورتِ حال یہ ہے کہ گلڈ کی وجہ سے ادیبوں کی ایک بڑی تعداد عزتِ نفس کے احساس ہی سے محروم ہو گئی۔ ادیبوں کی خرید و فروخت کا کام جس بڑے پیمانے پر ہوا، اس کی پہلے سے کوئی مثال موجود تھی، نہ بعد میں سامنے آئی۔ لیکن شہاب صاحب اس کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے:

“ادھر گلڈ قائم ہوا، ادھر بریگیڈیئر ایف آر خان کی رال اس ادارے پر بری طرح ٹپکنے لگی۔ یہ صاحب اس زمانے میں مارشل لاء کے روحِ رواں سمجھے جاتے تھے اور بزعمِ خود صدر ایوب کے لیے وہی خدمات سرانجام دینے کے لیے بے چین تھے جو ڈاکٹر گوئبلز نے ہٹلر کے لیے انجام دی تھیں۔ عہدے کے لحاظ سے وہ وزارت اطلاعات و نشریات کے سیکرٹری تھے، لیکن اثر و رسوخ کے اعتبار سے وہ صدر ایوب کو چھوڑ کر باقی سب وزیروں، گورنروں اور اعلیٰ حکام پر دھونس جما کر انھیں اپنی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور کرنا، اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو برملا فوجی حکومت کا “دماغ” سمجھتے تھے اور کسی نہ کسی طریقے سے اس کا اعلان بھی فرماتے رہتے تھے۔ دماغ تو خیر اُن کا اتنا ہی بڑا تھا جتنا کہ ایک عام انسان کا ہوتا ہے، لیکن ان کا ایک خاص ملکہ یہ تھا کہ وہ دوسروں کے دماغ کرید کرید کر اُن کے خیالات کو اپنے استعمال میں لانے کے بادشاہ تھے۔ وزارت اطلاعات و نشریات کا چارج لیتے ہی انھوں نے بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن (ادارۂ قومی تعمیرِ نو) کے نام سے ایک نیا ادارہ قائم کر لیا تھا جس کا مقصد قوم کی سوچ کو حکومت کی سوچ کے ساتھ ہم آہنگ کرنا تھا۔ جب گلڈ قائم ہوا تو بریگیڈیئر ایف آر خان سچ مچ یہی سمجھے کہ میں نے نہایت چالاکی سے ان کے نہلے پر دہلا مار دکھایا ہے اور گلڈ کے پردے میں ایک ایسا دھوبی گھاٹ بنا ڈالا ہے جہاں پاکستان بھر کے سارے چھوٹے بڑے ادیب حکومت کی تال پر [illegible]

کر کے قوم کے اجتماعی دماغ کو حسبِ فرمائش اور حسبِ خواہش سرکاری صابن سے دھونے کا فریضہ سرانجام دیا کریں گے۔ میرے اس کارنامے پر انھوں نے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا اور اس ادارے کو اپنے طور پر کام میں لانے کے لیے پہلے تو ترغیب و تحریص کے روپہلی اور سنہری باغ دکھانے کی کوشش کی، جب یہ مؤثر ثابت نہ ہوئے تو انھوں نے اپنے معمول کے مطابق زور آزمائی کا طریقہ اختیار کیا اور مختلف طور طریقوں سے میرا بازو توڑنے مروڑنے کا عمل شروع کیا۔ لیکن عرصہ بعد انھیں محسوس ہوا کہ میرا بازو بھی ربڑ کا بنا ہوا ہے جو نہ چٹختا ہے نہ کھٹکتا ہے نہ ٹوٹتا ہے۔ اس کے بعد بریگیڈیئر ایف آر خان نے اپنا رویہ بدل لیا اور اس نے اب اسی بات پر قناعت کر لی کہ وہ ہمارے گلڈ کے دفاتر سے ممبروں کی فہرست حاصل کرتا رہتا اور بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن کے نمائندے ایسے ادیبوں کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے جو معاوضہ لے کر حکومت کی مرضی کے مطابق کچھ مضامین یا پمفلٹ اُردو، بنگالی، انگریزی اور دوسری علاقائی زبانوں میں لکھنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ صدر ایوب کے آئین اور بنیادی جمہوری نظام کی تشہیر میں ان عناصر نے بریگیڈیئر ایف آر خان سے معاوضہ لے کر خاصا کام کیا۔ یہ عناصر گلڈ نے پیدا کیے تھے نہ گلڈ کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ ادیبوں کی برادری میں ایسا بکاؤ مال ہر دور میں موجود رہا ہے اور رہے گا۔ گلڈ کی رکنیت ان کے لیے کوئی رکاوٹ ہے نہ اعانت۔”

اس اقتباس سے شہاب صاحب کے ایک ماہر افسانہ نگار ہونے کا ثبوت تو ملتا ہے، لیکن جہاں تک حقیقت نگاری کا تعلق ہے، خدا مغفرت کرے، مرحوم نے اس کا حق ادا نہیں کیا۔ سب سے پہلے تو یہی درست نہیں کہ بریگیڈیئر ایف آر خان اور شہاب صاحب میں اشتراکِ عمل نہیں تھا۔ ایک عرصے تک گلڈ کی حیثیت صرف اتنی تھی کہ وہ نیشنل ری کنسٹرکشن بیورو کا تابع مہمل تھا۔ یہ دونوں ادارے ایک ہی انداز سے سرگرم تھے۔ فرق یہ تھا کہ بیورو اپنے مقصد کا کھلم کھلا اعلان کرتا تھا اور گلڈ نے اپنے مقصد پر ادیبوں کی فلاح و بہبود کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ بریگیڈیئر ایف آر خان نے جب مشہورِ زمانہ “پاک جمہوریت ٹرین” چلائی تھی تو اس میں شہاب صاحب سمیت نہ صرف گلڈ کے عہدیدار بلکہ متعدد ایسے ادیب بھی شامل تھے جن کا شمار شہاب صاحب کے حواریوں میں ہوتا تھا۔

بریگیڈیئر ایف آر خان نے صدر ایوب کے آئین اور بنیادی جمہوریتوں کے نظام پر

'' بکاؤ '' ادیبوں سے ضرور کام لیا ہوگا۔ لیکن اس سلسلے میں خود شہاب صاحب نے بھی کچھ کم مستعدی نہیں دکھائی۔ انھوں نے نہ صرف ادیبوں سے بنیادی جمہوریتوں اور صدر ایوب کے آئین کے بارے میں مضامین لکھوائے بلکہ خاص ادبی رسالوں کے خصوصی نمبر بھی شائع کرائے۔ '' ساقی ''، '' نقوش '' اور '' افکار '' جیسے رسالوں میں صدر ایوب کی تعریف میں مضامین شائع ہوئے۔ ان تمام رسالوں اور ادیبوں کو صدر کے خصوصی فنڈ سے معقول معاوضہ ادا کیا گیا۔ رقم کی ادائگی ابن انشاء مرحوم کے ذریعے ہوئی۔ ظاہر ہے ابن انشاء کو یہ رقم بریگیڈیر ایف آر خان نے نہیں دی ہوگی اور اگر دی بھی ہوگی تو شہاب صاحب کے علم کے بغیر دی ہوگی ---------

(۱۰ر ستمبر ۱۹۸۷ء)

(۳)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ '' شہاب نامہ '' ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ اسے اگر ایک مرتبہ پڑھنا شروع کر دیا جائے تو پھر ختم کیے بغیر کوئی دوسرا کام نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی نظر میں اس کی ضخامت خوفزدہ کرتی ہے لیکن کتاب ختم کرتے وقت جی چاہتا ہے کہ یہ لذیذ داستان کچھ اور دراز ہوتی۔ شہاب صاحب نے جن حالات میں اور جس انداز سے زندگی گزاری ہے، ان حالات میں اور ایسے انداز سے زندگی بسر کرنے کا موقع کم لوگوں کو ملتا ہے۔ انھوں نے پاکستان کی تاریخ کو نہایت قریب سے بنتے اور بگڑتے دیکھا ہے۔ ان کے مشاہدات و تجربات کے آئینے میں ایک فرد کی ذات ہی کو نہیں، ایک پورے دور کی روح کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

'' شہاب نامہ '' میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان کی صحت کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب کے ذریعے شہاب صاحب ایک عظیم خاکہ نگار اور ایک عظیم تر افسانہ نگار کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

'' شہاب نامہ '' کے صفحات پر بے شمار شخصیات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اگر شخصیات کے تذکروں کو الگ کر لیا جائے تو شخصی خاکوں کا ایک نہایت عمدہ مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ شہاب صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی بھی شخصیت کے ظاہر ہی کو نہیں دیکھتے، باطن میں بھی جھانکتے ہیں۔ اور جہاں وہ طنز و مزاح سے کام لیتے ہیں یا ذاتی پسند اور ناپسند کو معیار بنا کر لکھتے ہیں، تو متعلقہ شخصیت کا حسن کچھ اور نکھر جاتا ہے۔ مثلاً جنرل پیرزادہ کی قلمی تصویر انھوں نے اس طرح کھینچی ہے:

'' یحییٰ خان نے برسرِ اقتدار آنے کی باضابطہ منصوبہ بندی شروع کر دی۔ اس جوڑ توڑ کو پروان چڑھانے کے لیے اُسے بڑی آسانی سے ایک سدھا سدھایا بھاڑے کا ٹٹو بھی پاس ہی مل گیا۔ اس شخص کا نام میجر جنرل ایس جی ایم ایم پیرزادہ تھا۔ جس زمانے میں وہ صدر ایوب کا ملٹری سیکرٹری بن کر آیا تھا، اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر وقت بلاوجہ مسکرانے کی کوشش میں رہا کرتا تھا۔ ریاکاری کے اس رندے نے اس کے چہرے پر دو ایسی مستقل سلوٹیں تراش رکھی تھیں کہ دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی کا منھ چڑھا رہا ہے۔ یوں بھی اس کے کان کی لوؤں اور چہرے بشرے کے مساموں سے تملق، روباہی، چکمہ سازی، حیلہ گری اور بچر بچر کا گدلا سا لعاب اس طرح رس رس کر ٹپکتا تھا جیسے چیڑ کے تنے سے لٹکتے ہوئے بدھنے میں لیس دار گندہ بیروزہ قطرہ قطرہ پھسل کر گرتا ہے۔ کبھی کبھی جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوتا تھا تو خبثِ باطن کا تعفن پھٹتے ہوئے گٹر کی سڑاند کی مانند چاروں طرف پھیل جاتا تھا اور بے اختیار جی چاہتا تھا کہ لپک کر بہت سی کھڑکیاں کھول دی جائیں اور باہر کی صاف ہوا کو اندر آنے دیا جائے۔''

شہاب صاحب کی افسانہ نگاری کا کمال یوں تو کتاب کے ہر صفحے سے ظاہر ہے، لیکن اس سلسلے میں تین باب خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک باب تو وہ ہے جس میں انھوں نے لاہور میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں چندراوتی نامی لڑکی سے اپنے معاشقے کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اتوار کے اتوار وہ ایک بائیسکل کرائے پر لیتے اور چندراوتی کو اپنے ساتھ بٹھا کر لاہور اور مضافات لاہور کی تاریخی عمارتوں کو دیکھنے جایا کرتے تھے، اور جب انھوں نے اس مقصد کے لیے ایک بائیسکل خرید لیا تو پھر بقول خود:

'' اب لاہور تھا اور میرا بائیسکل۔ کسی ٹریفک سارجنٹ نے بھی اتنی گشت نہیں کی ہوگی جتنا کہ ہم دونوں نے لاہور کے گلی کوچوں کو کھنگال ڈالا۔''

یہی نہیں ایک روز شہاب صاحب چندراوتی کو لے کر لاہور سے ستائیس میل کے فاصلے پر ایمن آباد گئے۔ وہاں سارا دن رہے۔ تیسرے پہر وہاں سے روانہ ہو کر رات سے پہلے لاہور واپس آ گئے۔ ۲۷ میل آنے کے اور ۲۷ میل جانے کے، کل ۵۴ میل ہوئے۔ اتنا فاصلہ اتنی تیزی

سے بائیسکل پر حملے کرنا مبالغہ آرائی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ بقول شہاب:

"بائیسکل کے پیڈل اس طرح گھومتے تھے جیسے دھنکی ہوئی روئی کے گالے ہوا میں اڑ [illegible] ہیں۔"

چندراوتی اُردو کے افسانوی کرداروں میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

دوسرا باب وہ ہے جس کا عنوان "بملا کماری کی بے چین روح" ہے۔ اس میں شہاب صاحب نے عجیب وغریب اور سنسنی خیز واقعات بیان کیے ہیں۔ جن دنوں وہ کٹک میں تھے [illegible] رہائش کے لیے ایک آسیب زدہ مکان ملا۔ مضبوط سے مضبوط اعصاب کا انسان بھی اس مکان سے بھاگ نکلتا۔ لیکن شہاب صاحب کی ہمت ہے کہ نہ صرف وہاں جمے رہے بلکہ مافوق الفطرت عناصر پر قابو پانے کی مسلسل کوشش کرتے رہے اور بالآخر کامیاب ہوئے۔ اس مکان میں جو واقعات پیش آئے، وہ کس قسم کے تھے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل دو واقعات سے کیا جا [illegible]

۱۔ "ان دنوں میرے پاس ساگوان کی لکڑی کا بہت بڑا ڈائننگ ٹیبل تھا جس کا وزن [illegible] من ہوگا۔ ایک رات کوئی چیز لینے کے لیے میں نے ڈائننگ روم کی الماری کھولی تو [illegible] ہوا ایک باریک سانپ بل کھاتا ہوا اُچھل کر میرے پاؤں پر آ گرا۔ ساتھ ہی الماری میں [illegible] ہوئے چینی کے برتن کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اُڑن طشتریوں کی طرح میز پر آ جمع ہوئے۔ اس کے بعد ڈائننگ ٹیبل آہستہ آہستہ ہوا میں اٹھنا شروع ہوا اور اس قدر بلند ہو گیا کہ اس کے اوپر [illegible] ہوئے چینی کے برتن ٹن ٹن کر کے بجلی کے پنکھے کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ پنکھے کو چھو کر میز [illegible] دھڑام کر کے زمین پر آ گیا۔ اس کا ایک پایہ میرے بائیں پاؤں کے انگوٹھے پر اس زور سے [illegible] کہ انگوٹھے کا کچھ حصہ آج تک بے حس ہے۔"

۲۔ "ایک روز بڑی تیز بارش ہو رہی تھی۔ رات کے دو بجے میرے بیڈ روم کے باہر [illegible] بائیسکل کی گھنٹی بجی اور پھر آواز آئی: "تار والا۔ تار والا"۔ میں نے دروازے کی درز [illegible] واقعی باہر تار والا کھڑا تھا۔ اس نے خاکی وردی پہنی ہوئی تھی۔ سر پر جھالر والی خاکی ٹوپی [illegible] میں چمڑے کا تھیلا لٹکا ہوا تھا اور وہ سرخ مڈگارڈ والے بائیسکل کے ساتھ لگ کر [illegible] ماحول میں ایک جیتے جاگتے انسان کو اپنے لان میں دیکھ کر میرا دل بہت مطمئن ہوا۔ [illegible] دروازہ کھول کر برآمدے میں آ گیا۔ تار والے نے مجھے سلام کیا۔ اپنی کاپی میں [illegible]

ہوئی پنسل نکالی اور تھیلے سے تار کی رسید کا فارم نکال کر مجھے دیا۔ میں نے فارم پر دستخط کر کے واپس کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو میرے سامنے تار والے کی جگہ انسانی ہڈیوں کا ایک خوفناک ڈھانچہ کھڑا تھا۔ لمبے لمبے ناخنوں والی انگلیوں کی ہڈیوں نے کاغذ اور پنسل جھٹکا دے کر میرے ہاتھ سے کھینچ لیے اور ڈھانچے کا جبڑا کٹ کٹ کر کے اس طرح دانت بجانے لگا جیسے زور زور سے ہنسنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ اس کے بعد کافی دیر تک برآمدے کے پکے فرش پر ہڈیوں کے کھٹکنے اور دروازے پر ناخنوں سے کھرونچے مارنے کی آواز آتی رہی۔"

اس قسم کے بہت سے واقعات بیان کرنے کے بعد شہاب صاحب نے بتایا ہے کہ مکان کی آسیب زدگی کا سبب یہ تھا کہ اس میں اٹھارہ بیس سال پہلے ایک اوباش افسر رہا کرتا تھا، اس نے بملا کماری نامی ایک طالبہ کو شادی کا جھانسہ دیا اور اُسے الٰہ آباد سے اپنے ساتھ کٹک لے آیا۔ بعد میں بملا کو قتل کر کے مکان کے ایک حصے میں دفن کر دیا۔ کچھ عرصے بعد وہ اوباش افسر بھی مر گیا۔ بملا کی روح چاہتی تھی کہ الٰہ آباد میں اس کی ماں کو اس کے دردناک انجام کی اطلاع ہو جائے لیکن اوباش افسر کی روح چاہتی تھی کہ ایسا نہ ہو۔ اس لیے جب کوئی شخص اس مکان میں آ کر رہتا تھا، اوباش افسر کی روح مختلف طریقوں سے اسے تنگ کرتی تھی، تا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے۔

شہاب صاحب نے یہ تمام واقعات "شہاب نامہ" کی تصنیف سے تقریباً بیس برس پہلے "۱۸ سول لائنز" کے عنوان سے بھی قلم بند کیے تھے۔ یہ تحریر ان کی کتاب "ماں جی" میں شامل ہے۔ "شہاب نامہ" میں بیان کردہ واقعات کا "ماں جی" میں شامل واقعات سے مقابلہ کیا جائے تو دلچسپ نتائج سامنے آتے ہیں۔ نہ صرف "پلاٹ" میں بہت سی تبدیلیاں کی گئی ہیں بلکہ تفصیلات میں بھی زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ لیکن یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ افسانہ نگار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی کسی تخلیق کو ازسرِنو لکھتے وقت بہتر سے بہتر انداز میں پیش کرے۔

تیسرا اہم باب وہ ہے جس میں شہاب صاحب نے اپنے بعض روحانی تجربات پیش کیے ہیں۔ اس سلسلے میں "نوے سال کے ایک جوان فقیر" سے ان کی خط و کتابت کی تفصیل نہایت دلچسپ ہے۔ ان بزرگ سے انگریزی میں خط و کتابت ہوئی تھی اور خط کے آخر میں وہ اپنا نام "نائنٹی" (۹۰) لکھا کرتے تھے۔ یہ خط و کتابت ۲۵ برس تک جاری رہی۔ پہلا خط ڈاک سے

آیا۔ لیکن اس کے بعد کے تمام خطوط شہاب صاحب کو اپنے تکیے کے نیچے سے یا کتابوں کی الماری سے دستیاب ہوتے رہے۔ شہاب صاحب جواباً جو خطوط لکھتے تھے وہ بھی ایسی ہی جگہوں پر رکھ دیے جاتے تھے اور ان بزرگ محترم تک پہنچ جاتے تھے۔ ان بزرگ کی ہدایت تھی کہ ان کے خطوط پڑھ کر تلف کر دیے جائیں۔ ایک مرتبہ شہاب صاحب کو خیال آیا کہ بزرگ محترم کی کوئی تحریر بطور برکت یا نشانی محفوظ کر لی جائے۔ آگے کا واقعہ شہاب صاحب کی زبانی سنئے:

”یہ خیال آنا تھا کہ سزا کا تازیانہ فوراً نازل ہو گیا۔ رات کا وقت تھا۔ بجلی کے بلب کے اردگرد چند پروانے منڈلا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں پر ایک کاغذ منڈلانے لگا اور آہستہ آہستہ بل کھاتا ہوا نیچے میری گود میں آگرا۔ اس میں تحریر تھا کہ حکم عدولی کا یہ منصوبہ فوری سزا کا مستحق ہے۔ سزا یہ تجویز ہوئی کہ بتیاں چند لمحوں کے بعد اپنے آپ گل ہو جائیں گی اور میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں نصف گھنٹے تک ایک ایک زندہ سانپ سے باندھ کر رکھے جائیں گے۔ اس خوفناک سزا کا فیصلہ سن کر میں بے اختیار رو پڑا...... دیکھتے ہی دیکھتے بجلی کے بلب کی جانب سے ناگن کا جواب لہراتا ہوا میرے ہاتھ میں آیا جس میں تحریر تھا، ہاہاہا! بس دو زندہ سانپوں کے تصور سے ڈر گئے۔ بزدل ہو۔ چلو معاف کیا۔“

اس قسم کے واقعات بیان کرنے کے بعد ”شہاب نامہ“ کے دیباچے میں شہاب صاحب کا یہ لکھنا محض انکسار کے سوا کچھ اور نہیں......

”کسی وجہ سے میری کوئی حرکت انھیں (ممتاز مفتی کو) پسند آگئی اور انھوں نے بیٹھے بٹھائے ایسی عقیدت کا روگ پال لیا کہ میرے چہرے پر مشک کافور سے مہکتی ہوئی حنائی داڑھی چسپاں کر کے، میرے سر پر دستارِ فضیلت باندھی اور سبز پوشوں کا پُر اسرار جامہ پہنا کر مجھے ایسی مسند پر لا بٹھایا جس کا میں اہل تھا، نہ خواہش مند۔“

(۱۷ر ستمبر ۱۹۸۷ء)

Khama Bagoshiyan

Mushfiq Khwaja's Literary Columns

مشفق خواجہ کا احساسِ مزاح لطیف بھی ہے اور سبک بھی۔ یہ کانٹے کی اس چبھن کی طرح ہے جس سے خون جلد پر نمودار نہیں ہوتا لیکن چبھن کے بعد ایک کھلا ہوا خوشبودار پھول ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ مشفق خواجہ نے طنز و مزاح سے ماحول کی یکسانیت اور فضا کے جمود کو توڑنے کا کام لیا ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ ان کے اس عمل سے شخصیت مجروح نہیں ہوتی۔

مشفق خواجہ اردو کے شاید واحد مزاح نگار ہیں جنھوں نے ادب، ادیب اور معاشرے کی ناہمواریوں کو طنز و مزاح کے ایک مستقل موضوع کی حیثیت دی۔ وہ ادیب کو معاشرے کا حساس ترین فرد تصور کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں ادیب دیدۂ بینائے قوم ہے اور معاشرے میں دکھ کہیں بھی ہو ادیب کی آنکھ اس دکھ پر آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہے اور وہ نظم، غزل، افسانہ وغیرہ لکھنے پر بے تاب ہو جاتا ہے۔ لیکن عملی زندگی میں صورت حال اکثر اس کے برعکس ہوتی ہے۔ آج کا ادیب ذہنی کشمکش اور تصادم سے گزرنے کے بجائے مفاہمت، مصلحت اور سہل انگاری کا شکار ہے۔ ادبی فضا کے اس تضاد نے مشفق خواجہ کو قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ ''خامہ بگوش'' نے اس کالم میں ادبی معاشرے کی ناہمواریوں، شہرت پسند اور جعلی ادیبوں کی غیر ادبی حرکتوں، سرکاری ادبی اداروں اور ''افسر ادیبوں'' کی بداعتدالیوں اور کتابوں کے محاسن و معائب کو دیانت داری اور غیر جانبداری سے نشان زد کیا۔

Rs. 275/-

ISBN 978-969-8917-90-6

خامہ بگوشیاں
54265 275 Jun10

www.poorab.com.pk